نیا دور

میر تقی میر نمبر

تیس روپے

مئی، جون سنہ ۲۰۱۰ء



محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اتر پردیش



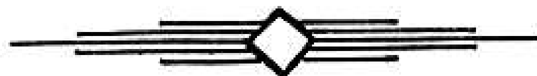
یہ تصویر "حدیثِ میر" سے لی گئی ہے، جس کے متعلق مقبول احمد لاری نے لکھا ہے۔ "حدیثِ میر" کی جو شبیہ شامل کی گئی ہے وہ ہر چند کہ خیالی ہے، لیکن باکمال مصور نے میر کی ذہنی کیفیات کو ابھارنے میں فن کارانہ تخلیقی بصیرت سے کام لیا ہے۔ میر کی زندگی اور شاعری کی روشنی میں مشہور آرٹسٹ عظمت اللہ خاں رام پوری کے موقلم کی تخلیق ہے۔

ماہنامہ
نیا دور
لکھنؤ
جلد (۶۵) نمبر (۲-۳)
مئی، جون سنہ ۲۰۱۰ء
پبلشر:
اجے کمار اُپادھیائے
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامّہ اتر پردیش
ایڈیٹر:
ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی
Ph. No. 2239132 Ext. 114
9889051003
E-mail : wazahatrizvi@sify.com
جوائنٹ ایڈیٹر:
رفعت عزمی
سب ایڈیٹر: سید خالد احمد
مطبوعہ: پرکاش پیکیجرس گولا گنج لکھنؤ
شائع کردہ:
محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامّہ اتر پردیش
زرِ سالانہ: ایک سو دس روپئے
فی شمارہ: دس روپئے
ترسیلِ زر کا پتہ: ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات
انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ اتر پردیش لکھنؤ
Please send your M.O/Bank Draft in favour of
Director, Information & Public Relations
Department, Park Road, Lucknow.
خط و کتابت کا پتہ:
"ایڈیٹر نیا دور" پوسٹ بکس نمبر ۱۴۶ لکھنؤ
بذریعہ رجسٹری:
ایڈیٹر نیا دور
انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ اتر پردیش لکھنؤ
کاتب و تزئین کار: امتیاز احمد

عنوانات

اپنی بات	ایڈیٹر	۳
میر کا دیوانِ چہارم	حنیف نقوی	۵
میر کی دو اہم مثنویاں	اکبر حیدری کشمیری	۱۱
دیارِ میر	پروفیسر سید مجاور حسین رضوی	۱۹
تفہیم میر کے مسائل	شارب ردولوی	۲۵
معتقد کون نہیں میر کی استادی کا	حسن عباس فطرت	۳۱
مطالعہ میر کی قدر و قیمت	پروفیسر سید فضل امام	۳۵
میر اور ان کی ہمعصر ہندی شاعری	انیس انصاری	۳۸
میر کا تصورِ عشق	وقار ناصری	۴۳
کچھ شعر فہمی اور میر شناسی کے بارے میں	فیاض رفعت	۴۷
کون ہے جو نہ کہے میر کو استادِ سخن	احمد ابراہیم علوی	۵۱
خرابۂ دلی کا وہ چند بہتر لکھنؤ سے تھا (انشائیہ)	شاہنواز قریشی	۵۴
میر کی شاعری اور ماس کمیونی کیشن	ڈاکٹر اسلم جمشید پوری	۵۶
میر تنقید کے ۲۰۰ سال	ڈاکٹر ریشماں پروین	۶۰
میر کی غزلوں میں تصوّف	رئیس الشاکری	۶۹
اشعارِ میر میں	ڈاکٹر نعیم السحر صدیقی	۷۲
دل اور دلّی کا شاعر	عارف حسین جونپوری	۷۷
میر کا استفہامیہ لہجہ	ڈاکٹر شکیل احمد	۸۱
ماورائے دیر و حرم	ڈاکٹر فاضل احسن ہاشمی	۸۳
میر کا احساسِ برتری	ظفر اللہ انصاری	۸۶

رنگِ میر اور حفیظ جونپوری	طفیل انصاری	۸۸
سلاستِ کلامِ میر میں بلند تخیل کی جلوہ گری	ارشاد امروہوی	۹۰
میر اور انسان دوستی	ڈاکٹر ریحان حسن	۹۴
اشاریہ میر تقی میر	ڈاکٹر محمد اطہر مسعود خاں	۹۸
میر کی عشقیہ مثنویاں	ڈاکٹر جمیل دوشی	۱۱۲
میر اور قصیدہ اپنے تاریخی تناظر میں	شاہد کمال	۱۱۹
میر کی منقبتی شاعری	یمینہ اختر	۱۲۷
میر کی مرثیہ گوئی	سرور جہاں	۱۳۰
رباعیاتِ میر	شعیب علی	۱۳۳
میر اور ذکرِ میر	مہتاب جہاں	۱۳۵
غزل (نذرِ میر)	رباب رشیدی	۱۳۹
نظم	عنبر بہرائچی	۱۴۰
شاعرِ نازک طبع (نظم)	ساغر وارثی	۱۴۱
قطعات	بشیر فاروقی	
میر تھا میر رہا آج تلک میر ہے تو	خورشید ظفر	۱۴۲
نذرِ میر	ڈاکٹر مخمور کاکوروی	
نذرِ میر	رفعت عزمی	۱۴۳
ناخدائے سخن	جمیل احمد جمیل	
قبرِ میر پر پرنس ہادی حسین ہادی	علی احمد دانش	۱۴۴
میر کے کچھ شعر	یاسر رئیس	۱۴۶
میر اور لکھنؤ	انجم اصغر	۱۴۸
"آبِ حیات" سے	شہلا حیدر	۱۴۹
میر کے اسفار	نسرین رضوی	۱۵۰
میر تقی میر ایک نظر میں	مہناز فاطمہ	۱۵۱
فوٹو پیج		۱۵۲



اپنی بات

کس نے سن شعر میرؔ یہ نہ کہا
ہائے پھر کہیو کیا کہا صاحب

میرؔ صاحب کا یہ شعر آج بھی ایک زندہ حقیقت ہے کہ ہم جب بھی ان کا کوئی شعر پڑھتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کوئی ہمارے پاس بیٹھا ہوا ہے۔ ہمارا بزرگ، دوست اور ساتھی ہے۔ اس طرح زمانے کے سرد وگرم کو جھیلے ہوئے دکھ اٹھائے ہوئے، آشوب روزگار کا مارا ہوا، ہمارے زخموں پر اپنے اشعار سے مرہم رکھ دیتا ہے۔ انھیں خود یہ احساس تھا۔ کہتے ہیں۔ ؎

شعر میرے ہیں سب خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

اور یہی عوامی مزاج ان کے اشعار کی آفاقیت کا مظہر ہے۔ ابھی تو صرف دو صدی گذری ہیں نہ جانے کتنی صدیاں اور گذریں گی۔ یہ چرخ کہن نئے نئے سوانگ لائے گا۔ دھرتی کروٹیں بدلے گی مگر جب تک انسان کے دلوں میں دھڑکن رہے گی لالہ وگل کھلیں گے اور آشوبِ زمانہ اپنی ستم ظریفیوں سے لوگوں کو بے چین و مضطرب کرے گا۔ اس وقت تک میرؔ صاحب کے اشعار شگفتہ اور تروتازہ ہوں گے اور ان کی یادیں کو دل ودماغ پر جادو کرتے رہیں گے۔

میرؔ صاحب کو اکثر ادبی مورخین نے دہلوی لکھا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ۲۸ برس دہلی میں رہے دہلی سے انھیں خصوصی لگاؤ بھی تھا مگر اصلاً وہ اتر پردیش کے تھے۔ اس گنگ وجمن کی سرزمین کو یہ فخر حاصل ہے کہ میرؔ نے جمنا کے کنارے آنکھیں کھولیں اور تاج محل دیکھا اور گومتی کے کنارے رومی دروازہ دیکھتے ہوئے آنکھیں بند کرلیں۔ ۱۷ برس یا بہ روایت ۱۱ برس اکبرآباد (آگرہ) میں گذارے وہیں پیدا ہوئے تھے اور ۱۲۲۵ھ (۱۸۱۰ء) ۲۰ر شعبان المعظم کو لکھنؤ میں سپرد خاک ہوئے۔ اس طرح اہل یوپی پر ان کا حق ہے اور یوپی والوں پر یہ فرض بھی ہے کہ وہ میرؔ صاحب کو یاد کرتے رہیں اور ان کے شایانِ شان یادگار قائم کریں۔ خصوصاً لکھنؤ جو کبھی باغوں کا شہر تھا آج یہ باغوں کا شہر یادگاروں کا شہر ہے۔ یہاں گنگا جمنا کی روایتیں گومتی میں آکر ضم ہوگئیں اس لئے میرؔ صاحب کی وفات کے ۲۰۰ برس پورے ہونے پر یہ معمولی سا نذرانۂ عقیدت پیش کرتے ہوئے بے اختیار یہ لکھنے کو جی چاہتا ہے کہ دہلی والوں نے غالبؔ انسٹی ٹیوٹ اور ایوان غالبؔ بنایا کشمیر نے اقبالؔ انسٹی ٹیوٹ سے شری نگر کو عزت بخشی لیکن اردو کے سب سے بڑے شاعر کی لکھنؤ میں کوئی یادگار نہیں ہے۔ کسی زمانے میں مقبول لاری صاحب نے میرؔ اکادمی ضرور

قائم کی تھی لیکن اس کی حیثیت ایک نجی ادارہ کی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ سٹی اسٹیشن (قبرستان بھیم کا اکھاڑہ جو بھیم کا تکیہ بھی کہا جاتا ہے) کے پاس ان کی قبر تھی جہاں سے اب ٹرینیں گذرتی ہیں۔ یہ تسلیم کہ اتنے بڑے شاعر کی یاد کا مقبرہ ہر اردو داں کے دل میں موجود ہے لیکن اتنا تو ہو کہ ایک ادارہ میر انسٹی ٹیوٹ کے نام سے بھی قائم ہو۔ میر کو عوام سے گفتگو تھی اب عوامی حکومت ہے۔

میر کے کلام کی معنویت صرف اتنی نہیں ہے کہ ان کے اشعار کی تشریح کر دی جائے۔ کتابِ دل کی تفسیریں تو ہر لحظہ بدلتی ہیں۔ خوابِ زندگی کی تعبیریں تو ہوتی ہی رہیں گی مگر میر کے شعر میں یہ سب تو تھا ہی۔ ایک نہایت نازک چیز تھی جس کی آج کے دور کو ضرورت ہے وہ ایک ایسی تہذیب کے پیغمبر تھے جس کی شریعت محبت۔ انھوں نے روحانی کیف اور جمالیاتی انبساط کے ساتھ محبت کا پیغام بھی دیا تھا۔ وہ وصل کے قائل تھے فصل کے نہیں۔ ان کے یہاں دل ایک استعارہ تھا میرا طالبعلمانہ مزاج کہتا ہے کہ یہ استعادہ نہیں ہے۔ یہ قید زمان و مکان سے بلند ہو کر ایک نئی دنیا کی تخلیق ہے جہاں اگر دل ڈھا کر کعبہ بنایا گیا تو گناہِ عظیم ہوا۔ میر کا تو عقیدہ ہی یہ ہے کسی کو رنج نہ پہنچاؤ، دل نہ دکھے یہ دنیا ہے بے شک پُرآشوب ہے فتنہ فساد کی آماجگاہ ہے لیکن اسی دنیا کو حسین تر بنانے کا خواب میر کی شاعری کی روح ہے۔ چنانچہ جب بھی وہ زنجیر کرنے کا ذکر کرتے ہیں تو ان کا مطلب ایسی شخصی آزادی سے ہوتا ہے جس سے کسی کو رنج نہ ہو۔ وہ مذاہب کی یگانگت پر عقیدہ رکھتے ہیں۔ بنیادی روح ایک ہے۔ شمع حرم ہو یا نور صنم حسن ایک ہے۔ اگر آج یہ بات سمجھ میں آجائے تو پھر نہ دہشت گردی رہے نہ مذہبی منافرت نہ جنون غارت گری۔ نہ دوسروں کی آزادی چھین لینے کا جذبہ۔

ہر قوم اپنی تہذیبی وراثت سے زندہ رہتی ہے۔ ورنہ یونان، مصر اور روما کی طرح مٹ جاتی ہے۔ صرف اینٹ پتھر کی عمارتوں سے تہذیبیں نہیں بنتیں۔ تہذیب تو ایسے افراد کے کاموں سے بنتی ہے جو رہگزار حیات پر اپنے نقوش قدم سے چراغ جلاتے ہیں اور ماضی سے مستقبل کو روشنی دیتے ہیں۔ ہمارا مقدس وطن ہندستان ہمالیہ، گنگا جمنا، کاویری کی وجہ سے بھی عظیم ہے۔ اس سبب سے بھی اقوام عالم میں ہماری ایک جگہ ہے کہ ہمارے اشوک، کنشک اور اکبر جیسے بادشاہ ہوئے ہیں لیکن ہماری تہذیبی میراث کے امین و پاسدار، بالمیک کالی داس، تلسی داس، رحیم اور میر صاحب غالب انیس و اقبال بھی ہیں۔ اس لئے ہمیں اپنی وراثت نہیں بھولنی چاہئے لیکن آنے والی نسل کے لئے جو کچھ بنا کر چھوڑ جائیے۔ میر صاحب کو یاد رکھئے۔ انھیں کے لفظوں میں۔ ؎

باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں ایسی نہ سنئے گا
کہتے کسی کو سنئے گا تو دیر تلک سر دھنئے گا

وہ یہ سمجھ گئے تھے اور اس پر عمل کرنا چاہئے۔ ؎

بارے دنیا میں رہو غم زدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

وضاحت حسین رضوی

حنیف نقوی
سی کے ۴۶/۳۰ بی، بنیا باغ، وارانسی ۲۲۱۰۰۱

میرؔ کا دیوانِ چہارم
ایک اہم قلمی نسخہ

میرؔ کے کلیات اور دواوین کے جو قلمی نسخے ہند اور بیرونِ ہند کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں ان میں دیوانِ سیم اور دیوانِ چہارم کے دو نسخے غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان دونوں نسخوں کی پہلی خصوصیت تو یہ ہے کہ ان کی کتابت میرؔ صاحب کے بھانجے اور داماد میر حسن جلی تجلی نے کی ہے اور یہ کام میرؔ کی زندگی میں ۱۲۰۹ھ/۹۵-۱۷۹۴ء اور ۱۲۱۳ھ/۹۹-۱۷۹۸ء کے درمیان انجام پایا ہے۔ ۱۲۰۹ھ کا ایک قطعہ تاریخ دیوانِ چہارم کے آخر میں موجود ہے اور ۱۲۱۳ھ تجلی کا سالِ وفات ہے۔ دوسری قابلِ لحاظ خصوصیت یہ ہے کہ یہ دونوں نسخے دیوان اول تا چہارم کے ان چار نسخوں کے باقیات میں سے ہیں جو خود میرؔ صاحب نے لکھنؤ کے ایک مقتدر اور صاحبِ ذوق رئیس مرزا محسن کو پیش کئے تھے۔ تیسری خصوصیت جو ان نسخوں کو دوسرے نسخوں سے ممتاز کرتی ہے یہ ہے کہ ان کے سرورق مرزا محسن کی ایک ایسی جامع تحریر سے مزین ہیں جن میں میرؔ صاحب کی وفات، سن عمر اور تدفین سے متعلق تمام تفصیلات محفوظ کر دی گئی ہیں۔ انفرادی طور پر دیوانِ چہارم کا ایک قابلِ ذکر امتیاز یہ بھی ہے کہ اس کے ورق ۶۵ب پر اصل نسخے کے کاتب کے علاوہ کسی اور شخص نے "نوادر الکلام" سے میرؔ کے سوانح کا طویل اقتباس نقل کر دیا جس سے بطورِ خاص ان کے زمانۂ ولادت کا علم ہوتا ہے۔ یہ تذکرہ اب نایاب ہے حتیٰ کہ یہ بھی معلوم نہیں کہ ان کا مولف کون ہے اور یہ کس زمانے میں لکھا گیا۔ تذکرہ بالا دونوں دواوین میں سے دیوانِ سیم کا نسخہ بنارس ہندو یونیورسٹی لائبریری کے ذخیرہ لالہ سری رام میں محفوظ ہے۔ اس کے متعلق راقم السطور کا تعارفی مضمون ماہنامہ "نیا دور" کے فروری ۱۹۷۸ء کے شمارے کے علاوہ مجلہ "نقوش" لاہور کے میر نمبر کی جلد سوم (شمارہ اگست ۱۹۸۳ء) میں بھی شائع ہو چکا ہے اور اس کے مجموعہ مضامین "میر و مصحفی" (مطبوعہ ۲۰۰۳ء) میں بھی شامل ہے۔ دیوانِ چہارم کا تعارف پروفیسر اکبر حیدری اپنے مضمون مطبوعہ ماہنامہ "نیا دور" شمارہ جنوری ۱۹۷۴ء کے علاوہ "دیوانِ میرؔ" (نسخہ محمود آباد، مخطوطہ ۱۲۰۳ھ بہ حیاتِ میرؔ) شائع کردہ اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لنگویجز، سری نگر مطبوعہ ۱۹۷۲ء کے مقدمہ میں بھی سپردِ قلم فرما چکے ہیں۔ یہ نسخۂ دیوان پہلے مہاراجہ محمود آباد کے کتب خانے کی ملکیت تھا لیکن اب رضا لائبریری رام پور کے ذخیرۂ مخطوطات میں شامل ہو چکا ہے۔

نیا دور کا شمارہ جنوری ۱۹۷۴ء اس وقت ہماری دسترس میں نہیں۔ "دیوانِ میرؔ" کے مقدمہ میں دیوانِ چہارم کے مذکورہ بالا نسخے کے بارے میں جو معلومات فراہم کی گئی ہیں وہ مختلف النوع نقائص سے مملو ہیں۔ مثلاً فاضل محقق نے تعارف کے آغاز میں مخطوطے کے نمبر، سائز اور سطر سے متعلق اندراجات کے بعد اس خط کا شکستہ بتایا ہے جو مطابقِ اصل نہیں۔ پورا نسخہ قدیم روشِ املا کے مطابق صاف نستعلیق خط میں لکھا گیا ہے۔ البتہ بعض حروف مثلاً لام نون اور ی کی کشش کہیں کہیں خطِ شکستہ کے قریب آ گئی ہے۔ غزلوں کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ یہ صفحہ ۲ سے شروع ہو کر صفحہ ۱۳۹ پر ختم ہوتی ہیں یہ بیان بھی بذاتِ خود صفحہ بہ صفحہ شمار کی بجائے درج شدہ صفحات نمبر پر مبنی ہے جو درست نہیں۔ اس سلسلے کا آخری صفحہ نمبر ۱۲۹ ہے۔ یہ بے ترتیبی غزلیات کے بعد دیگر اصنافِ سخن سے متعلق تفصیلات میں بھی برقرار رہی ہے۔ یہاں اس امر کی وضاحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ سرورق کے ایک اندراج میں اس نسخے کے اوراق کی تعداد ۱۰۲ بتائی گئی ہے لیکن پروفیسر اکبر حیدری

کی پیش کردہ تفصیلات اور ہمارے شمار کے مطابق بہ صورت موجودہ یہ نسخہ ۱۹۷ صفحات پر مشتمل ہے اور موجودہ صفحات نمبر ۱۶۰ و ۱۶۱ کے درمیان سے چار صفحات دو ورق غائب ہونے کے علاوہ بظاہر مزید کسی ورق کے غائب ہونے کا امکان نظر نہیں آتا۔

ابتدائی تعارف کے بعد محقق موصوف نے اس مخطوطے کی اہمیت واضح کرنے کی غرض سے سب سے پہلے اس کے سرورق کی عبارت کا حوالہ دیا ہے۔ اس موقع پر وہ اس نسخہ کے مالک محمد محسن المخاطب بہ زین الدین احمد اور میرؔ کے بھتیجے میر محمد محسن کو شخص واحد تصور کرکے جس التباس کا شکار ہوئے ہیں وہ حد درجہ حیرت انگیز ہے محسن نے سرورق کی اس تحریر میں اپنا نام تین جگہ لکھا ہے اور ان تینوں مقامات میں سے کسی جگہ بھی لفظ میرؔ کو بطور سابقہ جزو نام نہیں بنایا لیکن فاضل محقق نے اپنی تحریر میں لفظ میر کو ہر جگہ لازماً ان کے نام کے ساتھ شامل کیا ہے اور ایک جگہ انھیں واضح طور پر میر محمد محسن المتخلص بہ محسن برادر زادہ میر تقی میرؔ لکھ کر اقتباس یا غلط فہمی کی رہی سہی کسر پوری کر دی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ میر محمد محسن المخاطب بہ زین الدین احمد سے میرؔ کا کوئی خونی رشتہ نہ تھا۔ وہ لکھنؤ کے مشہور رئیس فخر الدین احمد خاں عرف مرزا جعفر متخلص بہ جعفر (متوفی ۱۲۳۰ھ ۱۸۱۵ء) کے صاحبزادے اور رفیع الدین احمد خاں عرف مرزا حاجی متخلص بہ قمر کے چھوٹے بھائی تھے۔ مرزا محسن نے ۱۲۶۶ھ/۱۸۵۰ء میں وفات پائی۔

اس سلسلہ میں سرورق سے مرزا محسن کی عبارت نقل کرنے میں بھی پوری احتیاط سے کام نہیں لیا گیا ہے جس کے نتیجہ میں کئی غلطیاں در آئی ہیں اگرچہ یہ غلطیاں معنوی طور پر زیادہ اہم نہیں پھر بھی اصل متن سے انحراف کی بنا پر انھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اختلاف متن کی اس صورت کو نمایاں کرنے کی غرض سے سطور ذیل میں دیوان میرؔ کے مقدمہ سے حیدری صاحب کی پیش کردہ عبارت نقل کرکے قوسین میں اصل متن کی نشاندہی کی جا رہی ہے۔

"بروز جمعہ بستم شعبان المکرم وقت شام سن ۱۲۲۵ یکہزار دو صد بست و پنجم ہجری بودہ (یکہزار و دو صد بست و پنج ہجری بود)

میر محمد تقی صاحب میرؔ تخلص صاحب ایں دیوان در شہر لکھنؤ در محلہ سٹہٹی بعد طے نہ عشرۂ عمر بجوار رحمت ایزدی پیوستند در روز (بروز) شنبہ بست و یکم ماہ مذکور سند الیہ وقت دوپہر در اکھاڑہ بھیم کہ قبرستان مشہور است نزد قبور (نزدیک دیگر قبور) اقربا خویش مدفون شدند و چہار دیوان خود را کہ ایں دیوان چہارم (ہم) ازاں جملہ است، بمحرر سطور محمد محسن المخاطب بہ زین الدین احمد تجاوز اللہ عن سیئاتہ در چمن حیاتِ خویش بکمال رغبت بحل کردہ بخشیدند غلامش بیامبرزاد (بیامرزاد)

حررہ محمد محسن عفی عنہ روز جمعہ بست (بست) و ہفتم ماہ شعبان الیہ
بوقت چہار گھڑی روز باقی ماندہ

ایں دیوان دیوان از دستخط (بدست خط) میر حسن علی تجلی داماد
میر مغفورات

بمحررہ (المحررہ) محمد محسن عفی عنہ

محمد تقی میر شاعر کہ بود — سلم ورا تخت و تاج سخن
باقلیم معنی ز ارباب شعر — ستاندہ او بود باج سخن
بہ رگش چو بے نور شد شعرہاں — نوشتم بمردہ سراج سخن
۱۲۲۵ھ

دیگر

میر تقی استاد فن شعر — مردو ز دنیا سوئے عدم شد
گشت چو اشعارش ہمہ بے سر — میر تقی استاد رقم شد
۱۲۲۶ - ۱۲۲۵ھ

زیر نظر نسخے اور متداول متن کے تقابلی مطالعے کے بعد پروفیسر اکبر حیدری نے اس نسخے کے جن زائد اشعار کی نشاندہی کی ہے ان کی تفصیل انھیں کے الفاظ میں حسب ذیل ہے۔

(۱) دیوان غزلیات ذیل کی غیر مطبوعہ غزل پر ختم ہوتا ہے۔

یہ کلول نہیں شلتی جی پر سے اس کے — علاقہ ہوا جس کو خنجر سے اس کے
سکھایا ہے ہجراں کا غم دلبر نے کے — انگے پھول کانٹے ہوں بستر سے اس کے
وہ بے رحم گھر سے بھی اپنے نہ نکلا — گئیں نعشیں غم کشتوں کے در سے اس کے
کبھو کہا وے گا آفتاب آفتابہ — سحر دیر بڑھتا ہے اب گھر سے اس کے

کہیں میر کی جلتی آنکھیں ہوں ٹھنڈی
کفِ پا ہو دیدۂ تر سے اس کے

(۲) نسخہ میں یہ شعر بھی غیر مطبوعہ ہے۔

بد کرو خوبی سے بقول میر عیب کرنے کو بھی بہتر ہے شرط

(۳) دیوان میں دو شعر ایسے ہیں۔

ان پریوں سے لڑکوں کے جھمیلے میں آئے
بے ہوش و خرد جیسے پری دار ہیں ہم لوگ
در پر کسو کے جا کے کھڑے ہوں تو کھڑے ہیں
حیرت زدۂ عشق ہیں دیوار ہیں ہم لوگ

مطبوعہ نسخوں میں یہ دونوں شعر ذیل کے شعر کی صورت میں ہیں۔

ان پریوں سے لڑکوں کے جھمیلے میں دل آئے
حیرت زدۂ عشق ہیں دیوار ہیں ہم لوگ

اس تفصیل کے مطابق حیدری صاحب نے متداول متن پر کل سات اشعار کا اضافہ فرمایا ہے لیکن موصوف نے جو زائد غزل نقل فرمائی ہے اس کے دوسرے شعر کے مصرعہ ثانی میں اصل نسخے میں "اسے گے پھول" درج ہے اور یہی صحیح بھی ہے۔ اسی طرح تیسرے شعر کے دوسرے نسخے میں "غم کشتوں کے درسے" کی بجائے "غم کشتوں کی درسے"، اور چوتھے شعر کے مصرعہ اولیٰ میں "کہاوے گا آفتاب" کی بجائے "کھاوے گا آفتاب" ہونا چاہئے "آفتاب خوردن" فارسی محاورہ ہے جس کے معنی "رنج و تعب کشیدن" ہیں۔ "آفتا با" غالباً "آفتاب آ" ہے۔

اکبر حیدری صاحب کے برخلاف ہمارے مطالعہ کے مطابق زیر بحث مخطوطے کے حصۂ غزلیات میں متداول نسخوں کے مقابلہ میں کل ۱۶ اشعار زیادہ ہیں۔ سطور گذشتہ میں نقل شدہ سات شعروں کے علاوہ باقی اشعار کی تفصیل یہ ہے۔

(۱) حال ہی میں کونسل برائے فروغ اردو زبان کے شائع کردہ "کلیاتِ میر" کی جلد اول کی غزل نمبر ۱۴۸۲ کا پانچواں شعر درج ذیل ہے۔

دم میں ہے دم جہاں تئیں، گرم تلاش ہوں
سو پیچ و تاب رہتے ہیں ہر ایک مو کے ساتھ

یہ شعر دراصل مندرجہ ذیل دو اشعار کے دو مختلف المعنی مصرعوں سے مرکب ہے۔

دم میں ہے دم جہاں تئیں گرم تلاش ہوں
جی بھی لگا رکھا ہے تری جستجو کے ساتھ
کیا آگ تن بدن میں محبت نے پھونک دی
سو پیچ و تاب رہتے ہیں ہر ایک مو کے ساتھ

(۲) غزل نمبر ۱۳۵۱ کا چوتھا شعر جو "کلیات میر" کے متذکرہ بالا ایڈیشن میں شامل نہیں، درج ذیل ہے۔

نہ یاری یاوری طالع نے کچھ کی گیا ہے یار سب یارا ہمارا

(۳) غزل نمبر ۱۲۶۳، شعر نمبر ۵:

مہلت غم میں کیا کیا جاوے عمر جاتی رہی شتاب بہت

(۴) غزل نمبر ۱۳۷۱، شعر نمبر ۷۔

ہنگامہ اس کے دیکھنے والوں کا بلا محشر بھی گم ہوئی ہے اسی شور و شر کے بیچ

(۵) غزل نمبر ۱۳۷۲، شعر نمبر ۶:

چارۂ کارِ فقیراں کس سے ہو جز چارہ ساز
بے من و تو وہ کرے ہے کام ناچاری کے بیچ

(۶) غزل نمبر ۱۴۰۲، شعر نمبر ۳:

بے خودِ شوق میں تو در پہ کھڑا نہ گئی اس کو یہ خبر افسوس

پہلے مصرعے کا متن درست نہیں معلوم ہوتا۔ ہمارے نزدیک یہاں "تو" کی بجائے "ہوں" ہونا چاہئے۔

(۷) غزل نمبر ۱۴۲۳، شعر نمبر ۴:

خوش نما کس قدر ہیں چسپاں پوش
تنگ آئے ہیں اپنی جاں سے لوگ

(۸) غزل نمبر ۱۴۲۸ شعر نمبر ۵:

گل پھول سے چمن میں لڑکوں کے مکتبوں میں
اک عمر اپنے دل کو بہلا کے رہ گئے ہم

(۹) غزل نمبر ۱۴۸۱، شعر نمبر ۴:

سفر کعبہ نہیں ہے سفر دیر کہ ہے
اس رہ دور میں ہر گام خدا اپنے ساتھ

زیر بحث مخطوطہ اغلاطِ املا اور تحریفِ متن جیسے نقائص سے یکسر پاک نہیں تاہم ان کی تعداد اس قدر کم ہے کہ انھیں محض اتفاق یا سہو قلم قرار دے کر بہ آسانی نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ اس قسم کی ایک مثال غزل نمبر ۱۴۰۲ کے شعر نمبر ۳ کے سلسلہ میں گذشتہ سطور میں پیش کی جا چکی ہیں تین اور قابلِ ذکر مثالیں درج ذیل ہیں۔

(۱) حسن و خوبی ہے دوستاں کیا چیز
ٹھہری ہے جان سی بھی شے کیا چیز

مطبوعہ متن میں اس مطلعہ کا مصرع اول اس طرح منقول ہے دوستاں حسن و خوبی ہے کیا چیز اور بندش سست ہو جانے کے باوجود بھی صحیح ہے کیونکہ "شے" کا قافیہ "ہے" ہی ہو سکتا ہے "دوستاں" نہیں۔

(۲) غزل نمبر ۱۵۱۱ کا شعر نمبر ۵
رسوا خراب و غم کش دل باختہ محبت
عاشق کو تیرے میں کیا کیا کہا گیا ہے

مصرع اول کا آخری لفظ "محبت" (م خ ب ت) دراصل "مخبّت" (م خ ب ت) ہے جس کے معنی مخبوط الحواس ہیں۔ متداول متن میں اس مخبت (م خ ب ت) نے "محبت" (م ح ب ت) کی شکل اختیار کر لی ہے جو یہاں بالکل بے محل ہے۔

(۳) دکھلانے کو لوگوں کے دنوں کی ہے صلاح
پیش انجم نماز شب کرتے ہیں

یہ ایک رباعی کے آخری دو مصرعے ہیں۔ مصرع اول کا آخری لفظ "صلوٰۃ" ہونا چاہئے جسے غلطی سے "صلاح" لکھ دیا گیا ہے۔

اس قسم کی چند معمولی غلطیوں کے باوجود اس نسخے کا متن عام طور پر دوسرے نسخوں کے مقابلہ میں زیادہ معتبر اور قابلِ ترجیح ہے پیش نظر مضمون میں اس امتیازی وصف کی مکمل نمائندگی ممکن نہیں اس لئے جستہ جستہ چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ ان مثالوں میں اولاً متداول متن نقل کر کے اس کے نیچے مختلف فیہ متن درج کر دیا گیا ہے۔

یارب، ہماری جانب یہ سنگ کیوں ہے عاید جی ہی سے مارتے ہیں جو نام لے وفا کا
تنگ
نام لیں

(۲) بات کہی تلوار نکالی آنکھ لڑائی جی مارے
کہے نکالے لڑائے
کیونکہ جا دے اس سے کوئی ربط محبت پیار اپنا

(۳) وہی ہے رونا وہی ہے کڑھنا وہی ہے سوزش جوانی کی سی
بڑھاپا آیا ہے عشق ہی میں یہ میر ہم کو نہ ڈھنگ آیا
شورش

(۴) ردیف واؤ کی ایک غزل کے مندرجہ ذیل مطلع میں بھی اصلاً "سوزش" کی بجائے "شورش" ہی نظم ہوا ہے۔
دیتی ہے طول بلبل کیا سوزش فغاں کو
اک نالہ حوصلے سے بس ہے وداعِ جاں کو

(۵) جنگ زمانہ میں تو بحث ہے عشق ہی کا
اک بحث تھا عشق کا بھی
بے جا ہوا دل اپنا جب وہ مقام نکلا

(۶) شیریں کا حسن ایسا نہ تھا جو خستہ جان دیں
ایسا نہ تھا جس پہ
جو کچھ ہوا وہ خواہشِ فرہاد سے ہوا

(۷) ہوں بجوذ کو کوئی پہنچے مجھ تلک بے خودی نے حال پہنچایا ہے اب
دور

(۸)
عرش پہ دھونی لگانے کو تھے دود دل سے کب تک ہم
کل تک
خاک پہ یاں کی درویشانہ ہم نے بچھایا بستر آج
یھاں

(۹) جینے سے ہم کشتوں کی خاطر تم بھی جمع کرد
کل تک کا کام نہیں کھینچے گا غش آتا ہے اکثر آج
کھینچے گا

(۱۰) پھرتا ہے میر کیا تو گلستاں میں غم زدہ
نیستاں
کچھ دل خراش لکھ بھی قلم اک تراش کر

(۱۱) دیکھے دامن کے نیچے کے سے دئے
دیکھے
میر نے گر کے تلے چھپائے داغ
کرتے تلے

(۱۲) کس کو دماغ رہا ہے یاں آٹھ پہر کی منت کا
بھاں اب آٹھ
ربط اخلاص سے دن گذرے ہے خلط اس سے شب گہ توف
سے دن کے گذرے

(۱۳) غم مضموں نہ خاطر میں نہ دل میں درد کیا حاصل
نہ مضموں غم کا
ہوا کاغذ نمط گو رنگ تیرا زرد، کیا حاصل

(۱۴) خستہ جانی نے تنگ خلق کیا پر لے مجھ سے عار ہے تا حال
حالی

(۱۵) اب حیرت ہے کس کس جاگہ پنبہ و مرہم رکھنے کی
رکھنے گا
قد تو کیا ہے سرو چراغاں داغ بدن پر کھا کھا ہم

(۱۶) اکثر نڈھال ہیں ہم پریوں نہیں وہ کہتا
کیا ہے کہ جلتے ہو گے کچھ اتنے ہی ڈھلے تم
کچھ اتنے ڈھلے ڈھلے

(۱۷) ہو کے بدحال محبت میں کھنچے آخر کار
کھنچے
لوگ اچھے تھے بہت یار کے بیماروں میں

(۱۸) غزل نمبر ۱۵۰۳ کے مندرجہ ذیل شعر میں بھی "کھنچے" کی جگہ اصلاً "کچھے" ہی نظم ہوا ہے۔
بہت سو پریشاں کھنچے اس کے غم میں
خدا جانے ہے بید کس کی نشانی

(۱۹) ہر لحظہ بے قراری، ہر لحظہ آہ و زاری
ہر لمحہ
ہر دم ہے اشک باری نومیدی ہے نظر میں

(۲۰) اس چشم سرخ پر ہے وہ ابروئے کشیدہ
ہیں دوں
جوں ترک مست رکھ لے سر کے تلے کماں کو

(۲۱) اے آہوانِ کعبہ نہ اینڈو حرم کے گرد کھاؤ کسو کی تیغ، کسو کے شکار ہو
جاؤ کے نیچے

(۲۲) گردش چشم سیہ کا سے سے جمع نہ رکھو خاطر تم
چرخ سیہ کاسہ
بھوکا پیاسا مار رکھا ہے تم سے ان نے ہزاروں کو
چشم کو نشان زد کر کے حاشیے پر "چرخ" بنا دیا گیا ہے۔

(۲۳) گریۂ خونیں سے ہیں رخسار میرے لعل تر
لال میر
دیدۂ خوں باریوں ہیں جیسے منہ پر گھاؤ ہو
ہے

(۲۴) صبر کہاں جو تم کو کہیے لگ کے گلے سے سو جاؤ
جو لگ کے گلے سے تم بن کہیے
بولو نہ بولو، بیٹھو نہ بیٹھو کھڑے کھڑے ٹک ہو جاؤ
ہی

(۲۵)
وارفتہ ہے گلستاں اس روئے چینی کا ہے فصل گل پہ گل کا اب وہ نہیں مزہ کچھ
چہرہ (چہرے) گل کی ہوا

(۲۶) کیا کہیے جب میں نے کہا ہے تیر ہے مغرور اس پر تو
ہے میر مغرور
اپنی زباں مت کھول تو ان نے اور کہا ہے کیا کیا کچھ

(۲۷) وہ جو ماہ زمیں گرد اپنا دو پہری ہے ان روزوں
دو پہر سے ہے
شوق میں ہر شب حرف سخن ہے ہم کو فلک کے تاروں سے

(۲۸) مائل کفر جوانی میں بہت تھے ہم لوگ
دیر میں مسجدوں میں دیر رہا کرتے تھے
تے

(۲۹)
کیا اضطراب دل سے کہے تیر سیر عشق یہ حال مجھے وہ جو گرفتار ہو کوئی
تیر اسیر عشق

(۳۰)
برا ہے دل کا ہمارے لگنا لگانا غصے سے عاشقی کے
لگا تو
پھٹی جبیں سے گلی میں اس کی خراب خستہ پھرا کریں گے
جبینیں

(۳۱) اگر وہ رشک بہار بھے کہ رنگ اپنا بھی ہے اب ایسا
نگو
ورق خزاں میں جو زرد ہوں گے غم دل اس پر لکھا کریں گے
ان پر

(۳۲) وصال ہووے تو قدرت نہ ہے قدرت کا
قدرت نمائی ہے حق کی
نہ ہم کو قدر نہ قدرت، خدا ہی قادر ہے

(۳۳) شور جرس شب گیر کا غافل تیاری کا تکیہ ہے
تنبیہ
یعنی آنکھ نہ لگنے پاوے قافلہ صبح کو چلتا ہے

فصحائے دہلی ''یہاں'' اور ''وہاں'' کو ''جہاں'' اور ''کہاں'' کے وزن پر استعمال کرنا خلاف فصاحت تصور کرتے تھے۔ وہ ان دونوں لفظوں کو ہائے مخلوط کے ساتھ ''یاں'' اور ''واں'' کے وزن پر بولنے اور نظم کرنے کے قائل تھے۔ سید انشاؔ اور مرزا غالبؔ کی تحریروں میں اس کی وضاحت موجود ہے۔ میرؔ کے اس دیوانِ چہارم میں بھی یہ دونوں لفظ بہ کثرت استعمال ہوئے ہیں اور اس کے پیش نظر نسخے میں انھیں متذکرہ بالا دستور کے عین مطابق ہر جگہ بالالتزام ''ہے'' کے ساتھ لکھا اور ''جاں'' اور ''ہاں'' کے وزن پر نظم کیا گیا ہے۔ اس کے برخلاف کلیات مطبوعہ میں ان کا املا بدل کر ''یاں'' اور ''واں'' کر دیا گیا ہے جو اس دور کی لسانی شناخت کے منافی ہے۔ اور اس اعتبار سے اصولاً غلط ہے۔ اس کلیے سے استثنا کی پورے دیوان میں صرف پانچ مثالیں ملتی ہیں جو حسب ذیل ہیں۔

(۱) تن کو جس جاگہ سے بچھڑوں ہوں وہاں ہے درد درد
ہاتھ لگتے دل کے ہو جاتا ہوں کچھ میں زرد زرد

(۲) کس کو دماغ رہا ہے یہاں اب آٹھ پہر کی منت کا
ربط اخلاص سے دن گذرے ہے خلط اس سے تھوڑا موقوف

(۳) میرؔ جہاں ہے تمام خانہ پیدا یہاں کا نہ پیدا ہے
آؤ یہاں تو داؤ نکتیں اپنے تئیں بھی کھو جاؤ

(۴) اسکی گلی وہ ظلم کدہ ہے آ نکلے جو کوئی وہاں
گرد رہے عشق آلودہ تو لوہو میں اپنے نہا جاوے

مندرجہ بالا مثالوں میں دوسرے اور تیسرے شعر کے پہلے مصرعوں میں ''یہاں'' کا املا اور وزن دونوں قدیم اصول کے عین مطابق ہیں چوتھے شعر میں ''وہاں'' اور ''وھاں'' دونوں طرح پڑھے جانے کی گنجائش موجود ہے اسی لئے اسے بھی ''وھاں'' ہی سمجھنا چاہئے۔ البتہ پہلے شعر کے پہلے مصرعے میں لفظ ''وہاں'' اور تیسرے شعر کے دوسرے مصرعے میں ''یہاں'' متذکرہ معمول کے برخلاف ''جہاں'' اور ''کہاں'' کے وزن پر نظم ہوا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ان دونوں مصرعوں کا متن اصل متن سے مختلف ہے۔ قلمی نسخے میں یہ دونوں مصرعے اس طرح منقول ہیں۔

(۱) تن کو جس جاگہ سے اب بچھڑوں ہوں وہاں ہے درد درد
(۲) آؤ جو یہاں تو داؤ نکتیں اپنے تئیں بھی کھو جاؤ

یہاں ضمناً یہ عرض کر دینا بھی بے محل نہ ہوگا کہ تیسرے شعر کے مصرعہ اول کا متن مطبوعہ اور قلمی دونوں نسخوں میں بظاہر نادرست ہے قلمی نسخے میں اس کی صورت حسب ذیل ہے۔

میرؔ جہاں ہے تمام خانہ پیدا یہاں کے پیدا ہے

ہمارے نزدیک صحیح متن ''میرؔ جہاں ہے تمام خانہ پیدا یہاں ناپیدا ہے'' ہو سکتا ہے۔

غزلیات کے بعد دیوان کے اس نسخے میں ''رباعیات'' کے زیر عنوان آٹھ رباعیاں اور ایک قطعہ (نمبر ۴) درج ہے۔ بعد ازاں مثنویات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جس میں بہ تفصیل ذیل پانچ مثنویاں شامل ہیں۔

(۱) ہولی نامہ: کلیات میرؔ جلد دوم میں اسے ''در بیان ہولی'' سے موسوم کیا گیا ہے اس میں کل ۴۵ شعر ہیں۔ اختتام سات اشعار کی ایک غزل پر ہوا ہے۔ اس طرح ان کے اشعار کی مجموعی تعداد ۵۲ ہو گئی ہے۔

(۲) بزنامہ: کلیات میں اسے ''در بیان بز'' کا نام دیا گیا ہے اشعار کی تعداد ستائیس ہے۔

(۳) جگر سوز: کلیات میں اس کا عنوان ''در حال افغان پسر'' ہے وہاں اس کے اشعار کی تعداد ۱۶۴ ہے مخطوطے میں شعر نمبر ۱۵۶ کے

(بقیہ صفحہ ۱۸ پر)

اکبر حیدری کشمیری
ہمدانیہ کالونی بمنہ، سری نگر

میر کی دو اہم مثنویاں

دربجو خانہ اور دریائے عشق (قلمی) مع میر کا غیر مطبوعہ کلام

سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا
مستند ہے میرا فرمایا ہوا

چل اے خامہ بسم اللہ باب

راقم حروف نے عمر کا بیشتر حصہ مختلف کتب خانوں کی نذر کیا ہے۔ یہ سلسلۂ عمل بفضلہ آج تک جاری ہے۔ مخطوطات میر کا بیش بہا خزانہ جناب راجہ صاحب محمود آباد کے نادر الوجود کتب خانہ میں محفوظ ہے یہاں میں عرصۂ دراز تک جناب مہاراج کمار صاحب محمد امیر حیدر خاں مرحوم کے تعاون سے کام کرتا رہا اور دیوان میر کا ایک گوہر نایاب نسخہ ۱۹۶۲ میں مرتب کیا جو بعد میں جموں کشمیر کلچرل اکادمی سری نگر نے حسن اہتمام کے ساتھ ۱۹۷۳ء میں شائع کیا۔ اس کے علاوہ دیوان کی ترتیب میں مسعود حسن رضوی لکھنؤ یونیورسٹی اور علامہ شبلی نعمانی (ندوہ) لکھنؤ کے کتب خانوں میں متعدد نسخے موجود ہیں ہم نے ان تمام نسخوں سے بھی استفادہ کیا ہے۔ نسخۂ مسعود صحیح اور معتبر ہے۔ اس میں میر کے مراثی کے علاوہ بہت سے غیر مطبوعہ اشعار بھی ہیں۔

عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد کے شعبہ اردو میں تقرری کے دوران سب سے پہلے ڈاکٹر زور مرحوم کے قائم کردہ ادارہ ادبیات اردو کے بے نظیر کتب خانے میں میر کے قلمی دیوان دیکھے۔ یہاں کلیات میر کا اس وقت تک کا قدیم ترین مخطوط مکتوبہ ۱۱۹۲ھ محفوظ ہے اس کا مکمل عکس میں نے حاصل کیا ہے۔ کئی برسوں سے مرتب کیا ہوا تیار ہے ابھی تک شائع نہ ہو سکا اس میں بھی غیر مطبوعہ اشعار کا انبار عقیدہ ہے۔ ایک نسخہ میر کے شاگرد میر ذوالفقار علی کے ہاتھ کا لکھا ہوا کتب خانہ آصفیہ کی زینت ہے۔ اس پر سال کتابت نہیں ہے بلکہ یہ عبارت ہے۔

"ترقیمہ تمت بالخیر بعون الملک الوہاب بدستخط ذوالفقار علی

باتمام رسید۔ دیوان کلیات میر سلمہ اللہ تعالیٰ"

یعنی یہ دیوان بحیات میر ان کے لکھنؤ کے شاگرد نے اپنے ہاتھ سے لکھا تھا جو بعد میں حیدر آباد گئے تھے۔ دیوان کے ضروری حصے کا عکس ہم نے حاصل کیا ہے یہ بھی نہایت معتمد علیہ نسخہ ہے۔ غیر مطبوعہ اشعار کی تعداد میں نے اچھی خاصی قلمبند کی ہے۔ تمام قلمی نسخوں کے مقابلہ میں نسخۂ ہٰذا میں مرثیوں کی تعداد سب سے زیادہ یعنی ۳۴ ہے۔

ہم نے سالار جنگ میوزیم میں بھی مسلسل کام کیا۔ یہاں دیوان میر کے کئی مخطوطے ہیں۔ سب سے معتبر نسخہ وہ ہے جس کے آغاز میں دو مہریں نمایاں ہیں۔ ایک نواب سالار جنگ کی دوسری سید محمد علی خاں بہادر کی جو سالار جنگ کے دادا تھے یعنی نواب مختار الملک کے والد۔ آخر میں یہ ترقیمہ ہے۔

"تمام شد دیوان میر محمد تقی میر تخلص۔ بتاریخ شانزدہم ربیع الثانی ۱۲۴۱ھ"

اس مخطوطے کی یہ خصوصیت ہے کہ اس میں ایک مکمل قصیدہ کئی مثنویاں اور بہت سے اشعار غیر مطبوعہ ہیں۔

اسی شاندار کتب خانہ یعنی سالار جنگ میوزیم میں شاہ کمال مانک پوری کا غیر مطبوعہ عظیم ترین اردو تذکرہ (دو جلدوں میں) "مجمع الانتخاب" کے نام سے ۱۵۶۴ (۱۳×۱۸ انچ سائز میں) صفحوں پر مشتمل زیر کیٹلاگ نمبر ۱۲۹ موجود ہے۔ تذکرہ بھاری بھرکم کشمیری کاغذ میں دو ضخیم جلدوں میں ہے اس لئے لوگ اسکی ضخامت سے ڈرتے ہیں اور وہ اس کی زیارت سے خوفزدہ ہوتے ہیں۔ کتبخانے میں میں مہینوں لنگر انداز رہا۔ میں نے بھی کسی اسکالر کو وہاں نہیں دیکھا بہر حال تذکرہ کے آخر میں ۵ ذی القعدہ ۱۲۱۹ھ مطابق ۵ فروری ۱۸۰۵ء

کا سال کتابت موجود ہے۔ تذکرہ ۱۲۱۸ھ میں اختتام پذیر ہوا تھا۔ شاہ کمال لکھنؤ میں میر کے دوستوں میں رہ چکے تھے۔ انھوں نے ہی نواب آصف الدولہ بہادر (م ۱۲۱۲ھ) کو بیس اردو دیوان مع قلمی رنگین تصاویر نقل کرنے کے لئے دئے تھے ان میں میر کا دیوان بھی تھا شاہ کمال اپنے تذکرہ میں میر کے ترجمہ کے آخر میں لکھتے ہیں

"فقیر میر صاحب .... را ہنوز بخیر و خوبی بہ لکھنو گذاشتہ آمدہ است۔ حق تعالیٰ سلامت دارد، عمرش از ہشتاد متجاوز خواہد بود و ایں چند غزلہائے از ہمہ دیوانہائے مذکورہ با نتخاب در آوردہ"

۱. ،، مثنوی موسوم بہ جذب عشق (اصل میں یہ دریائے عشق ہے)
۲. انتخاب دیوان پنجم میر صاحب موصوف کہ نام دیوان زادہ نہادند"

تذکرہ شاہ کمال کے مخطوطے سے ہم نے کلام میر کا سارا انتخاب جو سیکڑوں اشعار پر مشتمل ہے کے علاوہ مکمل دیوان زادہ اپنے ہاتھ سے نقل کیا ہے اس طرح غیر مطبوعہ اشعار کی کئی مکمل غزلیں ہاتھ آئیں جب اس کی اطلاع جناب مشفق خواجہ صاحب کو ملی تو انھوں نے اپنی مسرت کا اظہار ۲؍ فروری ۱۹۸۹ کو خط میں درج ذیل الفاظ میں کیا۔

"یہ واقعی خوشی کی بات ہے کہ آپ نے دیوان میر مکتوبہ ۱۱۹۲ھ کا عکس حاصل کر لیا ہے بلکہ اب تو اسے مرتب بھی کر لیا ہو۔ اس نادر مخطوطے کو عکس کی صورت میں ضرور چھپنا چاہئے۔ اگر آپ پسند فرمائیں تو انجمن ترقی اردو پاکستان کی طرف سے اس کی اشاعت کا انتظام کیا جا سکتا ہے"

"مجمع الانتخاب میں شامل انتخاب میر شائع کرنے کا ارادہ بہت خوب ہے کیا ہی اچھا ہو اگر آپ رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن کے نسخے کو بھی سامنے رکھیں اور اس کے اختلاف بھی درج کر دیں۔ دیوان میر پر مقالہ جلد روانہ کریں"

حیدرآباد میں ہی اردو کے ایک فدائی صاحب مذاق محمد عبدالصمد خاں نے نور خاں بازار میں فقید المثال کتب خانہ اردو ریسرچ سنٹر کے نام سے قائم کیا تھا۔ میں ہر ہفتے اور چھٹی کے دن وہاں مکمل تین دن شب و روز قیام کرتا تھا۔ قیام و طعام کی ذمہ داری صمد صاحب نے قبول کی تھی دیگر کاموں کے علاوہ یہاں بھی میں نے مخطوطات میر کا مطالعہ کیا۔ غرضیکہ میں نے مخطوطات میر پر اتنا کام کیا ہے جس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ اس طرح میں نے خدائے سخن، شہنشاہ تغزل میر تقی میر کے سیکڑوں گوہر نایاب اشعار جن میں سے ہر شعر سوز و گداز اور افتادگی کے پیکر میں ڈھلا ہوا ہے دریافت کئے ہیں۔ میر نے ان کے بارے میں دو سو ساٹھ سال قبل یہ پیشین گوئی کی تھی۔

مجھ کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب میں نے
درد و غم کتنے کئے جمع کہ دیوان کیا

ناقدین ادب میر کی غزلوں کے علاوہ میر کی مثنویوں کے بھی دلدادہ ہیں اس لئے انھوں نے اچھا خاصا کام بھی کیا ہے بعضوں نے انتخابات بھی شائع کئے غالباً انھوں نے کسی معتبر قلمی نسخے کو پیش نظر نہ رکھا ہو۔ یہ درست ہے کہ بعض نے کئی غیر مطبوعہ مثنویاں بھی دریافت کیں جیسے پروفیسر گیان چند جین مرحوم نے مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ ان لوگوں کا کام نامکمل ہے۔ اس کی وجہ خاص یہ ہے کہ انھوں نے کلیات میر مطبع نول کشور لکھنؤ کے کسی نسخے کو سامنے رکھا ہو۔ نسخہ نول کشور کے تمام مطبوعہ نسخوں کی بنیاد نسخۂ کلکتہ (مطبوعہ ۱۸۱۱ء) کے واحد نسخہ پر موقوف ہے۔ جو نامکمل، ناقص، غیر مربوط اور اغلاط سے پر ہے۔ اس طرح آج کے دن تک جتنے کلیات میر کے ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں وہ سب کمزور بنیاد کے ہیں۔ خوب کہا گیا ہے کہ

خشت اول چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

میر کا انتقال بڑی کسمپرسی میں ۱۲۲۵ھ مطابق ۱۸۱۰ء میں لکھنؤ میں ہوا۔ مرنے سے قبل کئی سال تک صاحب فراش تھے۔ گھر میں کوئی ایسا مرد نہیں تھا جو کلیات پر نظر ثانی کر کے اس کی اشاعت کا بندوبست کر سکتا ان کے ناز بردار نواب سالار جنگ محمد علی اور قابل فخر مربی نواب آصف الدولہ بہادر ان سے پہلے ہی فوت ہو چکے

تھے۔ نواب سعادت علی خاں (م ۱۲۲۹ھ) نے نواب مرحوم بہادر کے متبنّیٰ بیٹے نواب وزیر علی خاں وزیر کو انگریزوں کے ساتھ سازش کرکے اودھ کی حاکمیت سے معزول کرایا۔ میر نے ان کی بے نظیر شادی کے موقع پر ۱۲۰۸ھ میں ایک مثنوی موسوم بہ "مثنوی شادی یا کدخدائی" کہی تھی جو بعد ازاں کلیات میں شامل کی گئی۔ نواب سعادت علی خاں نے تخت سلطنت پر بیٹھتے ہی مثنوی کے پاداش میں میر کا ماہانہ تین سو روپے موقوف کر دیا۔ ان کی معاشی حالت بہت خراب ہو گئی اور بقول مرزا علی لطف (م ۱۲۴۸ھ) صاحب گلشن ہند (صفحہ ۱۵۳) میر نان شبینہ کے محتاج ہو گئے تھے۔ لکھنؤ کے ریزیڈنٹ کرنل اسکاٹ نے ۱۲۱۵ھ (۱۸۰۱ء) میں میر کو فورٹ ولیم کالج میں اردو تالیف و تصنیف کے لئے طلب کیا لیکن بیماری اور پیرانہ سالی کے وجہ سے نہ جا سکے۔ میرے خیال میں غالباً لکھنؤ کے کسی غیر ذمہ دار فرد نے کلیات میر کا کوئی نامکمل اور غیر مربوط نسخہ کالج کے کسی اہل کار کو فروخت کیا ہو۔ جو میر کے انتقال کے بعد ہی ۱۸۱۱ (مطابق ۱۲۲۶ھ) میں شائع کیا گیا تھا۔ ان دنوں لکھنؤ میں دیوان میر کے قلمی نسخے فراوانی سے دستیاب تھے۔

میری تحقیق کے مطابق میر سات آٹھ سال انتقال سے قبل صاحب فراش اور طرح طرح کے حوادث کے شکار ہو رہے تھے اور ان پر متواتر یکے بعد دیگرے قیامتیں گویا ٹوٹ پڑ رہی تھیں۔ اس پر مستزاد قوائے بدن کا اضمحلال اور درازی عمر۔ عرصہ سے مجلسوں اور مشاعروں میں جانا موقوف کر دیا تھا۔ ایک طرف آنکھوں کی بینائی جواب دے چکی تھی اور ضعف گراں گوشی سے دوچار۔ دوسری طرف درد دنداں نے پریشان کیا تھا۔ اسی رنج والم کے عالم میں ۱۲۱۴ھ میں اپنے بھانجے اور داماد میر حسن تجلی کا عین جوانی میں داغ مفارقت اٹھانا پڑا۔ ایک نایاب تذکرہ "نوادر الکلام" میں میر کے آلام و مصائب کی منظر کشی درج ذیل الفاظ میں کی گئی ہے۔

"چونکہ گردون بے مدار نقشہ اساس و زمانہ غدار نا سپاس است کسے را نہ بیند کہ بہ کار آمد۔ جگر میر را بحوادث گوناگوں فگار ساخت و آسودہ آشکار انکار کرد۔ در سالے ناز پروردہ آغوش ناز دختر۔ دو در سال دیگر مرحوم جگر افگار خلف کامگار و در رسالے دیگر اہلیہ عفت شعار بہ کنج عافیت مزار آسودند، قیامت آشکار و محشر پدیدار شد۔"

یعنی پہلے جوان سال داماد شاعر میر حسن علی تجلی، ان کے بعد ان کی اہلیہ یعنی میر کی صاحبزادی، ایک سال بعد فرزند ارجمند (میر فیض علی) پھر سال دیگر اہلیہ محترمہ داغ مفارقت دے گئیں۔ سب کے آخر ۱۲۲۵ھ میں میر کارواں یعنی خود میر صاحب۔ ہاں ایک چھوٹا سا بیٹا میر کلو عرش یادگار چھوڑا تھا۔

مثنوی در ہجو خانہ خود

میر نے اس موضوع پر دہلی میں دو مثنویاں دو مختلف اوقات میں نظم کی تھیں۔ دونوں شہپارے احمد شاہ بادشاہ کے افراتفری کے زمانے میں۔ پہلی مثنوی نے میر کی زندگی پر تباہ کن اثرات ڈالے تھے اور دونوں سب سے پہلے کلیات میر نسخہ کلکتہ (مطبوعہ ۱۸۱۱ء) میں شائع ہوئی تھیں۔

۱۔ مثنوی در ہجو خانہ خود (صفحہ ۹۹۱۔ ۹۹۶)

۲۔ مثنوی در مذمت برشکال (صفحہ ۱۰۲۵۔ ۱۰۲۹)

لطف کی بات یہ ہے کہ نسخہ کلکتہ کے ان صفحوں پر کوئی عنوان نہیں ہے بلکہ عنوان کے بدلے "مثنوی دیگر" ہے ہم نے قلمی نسخوں سے موازنہ کرکے دونوں مثنویوں میں اختلاف نسخ اور اغلاط کے علاوہ غیر مطبوعہ اشعار کی نشاندہی بھی کرلی ہے فی الحال تنگی وقت کی وجہ سے "مثنوی در خانہ خود" کا حقیقت حال بیان کرنا مقصود ہے مثنوی میں ۱۱۹ شعر ہیں۔

ہم اوپر واضح الفاظ میں بتلا چکے ہیں کہ نسخہ کلکتہ درست نہیں ہے اس لئے اس کے بعد جتنے بھی نسخے اسکی پیروی میں شائع ہو چکے ہیں ان سب کا یہی حال ہے یعنی نامکمل اور غلط۔ بعض ناقدین نے فخر سے لکھا ہے کہ انھوں نے نسخہ کلکتہ دیکھا تھا یہ غلط ہے۔ اگر انھوں نے دیکھا ہوتا تو چند اغلاط کی نشاندہی کرتے۔ بعضوں کا یہ دعویٰ لغو اور گمراہ کن ہے کہ انھوں نے حیدرآباد جا کر دیوان میر مکتوبہ ۱۱۹۲ھ وغیرہ کا مطالعہ کرکے کلیات میر صحت و اضافہ کے ساتھ پہلی مرتبہ ایڈٹ کیا ہے۔ اگر ان کا کہنا صحیح ہوتا تو ایک

ہی غیر مطبوعہ شعر کا اضافہ کیا ہوتا۔ معلوم نہیں کہ ادبیات میں دروغ گوئی کا طومار بیان کرنے سے کیا فائدہ ہے؟ ہم ذیل میں اپنے موقف کی تائید میں اب مثنوی ہجو خانہ خود کو مثال کے طور پر نمونہ مشتے از خروارے پیش کرتے ہیں۔ مثنوی کے متعدد معتبر نسخے زیر مطالعہ رہے اس میں یہ نسخے قابل ذکر ہیں۔

(۱) دیوان میر نسخہ ادبیات اردو حیدر آباد مکتوبہ ۱۱۹۲ھ
(ورق ۱۵۶ الف۔ تعداد اشعار ۱۲۵)

(۲) دیوان میر نسخہ سالار جنگ حیدر آباد مکتوبہ ۱۲۴۱ھ
(ورق ۱۷۱ الف۔ تعداد اشعار ۱۲۵)

مجھے اس بات پر انتہائی مسرت ہوتی ہے کہ میں پہلا اسکالر ہوں جس نے کوئی ڈھائی سو سال بعد میر کی زندگی کا ایک ایسا جاں گداز اور عبرت ناک حادثہ دریافت کیا جس پر دبیز پردے پڑے ہوئے تھے۔ واقعہ یوں ہے کہ احمد شاہ بادشاہ کے آخری زمانہ میں جب میر دلّی میں مفلسی کے دن گزار رہے تھے۔ برسات میں بارشوں کا ریلا طوفان بدوش کی صورت میں نمودار ہوا اور پانی آناً فاناً میر کے گھر کی طرف رخ کرکے میر کے سر سے گذر گیا میر مصیبتوں میں چاروں طرف سے گھر گئے۔ مکان کی چھت ڈھہنے سے میر کا اکلوتا بیٹا ملبے میں دب گیا۔ بڑی مشکلوں سے میر نے ملبہ ہٹا کر بیٹے کو نکالا۔ اس کی ہڈی پسلی ایک ہوگئی تھی۔ علاج معالجہ خود میر نے کیا اور آہستہ آہستہ سنبھل گیا۔ میر نے ذکر میر میں اس کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ انھوں نے کبھی اہل خاندان کے بارے میں کوئی بات بیان نہیں کی۔ یہاں تک کہ کسی بڑے واقعہ یا سانحہ کی تاریخ بھی نہیں لکھی ہے۔

یہ تو ثابت ہے کہ میر کے قیام دلی میں ان کے ساتھ اکلوتا بیٹا تھا اغلب ہے کہ یہی میر فیض علی فیض تھے۔ مبتلا لکھنوی تذکرہ گلشن سخن (سال تصنیف ۱۱۹۴ھ صفحہ ۱۸۱) میں ہے کہ میر فیض علی جواں سال ہیں اور اپنے والد کے شاگرد ہیں۔ مصحفی (تذکرہ شعرائے اردو) اعظم الدولہ سرور (عمدۂ منتخبہ) اور دوسرے پرانے تذکرہ نگاروں نے فیض کا ذکر کیا ہے۔ میر جب ۱۱۹۶ھ میں لکھنؤ آئے تو فیض علی فیض ہمراہ تھے۔ میر نے ایک خاص رسالہ فارسی میں انھیں فیض کے لئے لکھا تھا۔ اور اپنے اور ان کے نام کی رعایت سے اس کا نام (فیض میر) رکھا تھا۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی نے اسے پہلے پہل مرتب کرکے ۱۹۲۹ء میں شائع کیا۔ اس کے مقدمہ میں فیض کا مختصر حال اور نمونۂ کلام بھی شامل کیا ہے۔

میر نے فیض علی فیض کے ملبے میں دبنے کا جو حال مثنوی در ہجو خانۂ خود میں لکھا ہے وہ متذکرہ بالا نسخوں سے اخذ ہے۔ ذیل کے اشعار میں پہلے نو شعر غیر مطبوعہ ہیں بقیہ ۱۲ شعر ربط مضمون اور سلسلہ بیان کرنے کے لئے درج کئے گئے ہیں۔ مثنوی کا پہلا شعر یہ ہے۔

کیا لکھوں میر اپنے گھر کا حال
اس خرابی میں میں ہوا پامال

غیر مطبوعہ اشعار

کچھ نہ بوسیدگی نے چھوڑا تھا — گھر نہ تھا ایک پکا پھوڑا تھا
متصل گھن چڑھے ہے لکڑی کا — کبھو پکڑے یہ جالا مکڑی کا
کبھو بچھونے پہ گاہ تکیہ تلے — زیر پہلو بھی کتنے مُسلے ملے
ایک اگر سر سے مُسلا جاتا ہے — پاؤں پر ایک دوڑ آتا ہے
بوریوں پر بدان سونے لگے — چارپائی کھٹولے کونے لگے
کس کا مانع ہو موندلے در تو — ایک بازار ہوگیا گھر تو
شب مساجت سے جو ہو چھکتے ہیں — کتنے حجرے کا حکم رکھتے ہیں

ایک بیٹا جواں گیا تھا دب
روز روشن ہوا سیہ جوں شب

صورت اس لڑکے کی نظر آئی — ہم جو مردے سے جان سی پائی
آنکھ کھولی ادھر ادھر دیکھا — اس خرابے کو پھر نظر دیکھا
قدرتِ حق دکھائی دی آخر — یعنی نکلا درست وہ گوہر
داشت کی کوٹھری میں لا رکھا — گھر کا غم طاق پر اٹھا رکھا
مومیائی کھلائی کچھ ہلدی — فرصت اس کو خدا نے دی جلدی
غم ہوا تھا دو سہ داروں کو — پھر بندھا یہ خیال یاروں کو
شہر میں جا بہم نہ پہونچے کہیں — چار و ناچار پھر رہا میں وہیں
اب وہی گھر ہے بے سر و سایہ — اور میں ہوں وہی فرو مایہ
دن کو ہے دھوپ رات کو ہے اوس — خواب راحت ہے یاں سے سو کوس

قصر کو تہ دن اپنے کھوتا ہوں　　رات کے وقت گھر میں ہوتا ہوں
نہ اثر بام کا نہ کچھ در کا
گھر ہے کا ہے کو نام ہے گھر کا

۲. مثنوی دریائے عشق

دریائے عشق میر کی اہم ترین مثنویوں میں سے ہے مجھے اس کے حسب ذیل نسخے دستیاب ہوئے۔

۱. مشمولہ دیوان میر. مکتوبہ ۱۱۹۲. تعداد شعر ۲۶۳
۲. نسخہ مفتی الٰہی بخش (کاندھلہ) ضلع مظفر نگر. مکتوبہ ۱۱ ذی الحجہ ۱۲۰۶ھ. تعداد ۲۷۲.
۳. نسخہ آگرہ. شعبہ محمدیہ کالج (بیاض قدیم) مکتوبہ اول رجب ۱۲۱۶ھ تعداد ۲۶۸.
۴. دیوان میر. نسخہ مسعود حسن رضوی لکھنؤ. بحیات میر. تعداد شعر ۲۴۴
۵. تذکرہ مجمع الانتخاب (حیدرآباد) ۱۲۱۸ھ تعداد شعر ۲۵۵
۶. دیوان میر. نسخہ علی گڑھ. بحیات میر. تعداد شعر ۲۶۱
۷. دیوان میر. نسخہ آصفیہ (ورق ۲۵۴ب) بحیات میر تعداد ۲۶۱
۸. نسخہ لندن. (عکس) مکتوبہ ۱۲۴۱ھ تعداد ۲۵۶

مثنوی لندن سے بھی ۱۸۲۰ء میں شائع ہوئی۔ اے ڈبلیو. کار مائیکل اسمتھ نے مرتب کیا تھا اور غلطی سے "شعلہ عشق" کے عنوان سے چھپی تھی. مرتب نے اس پر ایک صفحہ کا دیباچہ انگریزی لکھا تھا. مثنوی کا متن پہلے رومن رسم الخط اور پھر اردو میں لکھا گیا تھا گارساں دتاسی نے اسی غلط نام سے دریائے عشق کا ترجمہ ۱۸۲۶ء میں فرانسیسی زبان میں کیا تھا.

دریائے عشق میر کی دو اور مثنویوں کے ساتھ غرہ شعبان ۱۲۵۹ھ مطابق اگست ۱۸۴۳ء کو "باہتمام محمد مصطفےٰ خاں ولد حاجی محمد روشن خاں... در مطبع مصطفائی واقع بیت السلطنت زیر اکبری دروازہ محلہ محمود نگر حلیہ طبع شد" کا نایاب نسخہ ہمارے مطالعہ میں رہا. مثنوی کے آخر میں مسجد آصف الدولہ (آصفی امام باڑہ) رومی دروازہ مسجد ٹیلہ شاہ پیر محمد مرحوم، امام باڑہ بھوانی مہر، مسجد جانب پیر بخارا وغیرہ بلند عمارتوں کا نقشہ ہے. رومی دروازہ سے چوک کا راستہ بھی دکھائی دیتا ہے. جانب شمال دریائے گومتی ہے جس میں کشتیاں بھی ہیں نقشہ پر یہ عبارت ہے.

"نقشہ نوشتہ مرزا علی بخش نقاش در مطبع میر حسن رضوی طبع شد در ۱۲۵۹ نبوی ہجری مطابق ۱۸۴۳ء"

یہ تینوں مثنویاں ایک ہی جلد میں راجہ صاحب محمود آباد کے ذخائر مطبوعات قلعہ محمود آباد واقع ضلع سیتاپور میں ہیں. اس کے بعد یہ مثنویاں مطبع مصطفائی کانپور میں ۱۲۶۲ھ اور ۱۲۶۷ھ میں دوبارہ شائع ہوئیں. مطبع مصطفائی کے علاوہ مطبع مسیحائی کانپور میں بھی چھپی تھیں، یہ سبھی مطبوعات میں نے استفادہ کی تھیں.

کلیات میر نسخہ کلکتہ (مطبوعہ ۱۸۱۱ء) میں دریائے عشق بغیر کسی نام کے صفحہ ۸۹۷ - ۹۱۰ درج ہے. کلیات کے آخر میں ایک لمبی فہرست کئی صفحوں پر شامل ہے اس کے صفحہ ۱۰۷۲ میں مثنوی کے عنوان کے بدلے "مثنوی دیگر" لکھا ہے. کلیات میر مطبوعہ نول کشور لکھنؤ کے ایڈیشن ۱۸۶۸ میں بھی اس کا کوئی عنوان موجود نہیں ہے البتہ اس کے دوسرے ایڈیشن ۱۸۷۴ (صفحہ ۵۳۳) میں پہلی مرتبہ "مثنوی دریائے عشق" کا عنوان لکھا گیا ہے. اس کے بعد کے تمام نسخوں میں یہی درج ہے. اسی غلطی کی وجہ سے گارساں دتاسی وغیرہ کو بھی نام کا سہو ہو گیا تھا.

الغرض! میر کی دریائے عشق ایک انمول ادبی شاہکار ہے اس کا لب و لہجہ اور حسن ادا ایک سنگ دل کو بھی گداخت کرنے کیلئے کافی ہے. مثنوی کا مختصر خلاصہ یہ ہے.

"ایک جوان رعنا، سرو بالا، آفت کا پالا، معاملات عشق میں ناآشنا، ناکامی میں جان دینے والا مثل فرہاد، خانماں برباد سیر چمن سے واپس گھر کو آرہا تھا. ناگاہ کسی غرفے میں ایک بت طناز، سراپا ناز، جان لیوا مہ پارہ سے آنکھیں چار ہو گئیں اور آن واحد میں بجلیاں گرنے سے آنکھیں چکاچوند ہو گئیں. پھر کیا تھا. کہ عاشق ناپختہ کار آہ خسر بار پھونکنے لگا. دیکھتے دیکھتے بے چارہ ہوش و خرد اور صبر و تحمل کھونے لگا. مصیبت کا مارا، پریشان حال مجنوں صفت آوارہ. اس رشک لیلیٰ کے کوچے کی خاک سر پر اڑاتا ہوا

بھرنے لگا۔ رفتہ رفتہ اس ماہ پارہ کے اعزّہ کو خبر ہوئی انھوں نے بہ پاس ننگ و ناموس اس غیرت ماہ کو اس کی دایہ کے ہمراہ قفس میں بٹھا کر دریا پار کسی عزیز کے پاس بھیجا۔ یہ مجنوں بھی آہیں بھرتا ہوا پیچھے پیچھے روانہ ہوا۔

گھر سے باہر محافہ جو نکلا
اس جواں ہی کے پاس ہو نکلا
طیش میں دل سے ہو کے یہ آگاہ
ہو لیا ساتھ اس کے بھر کر آہ

جب دریا پر پہونچا تو محبوبہ اور دایہ کو کشتی میں سوار ہوتے دیکھ کر اپنی بے کسی اور محبوبہ کی جدائی پر آہ و فغاں شروع کی دایہ نے بکمال حیلہ سازی اس بے خود و بے باک عاشق کو بھی سفینہ میں سوار کیا اور عین منجدھار میں پہونچ کر اس پرفن محبوبہ کی کفش پا عاشق کو دکھا کر دریا میں پھینک دی اور اس سے کہا کہ اگر تجھ میں غیرت عشق ہے تو اسے نکال لے۔ اسے اتنی تاب کہاں تھی فوراً دریا میں کود پڑا۔ امواج گرداب زنجیر پا ہو گئیں اور قعر دریا کی طرح کشاں کشاں لے گئیں۔ ایک ہفتہ کے بعد محبوبہ نے دایہ سے کہا کہ وہ فرومایہ اب غرق آب ہو گیا اور وہ ننگ دریا یہاں سے جاتا رہا۔ میں یہاں بہت پریشان ہوئی۔ اب گھر واپس چلیں۔ دایا رضامند ہوئی اور دونوں سوار ہو گئے جب دریا پر پہونچے تو اس محبوبہ نے دایہ سے کہا کہ جہاں وہ آرزو مند ڈوبا تھا وہ جگہ مجھے دکھا تا کہ میں بھی موجۂ گرداب کی سیر کروں دایہ اصل مطلب نہ سمجھی اور وہ جگہ دکھا دی کہ یہاں وہ کودا تھا محبوبہ فوراً اس جگہ کود گئی اور آنِ واحد میں غائب ہو گئی گھر والوں کو خبر ہوئی۔ دام داروں کو بلایا۔ آخر کار غوطہ خوروں نے دونوں کو بغلگیر ہو کر نکال دیا"۔

ذیل میں دریائے عشق مکتوبہ ۱۲۰۶ھ نسخہ کاندھلہ مظفر نگر سے غیر مطبوعہ اشعار درج کئے جاتے ہیں۔ ان میں کچھ شعر دوسرے نسخوں میں بھی موجود ہیں۔

ایک نے ابتدائے ملامت کی ‏ ‏ ‏ ‏ ایک نے شورش قیامت کی
ایک اسے تیر سے ڈراتا تھا ‏ ‏ ‏ ‏ ایک برچھی اسے دکھاتا تھا
ایک کہنے لگا کہ اے بے ننگ ‏ ‏ ‏ ‏ زندگی کا ہے یہ بھی کوئی ڈھنگ
مجھ کو گھر میں نہیں ہے اب آرام ‏ ‏ ‏ ‏ رنج شام و سحر ہے مجھ کو مدام
خاک ہو کیوں نہ عاشق بے دل ‏ ‏ ‏ ‏ کام اپنے سے وہ نہیں غافل

عشق میں آہ کھو دیا اس کو
آخر آخر ڈبو دیا اس کو

دریائے عشق میر کی پسندیدہ مثنوی تھی انھوں نے اس کو فارسی نظم و نثر کا بھی جامہ پہنایا تھا۔ یہ دونوں چیزیں میری نظر سے گذری ہیں۔ علی گڑھ کی فارسی مثنوی میں ۱۷۰ شعر ہیں چند شعر یہ ہیں۔

روزے آں دل فگار خستہ جگر ‏ ‏ ‏ ‏ ناگہاں جانبے نمود گذر
بر سر او بلائے تازہ رسید ‏ ‏ ‏ ‏ کہ بہ یک غرفہ آفت جاں دید
آخر او را بہ دایۂ غم خوار ‏ ‏ ‏ ‏ وقت شب در محافہ کرد سوار
از کمالِ نشاط فرحتِ دل ‏ ‏ ‏ ‏ رفتہ رفتہ رسید بر ساحل
چوں درآں حال دایۂ داغدار ‏ ‏ ‏ ‏ شد بہ کشتی سوار با دل زار
گفت آں نازنیں کہ بہر خدا ‏ ‏ ‏ ‏ پئے تفریح جانِ غم اما
پردہ وا کن کہ سیر آب کنم ‏ ‏ ‏ ‏ شستہ گردد مگر غبار الم
در فنِ مکر دایہ کامل بود ‏ ‏ ‏ ‏ لیک از کار عشق غافل بود
از محافہ چو پردہ را وا کرد ‏ ‏ ‏ ‏ آشنا را خروشِ دریا کرد
از میانِ سفینہ جست بر آب ‏ ‏ ‏ ‏ گشت غائب درآں بسانِ حباب
دولت وصل یار حاصل کرد ‏ ‏ ‏ ‏ راحت بے شمار حاصل کرد
چو زدر بہ ساحل آوردند ‏ ‏ ‏ ‏ ہمہ بر حال شاں نظر کردند

لب بر لب آمدند دوش بہ دوش
ساق بر ساق دست در آغوش

میر کے غیر مطبوعہ اشعار

جیسا کہ مرقوم ہو چکا ہے کہ میرے پاس میر تقی میر کے جملہ اصنافِ سخن کے غیر مطبوعہ اشعار کے آبدار موتیوں کا ایک دفینہ ہے جس کو میں اپنی زندگی کا سرمایہ قرار دیتا ہوں۔ یہ تمام اشعار مخطوطاتِ میر کی تفصیلات کے ساتھ ماہنامہ حکیم الامت سری نگر کے میر نمبر

ہیں دیکھے جاسکتے ہیں۔ ذیل کے چند اشعار ناظرین کی لطف اندوزی کے لئے حاضر ہیں۔ ہر شعر سوز و گداز اور تیز تر نشتر کا پیکر ہے۔

اس فصل میں کہ گل کا گریباں بھی ہے ہوا
دیوانہ ہو گیا سو بہت ذی شعور تھا

وہ جو پی کر شراب نکلے گا
کس طرح آفتاب نکلے گا

محتسب میکدہ سے جاتا نہیں
یہاں سے ہو کر خراب نکلے گا

یہی چپ ہو تو درد دل کہتے
منہ سے کیوں کر جواب نکلے گا

جب لٹھے گا جہاں سے یہ نقاب
تب ہی اس کا حجاب نکلے گا

عرق اس کے بھی منہ کا بو کیجو
گر کبھو یہ گلاب نکلے گا

آؤ بالیں تلک نہ ہوئے دیر
جی ہمارا شتاب نکلے گا

دفتر داغ ہے جگر اس بن
کبھو دن یہ حساب نکلے گا

تذکرے سب کے بھر رہیں گے دھرے
جب مرا انتخاب نکلے گا

میر دیکھوگے رنگ نرگس کا
اب جو وہ مست خواب نکلے گا

دل کے ڈھنے کا تمہیں تو نہیں کچھ غم لیکن
سب کو افسوس ہے اس قصر کی ویرانی کا

ذکر اس بت کا زباں پر ہے بھوں کی اب تو
کہیں مذکور نہیں سنئے خدا خوانی کا

دل بے رحم بھی پھر رحم پر آجاؤں گا
نہیں دیکھا ہے تڑپھنا کبھو قربانی کا

مجھے تو نور نظر نے تنک بھی تن نہ دیا
بہار جاتی رہی دیکھنے چمن نہ دیا

بیاس دیکھنے میں نے تیری اے پوشش
کہ بعد مرگ کہیں نے مجھے کفن نہ دیا

کھلی نہ بات گئی صرف تھی گرہ دل میں
اجل نے لے مجھے کہنے اک سخن نہ دیا

دل مطرب جو میرے ہاتھ آیا
چٹکیوں میں رقیب اڑ جاتا

خواب میں بھی رہا تو آنے سے
دیکھنے ہی کا تھا یہ سب ناتا

الفت اس تیغ سے تھی بے حد میر
قتل کرنا تو لہو جسم جاتا

نہیں ایسا کوئی میرا جو ماتم دار ہووے گا
مگر اک غم ترا لے شوخ بیکس ہو کے رووے گا

اگر اگتے رہے اے ناامیدی داغ ایسے ہی
تو کاہے کو کوئی تخم تمنا دل میں بووے گا

جو ایسے شور سے روتا رہے گا میر تو شب کو
نہ سونے دے گا ہمسایوں کو ٹک نہ آپ سووے گا

ہو تار تار سیتے ہی سیتے وہ اڑ گیا
اب تک عبث میں اپنا گریباں سیا کیا

سن سن کے میری بات کو کیا کیا نہ کہہ سنا
کیا کیا کہوں میں کہ کیا کیا کیا کیا

کاکل میں ہی نہ خط میں نہیں زلف میں نہیں
روز سیہ کے ساتھ مرا دل کدھر گیا

نظر میں آوے گا جب جی کو کھونا
ملے گا نیند بھر تب مجھ کو سونا

جدا اس سیم تن سے کیسا سونا
کہ مٹی کو ڑھے کا اب ہے بچھونا

بہت کی جستجو اس کی نہ پایا
ہمیں در پیش ہے اب جی کا کھونا

تماشا دیکھنے ہنستا چلا آ
کرے ہے شیشہ بازی میرا رونا

جگر کے زخم شاید ہیں نمک بند
مزہ کچھ آنسوؤں کا ہے سلونا

مرا خون تجھ نابت ہی کرے گا
کنارے بیٹھ کر ہاتھوں کو دھونا

وصیت میر نے مجھ کو یہی کی
کہ سب کچھ ہونا تو عاشق نہ ہونا

ذیل کی غزل تمام مطبوعہ نسخوں میں غلط، ناقص اور نامکمل ہے یہاں صحت کے ساتھ لکھی جاتی ہے۔ شعر نمبر ۲، ۳، ۴، ۶، ۱۰ غیر مطبوعہ ہیں۔

محبت کا جب زور بازار ہوگا
بکیں گے سر اور کم خریدار ہوگا

تسلی ہوا صبر سے کچھ میں تجھ بن
کبھو یہ قیامت طرح دار ہوگا

صبا موئے زلف اس کا ٹوٹے تو ڈر ہے
کہ اک وقت میں یہ سیہ مار ہوگا

مرا دل نہ ہو تیرے ہونٹوں پہ مت پوچھ
کہوں گا تو لڑنے کو تیار ہوگا

عجب شیخ جی کی ہے شکل و شمائل
ملے گا تو صورت سے بیزار ہوگا

نہ رو عشق میں دشت گردی کو مجنوں
ابھی کیا ہوا ہے بہت خوار ہوگا

نہ خالی رہے گی مری جا گہ گر میں | نہ ہوں گا تو اندوہ بسیار ہو گا
زمیں گیر ہو عجز سے تو کہ اک دن | یہ دیوار کا سایۂ دیوار ہو گا
یہ منصور کا خون ناحق کو حق تھا | قیامت کو کس کس کا خوں دار ہو گا
نہ مر کر بھی چھوٹے گا اسنار کے گا | ترے دام میں جو گرفتار ہو گا

نہ پوچھ اپنی مجلس میں ہے میر بھی یاں
جو ہو گا تو جیسے گنہ گار ہو گا

یہ کلول نہیں ٹلتی جی پر سے اسکے | علاقہ ہوا جس کو خنجر سے اس کے
سکھاوے ہے ہجراں کا غم دلبروں کے | اُگے پھول کانٹے ہو بستر سے اسکے
وہ بے رحم گھر سے بھی اپنے نہ نکلا | گئیں نعشیں غم کشتوں کی در سے اسکے
کبھو کہاوے گا آفتاب آنت ابا | سحر دیر بڑھتا ہے اب گھر سے اسکے

کہیں میر کی جلتی آنکھیں ہوں ٹھنڈی
کف پا ملو دیدۂ تر سے اس کے

:- رُباعی :-

کیا کہیئے کہ فرط شوق نے جی مارے
دکھ اگلے بھلا دئے ہمارے سارے
اے میر شمار دم کے کس کو ہیں حواس
اب یاد نہیں اپنے ہیں ہم پیارے

OO

میر کا دیوانِ چہارم ...... (صفحہ ۱۰ کا بقیہ)

(صفحہ ۱۰ کا بقیہ)

لہٰذا مندرجہ شعر زائد ہے۔

چلا ساقہ چپ سر فگندہ کیا
عدم کو نہیں کوئی زندہ گیا

یہ مثنوی مخطوطے میں کسی عنوان کے بغیر منقول ہے۔ کلیات میں اس کا اندراج "در جشن ہولی و کتخدائی"، کے عنوان سے ہوا ہے اور اس کے اشعار کی مجموعی تعداد ایک سو سترہ ہے آخر میں شامل غزل کے دس شعر اس کے علاوہ ہیں مخطوطے میں اس حصہ کے دو دو ورق غائب ہیں جن پر شعر نمبر ۶۹ سے شعر نمبر ۱۱۶ تک کل ۴۸ اشعار درج تھے اس کے نتیجہ میں موجودہ اشعار کی کل تعداد ۶۹ رہ گئی ہے۔ شعر نمبر ۵۷ سہواً مکرر درج ہو گیا ہے۔

اس مثنوی میں جو غزل شامل ہے اس کا چوتھا مصرع تاریخی ہے نسخۂ مطبوعہ میں اس کی صورت حسب ذیل ہے۔

ہم نے کبھی نہ دیکھی اس رنگ کد خدائی

اور اس سے سن ۱۲۱۷ھ مطابق ۱۸۰۳ء/ ۱۸۰۲ء اخذ کیا گیا ہے۔ اس کے برخلاف قلمی نسخے میں اس مصرعہ کے تیسرے لفظ "کبھی" کی جگہ "کبھو" منقول ہے اور اس کے نیچے ۱۲۰۹ھ درج ہے حالانکہ یہ مثنوی وزیر علی خاں کی تقریب شادی سے متعلق ہے جو کمال الدین حیدر کے بیان کے مطابق ۱۲۰۸ھ / مطابق ۱۷۹۴ء میں ہوئی جب کہ تاریخ گوئی کے مسلہ اصولوں کے مطابق پیش کردہ مصرعے سے اسکی موجودہ دونوں صورتوں میں بالترتیب ۱۲۲۶ھ اور ۱۲۲۲ھ برآمد ہوتا ہے۔ اس اشکال کو دور کرنے کی ممکنہ صورت یہ ہے کہ اس مصرعے کے متن میں "نہ" اور "دیکھی" کو علاحدہ علاحدہ لکھنے کی بجائے ملاکر (ندیکھی) لکھا جائے اور یہ مان لیا جائے کہ میر صاحب نے قاعدے کے برخلاف لفظ "کد خدائی" کی پہلے یے کو ہمزہ قرار دیکر اور اس کا ایک عدد محسوب کرکے مطلوبہ سن ۱۲۰۸ حاصل کیا ہے۔

(۵) جنگ نامہ: مخطوطے میں یہ مثنوی پچپن اشعار اور سات شعر کی ایک غزل پر مشتمل ہے۔ مطبوعہ کلیات میں بھی مثنوی کے اشعار کی تعداد پچپن ہی ہے لیکن اس کے آخر میں مخطوطے کی منقول غزل کی بجائے دوسری دو غزلیں شامل ہیں جن کے اشعار کی تعداد بالترتیب نو اور پانچ ہے۔ مخطوطے کی غزل کا مطلع درج ذیل ہے۔

رنج کی اس کے جو خبر گذرے
رفتہ وارفتہ اس کا مر گذرے

یہ غزل اسی دیوان کے حصہ غزلیات میں بھی موجود ہے کلیات مطبوعہ میں اس کا نمبر ۱۵۲۶ ہے اس کا ایک غزل کا دو جگہ درج کرنا میر صاحب کے معمولات کے خلاف ہے۔

غزلیات کی طرح مثنویات کے اشعار میں بھی جا بجا اختلاف متن کی مثالیں موجود ہیں فی الحال مضمون کی طوالت کے پیش نظر ان کی تفصیل کسی اور وقت کے لئے ملتوی کی جاتی ہے۔

OO

پروفیسر سید مجاور حسین رضوی
۵۲۴، اتر سوئیا، حسن منزل، الہ آباد

بطرزِ انشائیہ

دیارِ میر

"آنکھیں کھولیں اور ذرا ہوش آیا تو سنائی دیا" اے فرزند عشق کرو، عشق سوز ہے، عشق ساز ہے۔ ہوا کا اضطرار عشق ہے، پانی کی رفتار عشق ہے، خاک کا قرار عشق ہے، موت عشق کی مستی ہے حیات اسکی ہوشیاری ہے.. اس پس منظر والا لڑکا جب شعر کہے گا تو ظاہر ہے کہ وہ ایسے ہی شعر کہے گا جس میں عشق کا بیان ہو۔ جہاں محبت ظلمت سے نور کا ڈھتی ہے۔ یہی محبت ہے جو عشق کی ایک منزل ہے۔ عشق حق ہے، نبی ہے کہیں، کہیں محمد ہے۔ کہیں علی ہے، کہیں جبرئیل امیں ہے۔ عشق ہی ہے جو زیر تیغ ستم شہید ہوتا ہے اور یہیں سے سلسلۂ غم شروع ہوتا ہے۔ اس غم کا نقطۂ اول جدائی تھی۔ یعنی سید امان اللہ۔ وہ بھی صرف تین برس ساتھ رہ پائے تھے اور یہیں سے میر محمد تقی نے غم کا مزہ چکھنا شروع کیا۔ سال بھر بعد شفیق باپ نے جب یہ کہا ہوگا کہ تین سو جلدیں کتابوں کی ہیں دونوں بھائی بانٹ لینا شل برادر یوسف۔ محمد حسن نے بھی سننے کو ملا کہ کتابیں تو میرے کام آئیں گی یہ کیا کرے گا اور نتیجہ کہ وہ گھڑی آ پہونچی جب شفیق باپ کی تجہیز و تکفین کے مراسم بھی ادا کئے یہیں سے گداز قلب شروع ہوگا جس نے غم روزگار کو جز و حیات بنا دیا ہوگا۔ ایسے عالم میں کہتے ہیں۔

چلا اکبر آباد سے جس گھڑی — در و بام پر چشم حسرت پڑی
پس از قطع رہ لائے دلی میں بخت — بہت کھینچے یاں میں نے آزار سخت
جگر جور گردوں سے خوں ہو گیا — مجھے رکتے رکتے جنوں ہو گیا
ہوا خبط سے مجھ کو ربط تمام — لگی رہنے وحشت مجھے صبح و شام
یہ وہم غلط کاریاں تک کھنچا — کہ کار جنوں آسماں تک کھنچا
نظرات کو چاند پر گر پڑے — تو گویا کہ بجلی سی دل پر پڑے

یہ ابتدائے عشق تھی اور یہیں سے جب کبھی طبیعت ترنگ پر آتی محبوبۂ دلنواز کی یاد بے چین کرتی تو بے اختیار لوگوں سے کہتے۔

دھوم ہے پھر بہار آنے کی — کچھ کرو فکر مجھ دوانے کی

لیکن مشکل یہ تھی کہ دیوانگی کا علاج زنجیر تھی۔ بہار آئی اور زنجیر نظر آئی۔ زنجیر پہنیں گے تو زنجیر پائی کا حل ہوگا۔ کتنی حسرت ہے، کتنی التجا ہے، کتنا درد ہے۔

اب کے بہت ہے شور بہاراں ہم کو مت زنجیر کرو
دل کی ہوس ٹک ہم بھی نکالیں دھومیں ہم کو مچانے دو

لیکن گردش روزگار سب بھلا دیتی ہے وہ عشق و عاشقی کی باتیں دل سے کہاں جاتی ہیں مگر۔

ٹوپی والوں نے قتل عام کیا

علی مردان خاں کی لائی ہوئی نہر خون سے لبریز ہو گئی تین شبانہ روز قتل عام ہوتا رہا۔ مورخ نے آب خونیں سے لکھا ۱۷۳۹ اور میر نے سوچا ہم مجبوروں پہ مختاری کی تہمت ہے اور یہ کہنے پر مجبور ہوئے۔

بہت سعی کیجے تو مر رہیے میر
بس اپنا تو اتنا ہی مقدور ہے

مگر موت کہاں آتی ہے تو پھر اب عشق ہے، محبت ہے اور جس سے محبت ہے وہ ابن سینا کے لفظوں میں حسن خود اپنا حجاب ہے۔ اسے دیکھتے ہیں تو خیال آتا ہے کہ یہ چاند ہے جو نقاب میں چھپا ہوا ہے کہہ اٹھتے ہیں۔

برقع اٹھتے ہی چاند سا نکلا — داغ ہوں اس کی بے حجابی سے
گل شرم سے بہہ جائے گا گلشن میں ہو کر آب سا
برقع سے گر نکلا کہیں چہرہ ترا جتاب سا

جس دن کہ اس کے منہ سے برقع اٹھے گا سنیو
اس روز سے جہاں میں خورشید پھر نہ جھانکا

میر کے یہاں حسن حجاب میں ہے. نقاب میں ہے. ان کا محبوب پردہ نشین ہے اس کا سراپا دیکھئے ظاہر ہے کہ جب وہ نقاب میں ہے پردہ نشین ہے تو اس کے حسن کی لطافت تاب نظارہ نہیں لا سکتی اشارۃً میں بیان ہوگا یہ شعر دیکھئے۔

میر ہر اک موج میں ہے زلف ہی کا سا دماغ
جب سے وہ دریا پہ آکر بال اپنے دھو گیا

کبھی زلفوں کی ایک لٹ دکھائی دے جاتی ہے اور کبھی دست نگاریں۔

غیروں ہی کے ہاتھوں میں رہے دست نگاریں
کب ہم نے ترے ہاتھ سے آزار نہ پایا

یہ دراصل عشق کی منزلیں ہیں جہاں یہ گوارہ نہیں ہے کہ یہ بتایا جائے کہ محبوب عشق کا قدر دان نہیں ہے. عشق تو ایک دریا ہے دست نگاریں حسن کا مظہر ہے بس اس کے آگے حسن اور عشق میں کیا گزری اس کی ایک وہ کیفیت تھی جب وہ چاند میں رہتی تھی اور یا اس دنیا میں متوسط طبقے کی ایک شریف زادی ہے جو برقع میں ہے جس میں حیا و شرم ہے جس کے ساتھ عشق کی تڑپ بھی ہے حسن کا وہ انداز بھی ہے جس میں عاشق کو جھوٹی تسلی دی جاتی ہے. دو مصرعوں میں ایک پوری داستانِ عشق بیان کی ہے. کہتے ہیں.

ساعد سیمیں دونوں اس کے ہاتھ میں لاکر چھوڑ دئے
بھولے اس کے قول و قسم پر ہائے خیالِ خام کیا

غور کیجئے اس خاتون کا سراپا تیار ہو جاتا ہے. نازکی اس کے لب کی گلاب کی پنکھڑی ہے. اس کی آنکھوں میں شراب کی سی مستی ہے اس کی زلفوں میں پیچ ہیں جو موج دریا کی طرح بے چین ہیں رنگ میں چاندنی کی دمک ہے. حجاب کے پردے نقاب میں تابانی خورشید کو چھپائے ہوئے ہیں. اس کی کلائیوں میں چاندنی کی جھلک ہے. کہیں ڈیوڑھی میں یا کسی گلی میں کسی تاریک جگہ یا کسی سنسان مقام پر اچانک شاعر نے اس کی کلائیوں کو اپنی گرفت میں لے لیا کیسی آوازیں ابھری ہوں گی "ہائے اللہ چھوڑ دیجئے ہم رسوا ہو جائیں گے" قسم سے ہم لیں گے، ہم وعدہ کرتے ہیں" اور وہ کلائیاں ہاتھ سے چھوٹ گئیں. ایک بجلی چمکی اور میر عشق ہی عشق تھا جدھر دیکھا.

لیکن زمانہ اور آلام روزگار عشق کی فرصت کہاں دیتے ہیں سراج الدین علی خاں آرزو کے یہاں رہتے تھے. عشق کے بارے میں جان چکے تھے کہ یہ "عالیجناب ہوتا ہے" اور "جبریل و کتاب" ہوتا ہے اس لئے تحصیل علم کا بھی شوق تھا. عشق کی یہ نئی کیفیت تھی کہ دلی سے شاہجہاں آباد یعنی جامع مسجد پہ جاکر محمد جعفر سے درس لیتے اور یہ بھی تھا کہ گداز قلب کی جو نعمت ملی تھی اس نے یہ سکھایا تھا کہ استاد کی خدمت واجب عینی ہے جو کچھ ناشتہ ملتا تھا وہ استاد کی خدمت میں حاضر کر دیتے تھے. ظاہر ہے ایسے عالم میں ہی یہ شعر کہے جاسکتے تھے.

شام سے کچھ بجھا سا رہتا ہوں
دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

ترے فراق میں جیسے خیال مفلس کا
گئی ہے فکر پریشاں کہاں کہاں میری

اب یہ گردش روزگار تھی جو فکر پریشاں کے ساتھ میر صاحب کو تمام لئے لئے پھری. رعایت خاں کا ساتھ تھا تو مرہٹوں سے جنگ کی کبھی مہا نرائن دیوان کے یہاں رہے کبھی امیر خاں انجام کے یہاں کبھی راجہ جگل کشور کے یہاں رہے کبھی راجہ ناگرمل کے ساتھ آخر کہہ بیٹھے.

زمانے نے رکھا مجھے متصل پراگندہ روزی پراگندہ دل

یہ سب اپنی جگہ پر تھا مگر شعر کہتے رہے. خواجہ نام عندلیب کے مشورے، سید سعادت علی امروہوی کی ترغیب سخن، خان آرزو کا ساتھ، مرزا رفیع اور خواجہ میر درد سے پکی دوستی اور ایسے ہی کہہ بیٹھے

میر و مرزا رفیع و خواجہ میر
کتنے یہ اک جوان ہوتے ہیں

کہیں عبدالحی تاباں جیسا حسین و جمیل شخص، کہیں انعام اللہ خاں یقین چھوٹے موٹے ادبی معرکے. شعرا پر غصہ چڑھا تو اژدرنامہ کہہ ڈالا اور محمد امان نثار نے کہہ ہی دیا.

حیدرِ کرار نے وہ زور بخشا ہے نثار
ایک دم میں دو کروں اژدر کے کلّے چیر کے

اور مخلصانہ تنبیہہ بقّا نے بھی کی۔

پگڑی اپنی سنبھالئے گا میر اور بستی نہیں یہ دلّی ہے

لیکن خود شناسی، خود آگہی اس منزل تک لے آئی تھی جہاں دلّی میں کوئی بچتا نہیں تھا۔ خود کہتے تھے۔

شعر ہمارے عالم کے ہر چار طرف کیا دوڑے ہیں
کس وادی آبادی میں یہ حرف سخن مشہور نہیں

ملکوں ملکوں، شہروں شہروں، قریہ قصبہ، دیہہ دیار
شعر و بیت و غزل پر اپنی ہنگامہ ہے گھر گھر آج

میر اس منزل سے گذر رہے تھے جس منزل پر عرفان و آگہی کی دولت حاصل ہوتی ہے، شورشیں، ہنگامے، لٹتے ہوئے گھر، کسی کی آنکھیں نکال لی گئیں تو کسی کی آنکھوں میں سلائیاں پھیر دی گئیں، کوئی محتاج ہوا، کوئی بھیک مانگنے پر مجبور ہوا۔ احمد شاہ کو مٹی کے برتن میں بڑی عاجزی کے بعد پانی ملا۔ میر نے کہا۔

دلّی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انھیں
تھا کل تلک دماغ جنھیں تخت و تاج کا

تو ہے بے چارہ گدا میر ترا کیا جانے
مل گئے خاک میں یاں صاحبِ افسر کتنے

دلّی لٹتی رہی کہنے پر مجبور ہوئے۔

دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے
یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

لوگوں کو بھایا۔

دل وہ نگر نہیں کہ پھر آباد ہو سکے
پچھتاؤ گے سنو ہو یہ بستی اجاڑ کے

تجربات نے سیاسی شعور بخشا تھا۔ انھوں نے راجہ ناگر مل کی دلّی دربار سے صلح و صفائی بھی کرانا چاہی تھی۔ سورج مل جاٹ کا لڑکا ایک معمولی آدمی کے ہاتھوں مارا گیا۔ اس سانحۂ عظیم کو بھی میر نے دیکھا۔ حسام الدین خاں سے مل کے راجہ کی تخت دہلی سے مفاہمت بھی کرانی چاہی معاملات طے کرائے تھے مگر راجہ اپنی بات سے مکر گیا میر نے فرخ سیر کی آنکھوں میں سلائی پھرنے کو سنا۔ نادر شاہ کے ہاتھوں دلی کے سر سے جوئے خوں گذرتے ہوئے دیکھی۔ احمد شاہ کو پٹک کر اس کی آنکھیں نکال لی گئیں میر نے یہ سب دیکھا اور یہ کہہ اٹھے۔

میرے تغیّرِ حال پر مت جا اتّفاقات ہیں زمانے کے

زمانے کے ان تغیرات میں صرف مایوسی نہیں تھی اتفاقاتِ زمانہ حالات کو بہتر بھی کرسکتے تھے حالانکہ وطن اکبر آباد تھا۔ ایک بار جا کر بزرگوں کے مزار پر فاتحہ بھی پڑھ آئے تھے لیکن اب دلّی صرف ہندوستان کا دل نہ تھی یہ میر کا دل تھا یہاں رہ کے انھوں نے مطالعہ کائنات کیا تھا۔ تجربات نے محسوسات کی دولت میں اضافہ کیا تھا۔ اب ذاتی عشق اس منزل پر آ گیا تھا کہ اسکی تہذیب ہو گئی تھی اپنے کو سنبھال لیا تھا کہ۔

جو اس شور سے میر روتا رہے گا
تو ہمسایہ کا ہے کو سوتا رہے گا

میر نے دورِ حاضر کا فلسفہ نہیں پڑھا تھا NO LIBERTY WITHOUT RESTRAINT آزادی کی پابندیوں کا نام ہے مگر یہ جانتے تھے۔ شور میں زندگی ہے، نمک ہے اور یہ چاشنی ہی زندگی کا صحیح چٹخارہ ہے لیکن پاس ناموسِ عشق ضروری ہے آنسوؤں کا یہ کام نہیں کہ وہ رخساروں پر ڈھلک جائیں انھیں تو پلکوں ہی پر لرزنا ہے۔

پاس ناموسِ عشق تھا ورنہ کتنے آنسو پلک تک آئے تھے

اگر عشق ہے تو عشق کے آداب کا خیال تو رکھنا ہی پڑے گا یہ تو دیکھ چکے تھے کہ۔

آوارگانِ عشق کا پوچھا جو میں نشاں
مشتِ غبار کر کے صبا نے اڑا دیا

لیکن یہ غبار جو اڑا تو محبوب سے پھر دور ہی رہا۔ اسے

غبار آلود نہیں ہونا ہے ہاں

در ربیٹھا غبار میراں سے — عشق بن یہ ادب نہیں آتا

صرف آتا ہی نہیں ہے یہ ادب اور خاکستگی اس حد تک ہے کہ اس کی دیوار کا سایہ سر سے نہ جانے پائے لیکن اس کی گلی سے اٹھنا پڑتا ہے اس کے کوچے سے جانا پڑتا ہے کہتے ہیں۔

جاتا ہے آسماں لئے کوچے سے یار کے
آتا ہے جی بھرا در و دیوار دیکھ کر

یوں اٹھے آہ اس گلی سے ہم
جیسے کوئی جہاں سے اٹھتا ہے

یہ گلی، یہ کوچے، یہ شور، یہ دھوم میر کی محبوب ترکیبیں ہیں۔ یہ ہیں کیا؟ کیا گلی، کوچہ واقعی تنگ و تاریک راستہ ہے؟ کیوں کہا۔

ہو گا کسی دیوار کے سائے میں کہیں میر
کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو

ایسا لگتا ہے جیسے یہ کوچے دلی کی زندگی کی ہما ہمی کی علامت ہیں۔ یہ اوراق مصور ہیں جو شکل نظر آتی ہے۔ تصویر نظر آتی ہے۔ یہ دھوم، یہ بہار، یہ شور دراصل زندگی کے وہ خوبصورت مرقع ہیں جن سے انسان کو محروم کر دیا جاتا ہے۔ اس کی دیوار کا سایہ وہ نرم چھاؤں ہے جو زندگی میں مسرتیں بھر دیتی ہے اور یہ سب دولت تفسیر عشق ہے۔ عشق صرف غم ذات نہیں ہے غم حیات ہے۔ ساری رعنائی زندگی کا سارا حسن، ساری تابانی و درخشانی عشق ہی کی وجہ سے ہے عشق کے لئے ظرف چاہئے۔ عشق کی اپنی ایک تاریخ ہے۔ اس میں نل و دمن ہیں، شیریں و فرہاد ہیں، لیلیٰ و مجنوں ہیں۔ کبھی کبھی ایک حیرت انگیز استفہام سے میر دوچار ہوتے ہیں کہتے ہیں۔

مرگ مجنوں پہ عقل گم ہے میر
کیا دوانے نے موت پائی ہے

میر نہیں سمجھتے کہ دوانہ موت پا سکتا ہے۔ کبھی پوچھتے ہیں کہ کیا موت پائی ہے۔ کبھی خیال آتا ہے کیا موت ملی ہے یہ تہہ داری انھیں پھر مقام عشق پر لے آتی ہے۔ اس دیار میں عشق اس منزل پر ہے کہ جہاں ہر مصیبت شکر کا سجدہ کرتی نظر آتی ہے۔ میر کہتے ہیں۔

عشق یہ ہے کہ جو تھے خلوتی منزل قدس
وہ بھی رسوائے سر کوچہ و بازار ہوئے

یہاں جمع کا صیغہ ہے اس لئے کہ یوسف نہیں ہیں اور وہ بھی بازار میں رسوا ہوئے کوچہ میں نہیں یہ تو کسی ایسے کاروان عشق کا تذکرہ ہے جسے دیار بہ دیار کوچہ بہ کوچہ شہر و بازار میں رسوا کیا گیا اور میر کارواں وہ عاشق رب تھا جس کی صدائے زنجیر سے صدائے تکبیر بلند ہوتی تھی۔

میر کے یہاں عاشق زندہ رہتا ہے مرتا نہیں اسے ہر لمحہ صرف ایک خیال رہتا ہے کہ اس کے لئے خالق نے کہا وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَن يَشَاءَ اللَّهُ۔

واس سے سر حرف تو ہو، گو کہ یہ سر جائے۔ ہم حلق بریدہ سے ہی تقریر کریں گے۔

میر نے عشق کو ہر جہت سے دیکھا۔ ہر منزل میں دیکھا۔ اگر حلق بریدہ سے سورۂ کہف کی تلاوت کا قصہ سنا اور حلق بریدہ کی تقریر کا عرفان حاصل کیا تو یہ بعد کی منزل تھی۔ ابتدائی منزل میں بھی عشق کو یہ گوارہ نہ تھا کہ تسلیم محبت کی منزل میں سر کو ہلائے۔ اسی لئے۔

زیر شمشیر ستم میر تڑپنا کیسا
سر بھی تسلیم محبت میں ہلایا نہ گیا

میر نے عشق کی داستانیں پڑھیں اور سنیں۔ میر ہی کے ہم عمر وارث شاہ تھے جو ۱۷۲۲ء میں پیدا ہوئے تھے جن کا لافانی عوامی نغمہ "ہیر رانجھا" سرزمین پنجاب کو ترنم ریز بنا دیتا ہے اور عشق کی ایک کرن ہے جو دریا کی لہروں میں دکھائی دیتی ہے یہاں موقع نہیں صرف اشارہ کیا جاتا ہے کہ میر کی مثنوی دریائے عشق پڑھئے۔ اس کا ماخذ کہیں اور مت تلاش کیجئے وارث شاہ کی ہیر رانجھا پڑھ لیجئے۔ آس اور امید کی کچے گھڑے کی طرح بہہ جاتی ہے۔ سرسری طور پر ہی سہی یہ ذکر ناگزیر ہے کہ میر کی شعلۂ شوق پڑھتے ہوئے میتھی رضوی شہدی کی چندر بدن مہیار کی بے اختیار یاد آتی ہے دونوں کی لاشیں زیر خاک بھی ایک دوسرے سے وابستہ رہیں اور شعلۂ شوق میں پرس رام اور اس کی محبوبہ دونوں رقصاں

شعلہ کی طرح موجوں کے پیچ و تاب میں نظر آتے ہیں۔

اگر غور کیجئے تو میر اس عشق کے ذریعہ حقیقی انسان کی شناخت کرتے ہیں اور خود اپنی ذات کے اوپر پڑے ہوئے حجابات کی تہیں کھولتے جاتے ہیں۔ عشق نے رفعت بخشی تھی

"تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں"

یہیں پہنچ کے یہ کہنا پڑتا ہے کہ نظیر اکبرآبادی بھی میر کے معاصر ہیں ان کے یہاں آدمی ملیں گے انسان نہیں ملے گا۔ میر کے یہاں انسان ہے ایسے انسان جن کو وہ آدم کہتے ہیں۔ میر کی اخلاقیات دیکھئے۔

ملئے اس شخص سے جو آدم ہووے
ناز اس کو کمال پر بہت کم ہووے
ہو گرم سخن تو گرد آوے اک خلق
خاموش رہے تو ایک عالم ہووے

غالب آدمی کو انسان بنانا چاہتے ہیں میر انسان ہی کی بات کرتے ہیں۔ وہ الگ تھلگ نہیں رہتے۔ وہ یہ جانتے ہیں کہ ان کے اشعار خواص پسند ہیں لیکن انھیں گفتگو ہمیشہ عوام ہی سے رہی! انھوں نے اپنی شخصیت کو کنول کا پھول بنایا دیکھئے۔

کیسا کٹورا ایسا سطح آب پر تیرتا رہتا ہے مگر کیا مجال پانی کی بوندوں کی کہ پنکھڑیوں کو بوسہ دے سکیں۔

میر نے عشق میں سلیقہ سکھایا۔ انھوں نے کہا کہ۔

شرط سلیقہ ہے ہر اک امر میں عیب بھی کرنے کو ہنر چاہئے

یہ سلیقہ انھیں بہت عزیز ہے اسی سلیقہ نے انھیں ناکامیوں سے کام لینے کا ہنر عطا کیا خود انھوں نے کہا۔

مرے سلیقے سے میری نبھی محبت میں
تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

عشق میں ناکامیوں سے کام تو لیا مگر اس حقیقت سے بھی آگاہ تھے کہ عشق کرنے کے لئے زور و زر کی ضرورت ہوتی ہے۔ خود کلامی کی۔

زور و زر کچھ نہ تھا تو بارے میر
کس بھروسے پہ آشنائی کی

اور یہ ناکامیاں جب بہت بڑھ گئیں تمنائے دل نے مجبور کر دیا تو بے اختیار کہا۔

تمنائے دل کے لئے جان دی سلیقہ ہمارا تو مشہور ہے

آلام روزگار نے سلیقہ سے زندگی بسر کرنے نہ دی دلی کو اجڑتے دیکھا ان گلیوں کو برباد ہوتے دیکھا جن کے بارے میں کبھی کہا تھا۔

ہفت اقلیم ہر گلی ہے کہیں دلی سے بھی اک دیار ہوتے ہیں

یہی دلی جس کی گلیوں کی یاد اور جس کے کوچے جزو حیات بن گئے تھے۔ وہ جس کو اوراق مصور کہا تھا وہ اب خرابہ ہوا جہاں آباد! سودا دلی چھوڑ چکے تھے۔ درد کی خانقاہ میں سناٹا تھا۔ یقین اور عبدالحیٔ تاباں کو موت نے گلے لگا لیا تھا۔ کیا دل تھا۔ مؤتمن الدولہ اسحاق خاں کے لڑکے سالار جنگ نے آصف الدولہ سے سفارش کی۔ انھوں نے زادراہ بھیج دیا۔ میر صاحب لکھنؤ چل پڑے آصف الدولہ فیض آباد سے لکھنؤ آ گئے تھے۔ خوشحالی تھی۔ فراغت تھی۔ امن و امان تھا۔ زندگی پرسکون گزرنے لگی۔ آصف الدولہ مزاج شناس تھے اپنے ساتھ رکھتے تھے تو مرغ بازی کے مقابلے بھی دیکھے تھے ان کی ہولی پر بھی نظمیں کہتے تھے جب وہ ہولی کھیلتے تھے اس ہولی میں جو ہندستانیت تھی جو محبت تھی اور وطن سے عشق کا جو تصوّر تھا وہ بھی میر کو اچھا لگتا تھا لیکن۔

موت سے کس کو رستگاری ہے

آصف الدولہ اس دنیا سے گئے سعادت علی خاں کا دور شروع ہوا۔ میر کو فقر ہمیشہ ایک دولت معلوم ہوتا تھا اس لئے اپنے فقر و خودداری کی دولت کو سمیٹے چوک میں تحسین کی مسجد میں بیٹھے رہا کرتے تھے نواب کی سواری بھی گذرتی تو یہ سلام کو نہ اٹھتے۔ سید انشا نے جب نواب سے کہا تو انھوں نے روپئے بھجوائے مگر چوبدار لے کر آیا نازک مزاجی اس کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ ہوگا وہ نواب ہم ملک سخن کے شہنشاہ ہیں اسے زوال ہے ہم لازوال ہیں۔ سید انشا نے سمجھایا۔ عاجزی کی۔ سیدزادے کا احترام بھی مدنظر تھا دن پھر سکون سے گزرنے لگے۔ لیکن اب یہ احساس ہو چلا تھا کہ

خرابہ دلی کا وہ چند بہتر لکھنؤ سے تھا
وہیں میں کاش مر جاتا سراسیمہ نہ آتا یاں

دلی کی یاد دل کو بے چین کر دیتی تھی وہ عشق کے حسین لمحات یاد آتے تھے۔

وہ دن کیسے سالتے[3] ہیں جو آکر سوتے پاتے کبھو
آنکھوں سے ہم سہلا سہلا تلوے ان کو جگاتے تھے

یہاں آکے اب عرفانِ عشق شروع ہوا چاند میں چاند جیسی صورت کی یاد نے سمجھایا کہ عشق تو سارے عالم میں ہے کسی ایک سے عشق کیا ہے تو پھر وہ احد ہے یا پھر اس کے مظاہر ہیں اور ہر دیار میں عشق کی کہانیاں ہیں تو ان کہانیوں کو بھی نظم کیا جانا چاہئے لیکن تنہائی کا احساس بے چین کئے رہتا تھا۔ لوگ دیوانۂ عشق سمجھ کر

علاج کرتے ہیں سودائے عشق کا میرے
خلل پذیر ہوا ہے دماغ یاروں کا

یہ نہیں جانتے کہ "مرض عشق کا علاج نہیں"۔
اور پھر اسی کے ساتھ ایک گھٹن کا احساس ہے۔

رہی نہ گفتہ مرے دل میں داستاں میری
نہ اس دیار میں سمجھا کوئی زباں میری

اور جب یہ احساس ہو جائے تو پھر یہ کہنا ہی پڑتا ہے۔

متاعِ ہنر پھیر کر لے چلو ۔۔۔ بہت لکھنؤ میں رہے گھر چلو

لیکن یہ گھر اب دلی نہیں تھا۔ ۱۲۲۵ھ م ۱۸۱۰ء شروع ہو چکا تھا ابھی تین سال پہلے تک بہرحال زندگی کا بوجھ سنبھالے تھے مگر پہلے لڑکی کو موت نے اپنے کاندھے پر بٹھایا۔ پھر بیٹا گیا اور پھر رفیقۂ حیات نے ساتھ چھوڑ دیا۔ عشق نے یہ دولت عطا کر دی تھی کہ جسے لوگ موت کہتے ہیں وہ ایک طویل سفر کی منزلِ اولیں ہے۔ آدمی تھک جائے تو تھوڑی دیر کے لئے رک جاتا ہے ورنہ سفر جاری رہتا ہے۔

مرگ اک ماندگی کا وقفہ ہے ۔۔۔ یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

خود شناسی کی منزل طے کر چکے تھے ایک بار پھر دنیا سے کہا۔

مفت یوں ہاتھ سے نہ کھو ہم کو ۔۔۔ کہیں پیدا بھی ہوتے ہیں ہم سے

شعبان المعظم کی پندرہ تاریخ گذر چکی تھی۔ اب عشق موت کی مستی میں بدل رہا تھا۔ سوزِ حیات ختم ہو چکا تھا۔ سازِ حیات کے تار ایک جھنکار سے ٹوٹ گئے تھے۔ ۲۰ر شعبان المعظم کو اپنا ہی ایک پرانا شعر یاد آ گیا تھا گنگنا کر آنکھیں بند کر لیں۔

گلے لگ کے میناسے ٹک روئیے
فسانہ بھی آخر ہے اب سوئیے

حواشی

۱۔ میر نے خود سید امان اللہ کی وفات کے وقت اپنی عمر سات سال اور اپنے والد کے انتقال کے وقت دس گیارہ سال لکھی ہے لیکن ان کے سوانحی حالات پڑھتے ہوئے قرائن یہ کہتے ہیں کہ والد کے انتقال کے وقت کم از کم پندرہ سولہ برس کے تھے۔

۲۔ میر نے اس واقعہ کو سانحۂ عظیم لکھا ہے۔

۳۔ یاد آتے ہیں۔

میر کا عکسِ تحریر

شارب ردولوی

سی ۹۵، سیکٹر ای علی گنج لکھنؤ ۲۲۶۰۲۴

تفہیم میر کے مسائل

تفہیم میر کی ابتدا کا سلسلہ اگر تذکروں سے جوڑا جائے تو تقریباً دو سو سال کا عرصہ گذر چکا ہے۔ اس طویل عرصہ میں مختلف انداز نظر سے میر (۱۸۱۰ - ۱۷۲۲ء) کو سمجھنے کی کوشش کی گئی۔ قدیم تنقیدی رویے چونکہ زبان و بیان اور فنی اظہار تک محدود رہے اس لئے ایسی تحریروں میں زیادہ تر میر کی سادہ بیانی پر زور دیا گیا۔ میر کے قابل ذکر ناقدین میں اثر لکھنوی، فراق گورکھپوری، آل احمد سرور، سید محمد عبداللہ، حسن عسکری، یوسف حسین خاں، خواجہ احمد فاروقی، سب ان کی سادہ گوئی کے مداح ہیں۔ میر کے جدید ناقدین میں سردار جعفری، جمیل جالبی، شمس الرحمٰن فاروقی، نثار احمد فاروقی، قاضی افضال حسین، حامدی کاشمیری وغیرہ نے تفہیم میر کے سلسلہ میں اپنے اپنے نظریات کے مطابق نئے گوشے تلاش کئے ہیں۔ اس طرح تفہیم میر نے خود ایک دبستان کی شکل اختیار کر لی ہے۔

جدید تنقید میں تفہیم Understanding یا تفہیمیت Hermeneutics مطالعۂ ادب کا ایک وسیع موضوع ہے جس کے تحت لفظ و معنی سے بحث کی گئی۔ یہ بحث یوں تو بہت قدیم ہے سنسکرت کے قدیم عالم منٹ نے اپنی تصنیف "کاویہ پرکاش" میں شبد (لفظ) سے بحث کرتے ہوئے لکھا کہ "شبد ادھقو کاویتم" یعنی با معنی لفظ شاعری ہے۔ یہاں پر با معنی مہمل کی ضد کے طور پر نہیں ہے بلکہ وہ اپنشدوں میں شبد کی تعریف و تشریح کی توضیح ہے جس میں کہا گیا ہے کہ شبد برہما یعنی خالق ہے۔ ظاہر کہ یہاں پر خالق لفظ کے کثیر المعانی ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ اسی لئے ممٹ نے اسے کاویہ سے تعبیر کیا۔ سنسکرت شعریات پر سند کی حیثیت رکھنے والے عالم آنند وردھن کا دھونی کا نظریہ شعر کی تہہ داری اور معنویت کو الفاظ کے وسیع تناظر میں دیکھتا ہے۔ حالانکہ اردو شعرا نے بھی لفظ کی اس تہہ داری اور معنویت کے بارے میں اپنے اشعار میں اشارے کئے ہیں اس لئے ایسا نہیں ہے کہ اردو شعرا اپنے الفاظ کی تہہ داری سے واقف نہیں تھے۔ غالب کا ایک شعر ہے۔

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے
جو لفظ کہ غالبؔ مرے اشعار میں آئے

اور میر نے یہی بات بڑی سادگی سے بیان کر دی

طرفیں رکھے ہے ایک سخن چار چار میرؔ
کیا کیا کہا کرے ہیں زبانِ سخن سے ہم

غالب نے گنجینۂ معنی کو طلسم سے تعبیر کر کے اس کو شمار اور تصور دونوں کی حدوں سے آگے بڑھا دیا۔ حالانکہ طلسم میں یقینی اور غیر یقینی بھی طرح کی چیزیں آجاتی ہیں جبکہ میر نے بالکل سامنے کے الفاظ یا روز مرہ سے وہ کام لے لیا جو معنوی وسعت کے اظہار میں اس سے کم نہیں ہے۔

میر نے نکات الشعراء کے آخر میں اپنے عہد کے انداز شعر کا ذکر کرتے ہوئے اپنی طرز کو دوسروں سے الگ بتایا ہے۔ حالانکہ آخر میں یہ کہہ کر کہ، ہر پھول کا رنگ اور خوشبو الگ ہے، ایک طرح سے دوسروں کی اہمیت کا اعتراف بھی کر لیا ہے۔ نکات الشعراء کے دو آخری صفحات ادبی تنقید اور شعر فہمی کی طرف اردو تنقید کا پہلا قدم ہیں۔ میر نے ریختہ کی قسمیں بیان کرتے ہوئے طرز شعر کی آٹھ صورتیں بیان کی ہیں جس میں اپنے طرز کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"... چھٹا طرہ وہ ہے جو کہ ہم نے اختیار کر رکھا ہے اور وہ تمام صنعتوں پر حاوی ہے۔ تجنیس، ترصیع، تشبیہ، صفائی

گفتگو، فصاحت، بلاغت، ادابندی اور خیال وغیرہ یہ سب اسی ضمن میں آتے ہیں اور نفیس بھی اسی طرز سے خوش ہوتا ہے ہر وہ شخص جو اس فن میں کسی خاص طرز کا مالک ہے ان باتوں کو سمجھتا ہے۔ مجھے عام لوگوں سے کوئی غرض نہیں ہے اور جو کچھ میں نے لکھا ہے وہ صرف میرے احباب کے لئے سند ہے اس کا ہر ایک سے تعلق نہیں ہے چونکہ سخن کا میدان نہایت وسیع ہے اور اس دنیا کے تلون طبع سے آگاہ ہوں اس لئے کہ

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است[1]

میرؔ کا یہ بیان ان کے آداب شعر فہمی اور تنقیدی بصیرت کی نمائندگی کرتا ہے۔ جدید تنقید میں تفہیم معنی و مطالب کے سمجھنے کا عمل ہے چونکہ زبان ہر عہد میں تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ قدیم الفاظ و محاورے، قدیم علامتیں اور استعارے متروک ہو جاتے ہیں اور نئے الفاظ اور نئی علامتیں ان کی جگہ لیتی جاتی ہیں یا زمانے اور صورت حال کی تبدیلی کے ساتھ قدیم تراکیب اور استعاروں کے معنی بدل جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں کلاسیکی متون کی تفہیم کے لئے زبان کو اس کے مختلف زاویوں سے سمجھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ تفہیمیت کے بنیاد گزار جرمن اسکالر فریڈرک شلائرماخ (Friedrich Schleir Macher) نے ۱۸۱۹ کے اپنے ایک لیکچر میں اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

"کسی بھی متن کی تفہیم کے لئے اس کے پورے تناظر کو نظر میں رکھنا ضروری ہے مثلاً متن کا..... اپنے عہد کے متون سے یا اپنے عہد کی زبان سے یا اس زمانے کی تاریخ سے کیا رشتہ ہے۔"[2]

شلائرماخ زبان اور تہذیب ہر زاویے سے معنی آفرینی پر زور دیتا ہے۔ تشریح اس کی نگاہ میں تفہیم شعر کا محدود ذریعہ ہے وہ لفظ و معنی کی وسعتوں کا پوری طرح احاطہ نہیں کر پاتی۔ اس کے مقابلے میں تفہیمیت تمام باتوں کا احاطہ کر لیتی ہے۔

تفہیم میرؔ میں راہ کا سب سے بڑا پتھر میرؔ کی زبان ہے جو بظاہر آسان روزمرہ کے مطابق، سلیس اور فصیح ہے لیکن ان کی زبان کی نوعیت غالب کے ایک شعر سے زیادہ بہتر طور پر بیان کی جا سکتی ہے۔

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکہ یہ بازی گر کھلا

میرؔ جن کے بارے میں مشہور ہے کہ لکھنؤ کے سفر میں اپنے ہم سفر کی بات کرنے کی خواہش کو یہ کہہ کر رد کر دیا تھا کہ آپ کا وقت کٹتا ہے۔ میری زبان خراب ہوتی ہے لیکن وہی میرؔ بے جھجک اپنی شاعری میں برج، پراکرت، دکنی اور نہ جانے کہاں کہاں کے غیر مستعمل الفاظ نظم کرتے چلے جاتے ہیں اور اس عہد کے کلاسیکی مزاج اور نفاست پسند شعری ذوق رکھنے والے قاری اور سامع کی ذرا بھی پرواہ نہیں کرتے۔ میرؔ کے ایک بہت اہم طلبا اور محقق مولوی عبدالحق نے انتخاب کلام میرؔ کے مقدمے میں میرؔ کے کلام سے بحث کرتے ہوئے ان کے یہاں سادگی اور واردات قلبی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ۔

"ان کا کلام دور از کار استعارات بعید از قیاس مبالغے اور خلاف عادت امور سے پاک ہے۔ بھونڈے اور بے جا تکلف و تصنع اور فضول لفاظی کا کام نہیں۔ وہ قلبی واردات و کیفیات کو نہایت سادہ، شستہ اور صاف زبان میں ایسے دلکش اسلوب سے بیان کرتے ہیں کہ جو بات وہ کہنی چاہتے ہیں وہ دل میں اتر جاتی ہے۔ غرض یہ کہ ان کا کلام بہ لحاظ فصاحت و روانی سہل ممتنع ہے اور سہل ممتنع کلام کا تجزیہ کرکے الگ الگ اسکی خوبی گنوانا ناممکن ہے کیونکہ اس سے کلام کی خوبی کا اندازہ تو ہوتا نہیں البتہ اسکی نسبت غلط فہمی پیدا کر دینے کا اندیشہ ضرور ہوتا ہے"[3]

مولوی عبدالحق نے تفہیم میرؔ کی بنیاد واردات قلبی، سادہ و شستہ زبان، دلکش اسلوب، فصاحت اور سہل ممتنع پر رکھی اور اس کے بعد آنے والے لوگوں نے اسی راہ کو پکڑ لیا لہٰذا میرؔ پر لکھنے والے بیشتر لوگوں کے یہاں انھیں خصوصیات کی تکرار نظر آتی ہے ناقدین میرؔ

میں آثر لکھنوی ایک ایسے ناقد ہیں جنھوں نے مطالعۂ میر کے اس طریقۂ کار پر اعتراض کیا۔ مزامیر کے مقدمہ میں انھوں نے بہت صاف الفاظ میں لکھا ہے کہ:

"میر کا کلام انمول جواہر کا ایسا نگینہ ہے جس سے ہر اہل نظر بقدر ذوق فیض اور لذت اٹھا سکتا ہے۔ سوال صلاحیت کا ہے۔ عام طور پر لوگ میر کے غائر مطالعہ کی زحمت کم گوارہ کرتے ہیں اور محض ان اشعار کی بنا پر جو زبان زد ہیں رائے قائم کر لیتے ہیں کہ اس کے یہاں سادگی وسلاست درد و خستگی ہے اور بس....." بلکہ

آثر لکھنوی نے تفہیم میر کو صرف سادگی وسلاست یا درد و خستگی تک محدود نہیں رکھا بلکہ کلام میر کو زیادہ گہرائی اور گیرائی سے سمجھنے کی کوشش کی۔ یہاں پر یہ بات نظر میں رکھنی ضروری ہے کہ ہر عہد کے تفہیم شعروادب کے مطالبات مختلف ہوتے ہیں۔ حالات کی تبدیلی کے ساتھ نظریات بھی بدل جاتے ہیں جس کا کسی فن پارے کی اثر پذیری کی نوعیت پر بھی اثر پڑتا ہے یہ بات صرف میر ہی تک نہیں بلکہ تمام شعراء کے کلام پر عائد ہوتی ہے۔ خاص طور پر قدیم زبان اور کلاسیکی ادب پر اس لئے کہ ان کی زبان آج کے محاورہ سے بہت مختلف ہو چکی ہے۔ گذشتہ نصف صدی کی تبدیلیوں پر اگر نظر ڈالیں تو ترقی پسند تحریک کے اثرات کے تحت سماجی اثرات اور کسی عہد کی سماجی وسیاسی تبدیلیوں، طبقاتی کشمکش اور اس سے مرتب ہونے والے اثرات پر زیادہ زور دیا گیا۔ اس طرح جدیدیت کے رجحان کے تحت اسی متن کی تفہیم بالکل دوسرے انداز میں کی گئی ہے جس میں صرف متن کے ذریعہ شاعر اور اس کے کلام کو سمجھنے کی کوشش کی گئی اور زمانے اور ماحول، سماجی یا تمام خارجی اثرات کو غیر ضروری قرار دیا گیا لیکن اگر تفہیمات کے اصولوں کے تحت دیکھیں تو مطالعہ کی یہ تمام نوعیتیں تفہیم شعر میں معاون ہوتی ہیں۔ یعنی تفہیمات کسی ایک پہلو پر زور دینے کی بجائے کسی نتیجہ پر پہونچنے کے لئے تمام پہلوؤں سے استفادہ کرتی ہے تشریح اور تفہیم میں یہی ایک فرق ہے کہ تشریح کے معنی تک محدود ہو سکتی ہے لیکن تفہیم کے لئے اگر ایک طرف بدیع وبیان پر نظر رکھنا ضروری ہے تو دوسری طرف زبان اور تاریخی وتہذیبی عوامل کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاتا۔

میر کے زمانے کو آج ۲۰۰ سال سے زائد ہو گئے۔ اس طویل عرصہ میں زبان اور اظہار کے طریقے بھی وہ نہیں رہے اس کے علاوہ ہر بڑے شاعر کا اپنا ایک Diction یعنی زبان کے استعمال کا منفرد انداز ہوتا ہے اور یہی انداز ایک عہد کے دو شاعروں یا مختلف ادوار کے شاعروں کی شناخت کا ذریعہ ہوتا ہے۔ میر اور سودا کا عہد ایک ہے۔ دونوں شعراء نے غزل مثنوی، مرثیے اور دوسری اصناف میں طبع آزمائی کی لیکن دونوں کی زبان اور الفاظ کے استعمال میں نمایاں فرق ہے۔ یہی صورت میر اور غالب کے درمیان ہے غالب نے بھی انھیں اصناف میں طبع آزمائی کی لیکن غالب کے چند اشعار بھی اگر میر کے دیوان میں ملا دئے جائیں تو ایک بہتر قاری فوراً ان کی نشاندہی کر سکتا ہے۔ دراصل جب میر کو روزمرہ یا عام زبان کا شاعر قرار دیا جاتا ہے تو ایسا کہنے والے یا تو ان کی زبان کے دھوکے میں آجاتے ہیں یا میر کی زبان کی تہہ داری تک ان کی نگاہ نہیں پہونچتی میر اپنی تمام سادگی اور سادہ گوئی کے باوجود بہت Deep rooted گہری معنویت والے شاعر ہیں ان کے الفاظ پانی کی سطح پر دکھائی دینے والے جل کھمبی کے خوبصورت سبز پتوں کی طرح ہیں جس کی جڑیں کئی گز تک پانی کے اندر پھیلی ہوتی ہیں جن کی جھلک بھی اوپر دکھائی نہیں دیتی اور وہ نہ جانے کہاں کہاں سے توانائی حاصل کرتی رہتی ہیں۔ یہی صورت میر کے ذخیرۂ الفاظ کی ہے۔ وہ کب کہاں سے کوئی لفظ لے آئیں اور اس کی جڑیں کہاں تک پھیلی ہوئی ہوں اس کے اندازے کے لئے علم کے ساتھ نظر کی بھی ضرورت ہے۔ میر نے زبان کے سلسلہ میں جس جرأت سے کام لیا ہے وہ نظیر اکبرآبادی (۱۷۳۵ء۔ ۱۸۳۰ء) کے علاوہ کسی دوسرے شاعر کے یہاں نظر نہیں آتی حالانکہ نظیر کے یہاں زبان کا وہ استعمال عمومی ہے جبکہ میر بہت سوچے سمجھے طریقہ سے کسی لفظ کا استعمال کرتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ میر

اپنی سادگی کے باوجود آسانی سے قاری پر پوری طرح نہیں کھلتے ان کے استعمال زبان رعایت لفظی اور استعارے پر اگر صحیح گرفت نہیں ہے تو صرف چوتھائی میر کو ہی سمجھا جا سکے گا۔

ہمارے عہد کے مشہور ناقد اور غالب و میر کے شارح اور مفسر شمس الرحمٰن فاروقی نے بہت تفصیل اور گہرائی سے میر کے کلام کا مطالعہ کیا ہے۔ ان کی کتاب "شعر شور انگیز" تفہیم میر کے سلسلہ میں لکھی جانے والی کتابوں میں جدید ترین اور سب سے مفصل کتاب ہے اور تفہیم میر کے سلسلہ میں اس لئے اہم ہے کہ انھوں نے میر کے اشعار کی تشریح کرنے میں قریب و بعید تمام مطالب کا احاطہ کر لیا ہے حالانکہ بعض جگہ انھوں نے غیر ضروری طور پر معنی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ میر کا ایک شعر ہے:

باد کے گھوڑے پہ تھے اس باغ کے ساکن سوار
اب کہاں فرہاد و شیریں خسرو گلگوں کہاں ؎

اس شعر کی تشریح و تفسیر میں شمس الرحمٰن فاروقی باد کے گھوڑے، ساکن اور خسرو گلگوں کی تفسیر میں اس طرح الجھے کہ شعر میں باغ کا بنیادی استعارہ نظر انداز ہو گیا۔ ان کا زیادہ زور باد کے گھوڑے کے محاورہ کو استعارہ کے طور پر استعمال کرنے پر رہا۔ اس کے علاوہ دوسرے مصرعہ میں ان کی توجہ کا مرکز اب کہاں فرہاد و شیریں؟ یعنی فرہاد و شیریں جہاں بھی ہیں ایک ساتھ ہیں اور خسرو گلگوں کے مفہوم کی وضاحت کی طرف رہا جبکہ شعر کا رخ وہاں تک مشکل سے پہونچتا ہے۔ میر کا شعر بہت واضح ہے یوں تو تشریح و تفسیر کسی ایک کا حصہ نہیں ہے اچھے اشعار میں مفاہیم پیدا کرنے کی اتنی گنجائش ہوتی ہے کہ آپ جو چاہیں معنی نکال لیں۔ اسی لئے تفسیر میں غیر ضروری یا بے تکان کھینچ تان کے لئے اقبال نے کہا تھا۔

تفسیر میں قرآں کو بنا سکتے ہیں پاژند

میرا مقصد شمس الرحمٰن فاروقی کی تفسیر پر اعتراض نہیں بلکہ صرف اسکی نشاندہی کرنا چاہتا تھا کہ شعر کی تفسیر و تعبیر کو اگر اس کے مفہوم کے قریب تر رکھا جائے تو زیادہ لطف آتا ہے

اسی شعر کو دیکھئے پہلے مصرع میں چار توجہ طلب الفاظ کا میر نے استعمال کیا ہے

باد :۔ جس کے معنی ہوا کے ہیں (تیز و تند ہوا کے وہ جھونکے جو زمین پر دائرہ میں گردش کرتے ہوئے چلتے ہیں)

گھوڑا:۔ سواری۔ سفر کا ایک ذریعہ

باغ :۔ درختوں کا وہ جھنڈ جہاں سفر کے دوران مسافر تھوڑی دیر ٹھہر کر آرام کرتے ہیں اور پھر سفر پر روانہ ہو جاتے ہیں۔ یہاں پر استعارہ ہے یعنی دنیا آج کی اصطلاح میں Transit Camp

ساکن:۔ رہنے والے یا کسی جگہ ٹھہرنے یا رکنے والے

سوار:۔ وہ لوگ جو اس باغ (دنیا) میں عارضی طور پر ٹھہر جاتے ہیں میر کی نگاہ میں یہ دنیا ایک Transit Camp ہے جہاں "باد کے گھوڑے" پر سوار طوفان کی طرح لوگ آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔

تم جو اس (عارضی قیام کے) باغ (دنیا) میں فرہاد و شیریں اور خسرو (بادشاہ جو اپنے پورے طمطراق اور خوش رنگ لباس میں) کو جو کبھی یہاں مقیم تھے انھیں اب تلاش کرتے ہو تو وہ کہاں ہیں؟ وہ تو باد کے گھوڑے پر سوار اس باغ میں آئے ٹھہرے اور باد کے اسی گھوڑے پر کہیں غائب ہو گئے۔

دنیا کی ناپائداری اور زندگی کے چند روزہ ہونے کے مضمون کو اکثر شعرا نے نظم کیا ہے۔ غالب نے بھی زندگی کی تیز رفتاری کے لئے گھوڑے (رخش) کا استعمال کیا ہے۔

رو میں ہے رخش عمر دیکھئے کہاں تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

غالب نے اس شعر میں فلسفۂ جبر و اختیار کو اپنا موضوع بنایا ہے جو ان کا محبوب موضوع بھی ہے لیکن بین السطور میں زندگی کی ناپائداری کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے میر کے شعر کا لطف کچھ اور ہے۔ باد کے گھوڑے، باغ کے استعارے، اور ساکن کی

رعایت نے اس میں تہہ داری اور گہری معنویت پیدا کر دی ہے دوسری بات شعر میں خود باؤ کے لفظ کا استعمال ہے۔ ایک ایسا غیر مانوس لفظ جو دوسرا شاعر مشکل ہی سے استعمال کرے گا۔

میرؔ کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اسی لفظ پر شعر کے حسن اور تہہ داری کی بنیاد رکھی ہے اگر اس لفظ کو نکال دیا جائے اور اس کی جگہ پر کوئی مانوس اور فصیح لفظ رکھ دیا جائے تو شعر میں وہ لطف باقی نہیں رہتا۔

میرؔ کو اجنبی اور غیر مانوس الفاظ کے استعمال کرنے کا شوق ہے یا یہ کہئے کہ وہ ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں جس سے اس کیفیت کی تصویر کشی ہو سکے جسے وہ بیان کرنا چاہتے ہیں وہ لفظ خواہ کیسا ہی کیوں نہ ہو ان کا اسی طرح کا ایک شعر دیکھئے۔

سنّاہٹے میں جان کے ہوش و حواس و دم نہ تھا
اسباب سارا لے گیا آیا تھا اک سیلاب سا

سنّاہٹے، خوف کے عالم میں سیلاب کی آواز یا تیز ہواؤں کی سنسناہٹ یا خود اپنے جسم میں خوف سے سنسناہٹ کا پیدا ہونا میرؔ اسی احساس میں ہوش و حواس و دم نہ تھا کہہ کر خوف و دہشت میں اور اضافہ کر دیتے ہیں۔ دم کے ایک معنی تو جان کے ہیں کہ ایسا سیلاب تھا کہ خوف سے دم ہی نکل گیا لیکن دم کے دوسرے معنی خون کے ہیں کہ خوف سے خون خشک ہو گیا۔ سیلاب یہاں صرف، سیل آب، نہیں بلکہ استعارہ ہے۔ کسی طرح کی آفت و دہشت کا۔ اب میرؔ کے عہد پر ایک نگاہ ڈالئے کہ ہر وقت جان و مال کے زیاں کا خوف ہے میرؔ شاہی افواج کے ساتھ رہے ہیں خود دلی کی بربادی دیکھی ہے اور فوجوں کے ذریعہ شہروں اور بستیوں کا اجڑنا دیکھا ہے کہ جدھر سے فوجیں نکلیں وہاں انھوں نے مال و اسباب کچھ نہ چھوڑا۔ میرؔ نے سنّاہٹے کے لفظ کو استعمال کر کے اس کے صوتی اثر سے بھی خوف کا احساس پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

میرؔ کے یہاں اس طرح کے الفاظ کی کمی نہیں۔ کلیات میرؔ میں ایسے اشعار کی کوئی دشواری نہیں ہوگی۔ میرؔ کی صفت یہ ہے کہ وہ ایسے الفاظ کا استعمال اپنی انفرادیت دکھانے کے لئے نہیں کرتے بلکہ وہ صرف ایسی جگہ انھیں استعمال کرتے ہیں جہاں ان سے کیفیت و معنی میں اضافہ ہو سکے مثلاً چند اشعار دیکھئے۔

پست و بلندیاں ہیں ارض و سما سے ظاہر
دیکھا جہاں کو ہم نے کتنی کڈھب جگہ ہے

کڈھب کو بڑی آسانی سے وہ کسی مانوس ہم معنی لفظ سے تبدیل کر سکتے تھے لیکن کڈھب کہہ کر انھوں نے صوتی اور معنوی دونوں اعتبار سے دشوار، مشکل اور ناہموار کے لئے ذہنوں میں جو تصویر بنائی وہ کسی دوسرے لفظ سے نہیں بن سکتی تھی۔ اسی دنیا کے لئے انھوں نے ایک دوسرے میں عجب جگہ کا لفظ استعمال کیا ہے وہاں انھوں نے کڈھب نہیں لکھا اس لئے کہ وہ ایک دوسری صورت دکھانا چاہتے تھے۔

قصر و مکان و منزل ایکوں کو سب جگہ ہے
ایکوں کو جا نہیں ہے دنیا عجب جگہ ہے

یہ میرؔ کی ایک ادا ہے وہ صحیح معنوں میں زبان کو اظہار کا وسیلہ بناتے ہیں۔ وہ صرف یہ دیکھتے ہیں کہ جس کیفیت کو وہ بیان کرنا چاہتے ہیں وہ اپنی اس شکل میں جو ان کے ذہن میں ہے کس لفظ سے ادا ہوتی ہے پھر انھیں اس سے غرض نہیں رہتی کہ وہ لفظ فصیح ہے یا غیر فصیح۔ پراکرت کا ہے یا برج کا روزمرہ کا ہے یا فارسی کا انھیں اپنی زبان کا احساس بھی ہے اور لوگوں سے شکایت بھی کہ وہ ان کی زبان کو نہیں سمجھتے

کس کس ادا سے ریختے میں نے کہے ولے
سمجھا نہ کوئی میری زبان اس دیار میں

شعر میں ادا کا لفظ مضمون خیال انگریزی، معنویت اور زبان سب کا احاطہ کر لیا ہے۔ میرؔ کی تفہیم اسی لئے آسان نہیں ہے کہ وہ زبان کا اپنے مخصوص انداز میں استعمال کرتے ہیں اور یہ بات عام الفاظ تک محدود نہیں۔ عام بول چال کے الفاظ سے تو وہ خوب فائدہ اٹھانا جانتے ہیں لیکن فارسی کے لفظ میں بھی وہ ایسے معنی پیدا کرتے ہیں کہ شعر کی دنیا بدل جاتی ہے۔ ان کا ایک شعر ہے۔

عالم سیاہ خانہ ہے کس کا کہ روز و شب
یہ شور ہے کہ دیتی نہیں کچھ سنائی بات

فرہنگ عامرہ میں سیاہ خانہ کے معنی قید خانہ اور نامبارک مکان کے دئے ہیں لیکن سیاہ خانہ کے معنی غم کدہ اور عزا خانہ کے بھی

ہو سکتے ہیں آج بھی گھر کے ایک حصہ میں سیاہ پردے ڈال کر اسے عزاخانہ بنا دیا جاتا ہے عراق میں عام رواج ہے کہ جگہ جگہ پر سیاہ کپڑے سے گھروں کے باہر اور بازاروں میں ایام عزا میں عزاخانے بنا لیتے ہیں پھر یہ شعر کہہ کر میرؔ نے گریہ و ماتم کی شدت کی طرف اشارہ کیا ہے جس کی وجہ سے کوئی بات سنائی نہیں دیتی یعنی دنیا عزاخانہ ہے کہ دن رات یہاں ایسا شور ہے کہ کچھ سنائی نہیں دیتا یہ بات ذہن میں رہے کہ عزاخانے ناموں سے جانے جاتے ہیں مثلاً عزاخانہ زہرا، عزاخانہ ارشاد حسین، عزاخانہ جعفر مہدی خاں وغیرہ قیدخانے یا نامبارک مکان سے شعر بہت محدود ہو جاتا ہے۔ میرؔ نے ایک شعر میں سیاہ خانے کے بجائے خانۂ سیاہ کا لفظ استعمال کیا ہے۔

مجھ کو ہے سوگند خدا کی میری اور نگاہ نہ کر
چشم سیاہ ملا کر یوں ہی مجھ کو خانہ سیاہ نہ کر

اس شعر میں چشم سیاہ کی رعایت سے خانہ سیاہ یعنی خانہ برباد استعمال کیا ہے۔ پہلے مصرعہ میں سوگند اور اور आँख کے ہندی الفاظ کے ساتھ دوسرے مصرعہ میں چشم سیاہ اور خانہ سیاہ کی فارسی تراکیب سے شعر میں وسعت و کیفیت پیدا کی ہے۔

میرؔ بہت ہی غضب کے شاعر ہیں کچھ پتہ نہیں چلتا کہ وہ کب کونسا لفظ استعمال کر جائیں۔ ان کا ایک شعر ہے۔

ہم وہ ہیں جن کے خون سے تری راہ سب ہے گل
مت کر خراب ہم کو تو اوروں میں سان کر

پہلے مصرع میں راہ کے خون سے لال یا سرخ ہونے کی جگہ پر سب راہ کا گل ہونا صرف میرؔ ہی کہہ سکتے ہیں۔ یعنی تیری راہ ہمارے خون سے گلزار ہے یا خون کے گل بوٹوں سے آراستہ ہے اور دوسرے مصرعہ میں سان، کے لفظ نے تو کمال ہی کر دیا ہے۔ سانا، ملانا گوندھنا کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے لیکن یہاں پر اوروں میں ہم کو سان کر خراب نہ کریں اوروں کے سنے جو تضحیک کا پہلو پیدا کیا ہے وہ کسی دوسرے لفظ سے پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔

میرؔ اردو کے بے حد باشعور شاعر ہیں وہ اپنی دیوانگی اور سرمستی یا بے تکلفی کا اظہار تو کرتے ہیں لیکن ایک ایک لفظ کے استعمال میں کبھی شعور اور ہشیاری کا دامن ان کے ہاتھ سے نہیں چھوٹتا وہ کبھی روزمرہ سے کام لیتے ہیں، کبھی فارسی تراکیب سے، کبھی اپنے بیان میں ڈرامائیت پیدا کر کے، کبھی سادہ بیانی سے یہاں پر بغیر کسی تفصیل کے میرؔ کے چند اشعار پیش ہیں جس سے ان کے فن کی کچھ شناخت ہو سکے۔

ہم میرؔ تیرا مرنا کیا چاہتے تھے لیکن
رہتا ہے ہوئے بن کب جو کچھ کہ ہوا چاہے

میں یہ کہتا تھا کہ دل جس نے لیا کون ہے وہ
یک بیک بول اٹھا اس طرف آ، میں ہی ہوں
جب کہا میں نے کہ تو ہی ہے تو پھر کہنے لگا
کیا کرے گا تو مرا دیکھوں تو، جا، میں ہی ہوں

عالم کسی حکیم کا باندھا طلسم ہے
کچھ ہو تو اعتبار بھی ہو کائنات کا

سنا تھا میرؔ ہم نے کہ فسانہ خواب لا ہے
تری سرگذشت سن کر گئے اور خواب یاراں

دل ہم پہونچا بدن میں تب سے سارا تن جلا
آ پڑی ایسی چنگاری کہ پیراہن جلا

کل بارے ہم سے اس سے ملاقات ہو گئی
دو دو بچن کے ہونے میں اک بات ہو گئی

یاں شہر شہر بستی اوجڑ ہی ہوتے پائی
اقلیم عاشقی میں بستا نگر نہ دیکھا

دیکھ لیتا ہے وہ پہلے چار سو اچھی طرح
چپکے سے پھر پوچھتا ہے میرؔ تو اچھی طرح

(بقیہ صفحہ ۳۷ پر)

حسن عباس فطرت
جی ۲، میفیر ایلیگنز II این آئی بی ایم روڈ پونے ۴۸

معتقد کون نہیں میر کی استادی کا

میر صاحب کا ذکر آتے ہی مجھے اپنے بچپن کا سہانا زمانہ یاد آجاتا ہے اور ساتھ ہی ایک قدآور بارعب شخصیت بھی اور وہ تھے میرے لائق وفائق اتالیق مولوی صفدر رضا ہتوری بڑے ہی کلے ٹھلے والے مگر ہنس مکھ، نفاست پسندی ان کے گرد پھرتی تھی اور ضبط و نظم تو جیسے انھوں نے گھٹی پی رکھی ہو۔ کہاں ہیں ایسے لوگ جو فقیری میں بادشاہی و تنگ دستی میں مست مولا نظر آتے ہوں۔ بڑے ہی حساس، وضعدار بات چیت میں نوک و پلک کا بے حد خیال کرتے اور گفتگو میں حفظ مراتب تو انھیں سے میں نے سیکھا مجھ سے بہت پیار سے پیش آتے شاید اس لئے بھی کہ میں ان کی توقع سے زیادہ ہی تیز و طرار تھا اور انھیں کبھی شکایت کا موقع نہیں دیتا پھر بھی اگر کوئی لغزش ہو جاتی یا نامناسب بات منہ سے نکل جاتی تو بس اتنا ہی کہتے ۔

میر صاحب زمانہ نازک ہے
دونوں ہاتھوں سے تھامئے دستار

مطلب اپنی سمجھ میں آجاتا اور خیال ہوتا کہ چونکہ ہم سادات برادری کے لوگ سارے میں میر صاحب کہے جاتے ہیں اس لئے استاد بھی کہہ رہے ہیں لیکن آگے چل کر معلوم ہوا کہ نہیں یہ تو اردو کے عظیم شاعر میر تقی میر کا شعر ہے۔ ابتدائی درجات کے بعد جب ہی تعلیم کی گاڑی آگے بڑھی تو نصاب کی کتاب گلزار اردو میں میر کی ہولی پر ایک نظم یا مثنوی کا اقتباس مل گیا جس کا آخری شعر اب تک یاد ہے۔

جشنِ نوروزِ ہند ہولی ہے
راگ رنگ اور بولی ٹھولی ہے

اسی زمانے میں ہمارے ایک عزیز ساتھی شبیہ حیدر (مرحوم) کو بار بار گنگناتے سنا۔ نہ جانے کہاں اور کیسے ان کو میر کی مثنوی "در ہجو خانہ خانۂ خود" مل گئی وہ اس کا پہلا شعر برابر پڑھا کرتے تھے۔

کیا لکھوں میر اپنے گھر کا حال
اس خرابے میں میں ہوا پامال

اس طرح میر سے ہمارا جی لگ گیا اور پھر ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر ان کا کلام پڑھنے اور گانے لگے خصوصاً میر کی یہ معرکتہ الآرا غزل۔

ہستی اپنی حباب کی سی ہے
یہ نمائش سراب کی سی ہے

نازکی اس کے لب کی کیا کہئے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

میر ان نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

اب ہمارا شعور بالغ ہونے لگا تھا۔ شعری محاسن دامن دل کو کھینچنے لگے تھے۔ ابھی میر کی اس غزل میں کی سی ہے کی ردیف کیف نشاط سے مالامال کر دیتی ہے۔

نیا دور کے میر نمبر کے لئے بڑے بڑے اہل قلم نے مقالات و مضامین لکھے ہیں اس لئے احقر نے ایک نئی روش کا سہارا ڈھونڈھا ہے مقصد قارئین کی دلچسپی و افادیت ہے۔ لڑکپن کی باتیں اپنی یادداشت سے لکھ رہا ہوں۔ آج شکیل ہتوری ایک مستند معروف شاعر ہیں "تار رگ جاں" نام کا شعری مجموعہ بھی اردو ادب کو دے چکے ہیں مگر نوجوانی میں وہ اپنی پرسوز و دلکش آواز کے ذریعے اشعار و نوحے پڑھ کر لوگوں سے واہ وا سبحان اللہ بٹورتے تھے ایسا ہی معاملہ ہمارے عزیز دوست حکیم شارب لکھنوی کا تھا جو

بہترین قصیدہ خواں و نوحہ خواں تھے مگر آگے چل کر نمایاں و معتدر اور مقبول شاعر ہوئے. بات میر صاحب کی چل رہی تھی. شکیل ہلوری اپنے مخصوص لہجہ میں جب یہ غزل چھیڑتے تو سماں بندھ جاتا تھا.

میں کون ہوں اے ہم نفساں سوختہ جاں ہوں
اک آگ ہے سینے میں مرے شعلہ فشاں ہوں
لایا ہے مرا شوق مجھے پردے کے باہر
ورنہ میں وہی خلوتی راز نہاں ہوں
جلوہ ہے مجھی سے لب دریائے سخن پر
صد رنگ مری موج ہے میں طبع رواں ہوں
اک وہم نہیں بیش مری ہستیٔ موہوم
اس پر بھی تری خاطر نازک پہ گراں ہوں

اس کے علاوہ کبھی کبھی وہ یہ غزل بھی سناتے تھے

کچھ موج ہوا پیچاں اے میر نظر آئی	شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی

ہمارا گلہ نورانی تو نہیں مگر غنیمت تھا چنانچہ جواباً ہم بھی میر کی غزل

پتہ پتہ بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے	جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

عمدہ لحن و طرز سے پڑھا کرتے تھے.

مشہور محقق و ادیب و شاعر کالی داس گپتا رضا سے احقر کی خوب بنتی تھی. ہمارا ان کا دس پندرہ برس کا ساتھ رہا. دبستان لکھنؤ سے میری آشنائی و رغبت انھیں کی صحبت کا فیض تھا. موصوف پر ہم نے ایک مضمون میں لکھا تھا کہ ان کی صحبت کئی کتب خانوں اور ادبی جلسوں کی سیر کرا دیتی تھی اور ہر ایک چھوٹے بڑے کا ان کے یہاں پر جوش استقبال بھی ہوتا تھا اسی ضمن میں احقر نے اپنے نانا محمد حسین صاحب ہفت قلم کی مثال دی تھی چنانچہ شکیل ہلوری، بذر ہلوری، اور راقم الحروف نے ان کی گپ شپ سے بہت کچھ جان اور سیکھ لیا تھا. یہ وہ زمانہ تھا کہ موازنہ انیس و دبیر ہی نہیں غالب، ذوق و میر و سودا آتش و مصحفی بھی ہر ادب آشنا کے یہاں مروج تھا اور بس ایک ایک لفظ میں ان کی خوبیاں بیان کرنے کا فیشن تھا نانا محمد حسین صاحب غالب پرست تھے. ذوق تو ان کو ایک آنکھ نہیں بھاتے تھے (استاد ذوق ہونے کے باوصف) جب بات میر و سودا کی آتی تو وہ اسی عہد کا مرسوم جملہ فرماتے. میر کا کلام آہ ہے اور سودا کا واہ اور جب موازنے کی بات آتی تو میر کے لئے رطب اللسان ہو کر دونوں کے ایک ایک شعر پڑھ کر میر کی فوقیت جتاتے تھے. دیکھئے تو بھی میر کہتے ہیں.

سرہانے میر کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

اب اسی مضمون کو سودا یوں خراب کرتے ہیں (نقل کفر کفر نباشد)

سودا کے جو بالیں پہ ہوا شور قیامت
خدام ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے

المختصر اس مکتب سے نکل کر جب ہم باہر پہونچے تو وہ "آب حیات" مل گئی جس کی شیرینی انشا پردازی اور من موہنی تحریر پر ہم لوٹ پوٹ گئے اسے ایک بار نہیں کئی بار پڑھا حتیٰ کہ اس کی عبارتیں اور واقعات پچاس سال بعد بھی حافظہ کی امانت میں ہیں. اسی آب حیات کے طفیل ہمیں میر صاحب کی دوبدو ملاقات و خیالی قربت نصیب ہوئی مگر ان کی اعلیٰ شاعری سے زیادہ ان کی بددماغی کا سکہ ہمارے دل پر بیٹھ گیا. خان آرزو کی بدسلوکی پڑھ کر غصہ بھی آیا مگر ہم بہت جلد سمجھ گئے کہ آب حیات میں تاریخ ادب سے زیادہ آزاد کے قلم کے مرقع ہیں مثلاً استاد ذوق کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دینا اور صفحات کے صفحات ان پر نثار کر دینا. میر کی بددماغی کے چھوٹے بڑے واقعات، باغ و راغ سے ان کی بے گانگی و بیجا گھمنڈ وغیرہ اور خاص طور سے وہ بیان جو آزاد نے ان کے لکھنؤ کے پہلے مشاعرے میں شرکت کے حوالے سے تراشا اور بنایا ہے. غزل کا شعر یوں ہے.

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے

اور آخری شعر

دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

خدا بھلا کرے خواجہ احمد فاروقی کا کہ انھوں نے اپنی معرکۃ الآراء

تصنیف میر تقی میر کو شائع کر کے آزاد کے بنائے ہوئے تمام بدنما نقوش سنوار دئے۔ میر کی تصویر اور ان کا اصلی روپ بھی دیکھنے کو ملا پھر تو ہمیں میر اور میریات سے گہری دلچسپی ہوگئی۔ میر کی آپ بیتی ذکر میر نکات الشعراء، افکار میر، مقدمہ کلیات میر سبھی کتابوں کو چاٹ ڈالا۔

میر کا ذکر آنے پر اگر ایک عجیب و غریب شخصیت کا ذکر نہ کرتے تو ناانصافی ہوگی جو دیکھنے میں صوفی صافی اور حقیقت میں کھلے کافر تھے۔ جی ہاں پتلی مہری کے پاجامے اور کھدر کے بلسے کرتے پر سفید گاندھی ٹوپی لگائے ان کو پہلی بار انجمن ترقی پسند مصنفین بمبئی کے جلسے میں دیکھا جو ہر ہفتہ خواجہ احمد عباس کے دولت کدہ پر ہوتا تھا۔ ہائے کیا وقت تھا کیا لوگ تھے۔ مجروح، بیدی، سردار اختر الایمان، کرشن چندر اور ہمارے ممدوح ڈاکٹر صفدر آہ پابندی سے ان جلسوں میں آتے تھے۔ ڈاکٹر صفدر آہ سرتاپا علم تھے مگر بولتے کم تھے۔ ہم نے نیاز مندی دکھائی تو مہربان ہوگئے ستر کے پیٹے میں رہے ہوں گے مگر سیدھے ہی کھڑے رہتے تھے۔ ان کا احترام پورے حلقے میں تھا۔ صاحب موصوف بمبئی سے چالیس پچاس کلومیٹر شمال میں ویشوری جیسے کم آباد علاقے میں تنہا رہتے تھے۔ کتابیں، قلم کاغذ ان کے رفقا تھے۔ پڑوس میں ان کے ایک شیدائی و مداح ان کا خرچ اٹھاتے تھے۔ رام چرتر مانس ان کی ایک ٹھوس تصنیف ہے۔ ان سے ملنے غلام رضوی گردش کے ساتھ ایک بار ان کے آشیانے پر پہونچے تو کئی کتابوں کے ساتھ "میر و میریات" حوالے کی جو بڑی بیش قیمت و متعدد انکشافات سے پُر ہے۔ ڈاکٹر صفدر آہ بڑے بے لاگ محقق و اہل قلم تھے کسی سے مرعوب نہیں ہوتے تھے چنانچہ معروف مرثیہ گو چھنولال دلگیر کے تبدیلی مذہب کے تعلق سے انھوں نے برملا سید مسعود حسن رضوی کی تردید کی اور اس پر حوالوں اور ثبوت کے ساتھ قائم رہے ڈاکٹر آہ پر ناگپور کی ڈاکٹر زرینہ نشاط ایک کتاب بھی لکھ رہی ہیں۔

ڈاکٹر آہ کی "میر و میریات" کے مطالعہ سے ہم پر کھلا۔

(۱) میر صاحب نے اپنی کتاب آپ بیتی میں جو چاہا لکھا۔ جسے چاہا اوپر اٹھایا اور جو ناپسند تھا اسے نیچے گرا دیا گیا۔

۲۔ اپنے والد محمد تقی صاحب کے مرجع خلائق اور صاحب کشف و کرامات ہونے کا بیان بے دلیل و ثبوت و مبالغہ آمیز ہے۔

۳۔ میر صاحب نے اپنے اشعار میں کئی جگہ اپنی سیادت کا ذکر کیا ہے وہ بھی مشکوک ہے مثلاً میر کا مشہور شعر

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں
اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی

۴۔ یہی عمل میر کا نکات الشعراء میں ہے۔ اپنی پسند کے شعراء کا طویل تذکرہ و تعریف ہے اور ناپسندیدہ شخصیت جیسے انعام اللہ یقین پر کافی مشق ستم فرمایا ہے۔

ان تمام باتوں کے باوجود ڈاکٹر صفدر آہ میر کو عظیم شاعر مانتے تھے انھوں نے میر کی شاعری کی چالیس خصوصیات لکھی ہیں۔ انھوں نے میری فرمائش پر میر کے کچھ چیدہ اشعار بھی سنائے اور اس کے محاسن بھی بیان کئے۔ چار شعر یاد آتے ہیں۔

کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے
تیری ان نیم باز آنکھوں سے

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا
دل ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

ساعد سیمیں اس کے دونوں ہاتھ میں لے کر چھوڑ دئے
بھولے اس کے قول و قسم پر ہائے خیال خام کیا

دور بیٹھا غبار میر اس سے
عشق بن یہ ادب نہیں آتا

میر کے خدائے سخن ہونے میں دو رائے نہیں۔ شمس الرحمان فاروقی صاحب نے "شعر شور انگیز" لکھ کر اسے قول فیصل بنا دیا ہے۔ دوسرا ثبوت یہ ہے کہ میر کو ناسخ، غالب، ذوق سب نے عظمت و عزت دی ہے۔ غالب کہتے ہیں۔

ریختہ کے تم ہی استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

ذوق خود عظیم شاعر تھے۔ قصائد سے قطع نظر ان کی غزلیں بھی اپنی جگہ اپنا جواب ہیں۔ غالب ان کے حریف رہے ہوں یا

لوگوں نے بنا دیا ہو مگر اس شعر سے ان کی میر نوازی و غالب شکنی کا گمان ضرور ہوتا ہے۔

نہ ہوا پھر نہ ہوا میر کا انداز نصیب
ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

اور یہ شعر تو ضرب المثل بن کر عوام و خواص کی زبان پر رہتا ہے۔

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقولِ ناسخ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

میر انیس بھی میر کے معتقد تھے۔ اس کا اظہار انھوں نے نجی گفتگو و خطوط میں کیا ہے اگر وہ میر کے ہمعصر ہوتے تو یقیناً ان کی وفات پر شعری نذرانہ ضرور پیش کرتے جیسا کہ انھوں نے غالب کے لئے کیا ہے۔

ایک اور بات میرے کرم فرما و عزیز دوست کالی داس گپتا رضا سے متعلق ہے جو غالبیات کے ماہر اور مستند محقق شاعر و اہل قلم مانے جاتے تھے۔ غالب کا دیوان بالترتیب تاریخ وار ان کا تنہا و انمٹ کارنامہ ہے۔ غالب غالب ان کا ورد و وظیفہ تھا مگر سچی بات ہے کہ وہ میر کو غالب پر ترجیح دیتے تھے۔ کئی مواقع ایسے آئے۔ ان سب ذکر سے صرف نظر کرتے ہوئے مجھے یاد ہے کہ سردار جعفری کی وفات ۲۰۰۰ء کی خبر سن کر انھوں نے میر کا ہی یہ شعر پڑھا تھا۔

حوادث اور تھے پر دل کا جانا
عجب اک سانحہ سا ہو گیا ہے

اگر اس مختصر و بے ترتیب تحریر کو نواب جعفر علی خاں اثر کے ذکر سے خالی رکھا جائے تو بڑی ناانصافی ہوگی۔ ہمارے بچپن کے لکھنؤ کی یادوں میں ان کا رنگ بہت شوخ ہے۔ ان کے اشعار و مجموعہ ہائے اشعار فرہنگ اثر مطالعۂ غالب اور کئی کتابیں اپنے مطالعہ میں آچکی ہیں۔ ان کے مرتبے کو نیاز فتحپوری نے برملا تسلیم کیا ہے۔ موصوف شعر و ادب کے ایسے رسیا تھے کہ ہر بڑے مشاعرہ میں ان کو صدر بنا کر بٹھا دیا جاتا تھا اور وہ پوری رات بغیر تکان و کسمساہٹ کے پرسکون و متین انداز میں بیٹھے رہتے۔ کہنا یہ ہے کہ وہ تو میر کے اتنے قائل تھے کہ کسی بڑے شاعر کی تعریف انھیں اس کے مقابلے میں گوارہ نہ تھی ۱۹۵۰ء میں پروفیسر شوکت سبزواری (پاکستان) نے فلسفہ کلام غالب کیا لکھا کہ اثر صاحب نے آستینیں چڑھا کر اس کا جواب لکھنا شروع کر دیا اور کمال یہ تھا کہ ایک شعر غالب کا لکھتے اور فوراً ہی کہتے کہ دیکھو میر نے اسی مضمون کو کس شان سے یوں باندھا ہے۔ رسالہ آجکل دہلی میں کئی مہینوں تک یہ دلچسپ سلسلہ جاری رہا۔

ہم کو میر سے بہت محبت ہے اسی لئے میں مہدی حسن کی گائی ہوئی غزلوں کا کیسٹ رکھتے ہوئے ہوں اس میں سے ایک یہ ہے جسے بار بار سنتا رہتا ہوں۔

دیکھ دل سے کہ جاں سے اٹھتا ہے
یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے

میری اس محبت کا ایک ثبوت یہ ہو کہ مجھے ان کی تاریخ وفات ۱۲۲۵ء اور ناسخ کا مصرعہ تاریخ کا مصرع تاریخ ،، وا ویلا مردہ شاعراں یاد ہے۔ افسوس کہ لکھنؤ میں رہ کر بڑی کوشش کے بعد بھی ان کی قبر نہیں پا سکا جسے سٹی اسٹیشن کے آس پاس بتایا جاتا ہے۔

آخر کلام میں عرض ہے کہ آٹوگراف لینے کا شوق میرے اندر اب بھی موجود ہے۔ میری ڈائری میں بہت سے بلند پایہ شخصیتوں کے آٹوگراف ہیں مگر زیادہ تر اردو میں اور سنئے کہ ان میں سب سے زیادہ خوشخط تحریر ایک انگریز کی ہے۔ ۱۹۹۸ء کی سردیاں تھیں۔ دہلی میں اردو بازار کی سیر کرتے معمولی لباس و حلیہ میں ایک شخص کو دیکھا اور پکڑ لیا اور ڈائری اس کے ہاتھ میں دیدی وہ انگریز غالب کا عاشق اور انگریزی میں غالب کا ترجمہ کر چکا تھا اس نے لکھا کیا سنئے۔

میر کے دین و مذہب کو پوچھتے کیا ہو ان نے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

کون تھا یہ اور میں نے کیسے پہچانا یہ تو صحیح صحیح بتا نہیں سکتا مگر تھا وہ محسن اردو۔ لندن کو ایک اردو کا بازار بنا دینے والا آنجہانی پروفیسر برینڈر سل۔ بہت جلد وہ رخصت ہو گیا تو میری زبان

(بقیہ صہ ۱۴۳ پر)

پروفیسر سید فضل امام
۱۱۱ ـ یہ مارگ، جعفریہ کالونی منشی گنج لکھنؤ ۳

"مطالعہ میر کی قدر و قیمت"

خدائے سخن میر تقی میر کا انتقال ۱۸۱۰ء میں لکھنؤ میں ہو گیا تھا۔ ان کے سانحۂ ارتحال کو دو صدیاں گذر گئیں۔ اس طویل مدت میں میر پر مختلف نوعیت کے چھوٹے بڑے تنقیدی و تحقیقی کام بھی ہوئے تفہیم شعر میر کی سعیٔ جمیل بھی کی گئی لیکن سچ تو یہ ہے کہ تفہیم میر آج بھی تشنہ ہے۔ میر دراصل ایک ایسے شاعر ہیں جو جملہ اصناف سخن پر قدرت کاملہ رکھتے ہیں۔ اس کی اپنی انتقادی فکر بھی ہے جس کا ثبوت نکات الشعراء سے ملتا ہے لہٰذا ان ابعاد و افکار کے ساتھ میر کے مطالعہ کی قدر و قیمت میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے اس کی شاعری سہل ممتنع ہونے کے باوصف بہت پیچیدہ ہے اس لئے کہ اسکی شاعری کی اصل روح رمزیت اور ایمائیت میں مضمر ہے۔ میر کا فن بہت تہہ داری کا امانت دار ہے جس کی تہوں میں تہیں بہت سی زیریں لہریں رکھتی ہے۔

ظاہر ہے کہ بنیادی طور پر میر غزل کا شاعر ہے اور غزل حسن و عشق کی داستان دلبری اور ادائے کافری اور قاہری سے عبارت ہے میر نے بھی عشق سے اپنے آپ کو وابستہ رکھا ہے لیکن یہ وابستگی روح اور جسم کی ایک انتہائی بلاخیز کیفیت کے سانچے میں ڈھلی ہے جہاں جسم اپنی تمام تر جلوہ سامانیوں کے ساتھ روح کے تتبع میں تطہیر نفس کا مظہر ہے اور عشق، سوز و ساز کے حسین امتزاج سے روح کی لذتوں سے ہمکنار کر دیتا ہے۔ بقول میر۔

صورت پرست ہوتے نہیں معنی آشنا
ہے ذکر سے بتوں کے مرا مدعا کچھ اور

دراصل "یہی مدعا کچھ اور" میں میر کے مطالعہ کی تہیں پوشیدہ ہیں۔ الفاظ اور معانی کی گرہیں بھی اسی میں کھلتی ہیں۔ رمزیت اور ایمائیت کے اثرات جادوئی کیفیت رکھتے ہیں اور یہی غزل کی خوبی ہے۔ حیات انسانی کے پرپیچ مسائل اور اس کے زیر و بم دردوں بینی کی طلسمی فضا قائم کرتے ہیں جو میر کے یہاں بطور خاص ہے۔ فرماتے ہیں۔

زلف سا پیچ دار ہے ہر شعر
ہے سخن میر کا عجب ڈھب کا

ایک دوسرے شعر میں اسی فکری تہہ کو اس طور سے پیش کرتے ہیں۔

کیا تھا شعر کو پردہ سخن کا
سو ٹھہرا ہے وہی اب فن ہمارا

میر کی شاعری کا یہ عجیب ڈھب دراصل رمزیت و کنایت ہے اسی لئے میر کی شعری تفہیم میں کئی پردے حائل ہو جاتے ہیں۔ اکثر جگہ میر تو غالب سے زیادہ پیچیدہ ہو جاتے ہیں اور یہی پیچیدگی میر کا فن قرار پاتی ہے جس کا تجزیاتی مطالعہ بظاہر آسان لیکن اصل میں بہت مشکل ہو جاتا ہے جس میں تکوینی نظام کے تمام اسباب و علل نظر آتے ہیں۔ میر کی غزلوں میں جو وارفتگی اور یک گونہ بے خودی ملتی ہے اس کا سبب رمزیت ہے وہ اپنے دل کے گلشن کی تزئین و تہذیب میں اس قدر محویت طاری کر لیتا ہے کہ اسے اور کسی چیز کی خبر نہیں رہتی اور یہی تحیری اور ششدری اس کا انفرادی فن قرار پاتی ہے۔ وہ خارجی دنیا سے بے نیاز رہتا ہے۔ اس کا اپنا منفرد انداز فکر شعور و ادراک کے گہرے سوز سے حیات انسانی کے ساز چھیڑتا ہے جس میں ایک طرح کی بصیرت اور بصارت کے جلوۂ صد رنگ نظر آتے ہیں۔

میر نے لفظ و معانی کے مدارج اور محسوسات پر زیادہ فکر کی ہے عشق میں فسق و فجور سے بلند ہو کر تزکیہ نفس اور تطہیر مزاج

کی طرف ذہنوں کو متوجہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

کچھ ہو رہے گا عشق و ہوس میں بھی امتیاز
آیا ہے اب مزاج ترا امتحان پر

میر معاملۂ حسن و عشق میں حسن کو معصوم قرار دیتے ہیں اور عشق کی مظلومیت کے بھی قائل ہیں۔ یہ معصومیت حسن اور مظلومیت عشق ان کے فن کو نئی طرز ادا سے ہم آہنگ کرتا ہے۔

میر کے مطالعہ میں ان کے محسوسات، مشاہدات تجربات، حوادثات اور معتقدات کو لازمی طور پر پیش نظر رکھنا ہوگا۔ میر کے سلسلہ میں جتنے تصنیفات، تالیفات اور تاثرات اب تک منظر عام پر آئے ہیں وہ مکمل نہیں کہے جا سکتے۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے جدیدیت کے طوفان کے بعد جب شعر و ادب کو ٹھہر کر اور سمجھ کر لکھنا پڑھنا شروع کیا تو تفہیم میر کے ذیل میں چار جلدوں میں شعر شور انگیز کی شکل میں ایک قیمتی ادبی سرمایہ عطا کیا جس کی افادیت سے انکار ممکن نہیں۔

ہاں عام طور سے میر کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے اس کے درد و غم، ناکامی، نامرادی، مایوسی کا ذکر بطور خاص کیا جاتا ہے اور کیا بھی جانا چاہئے۔ موضوعات بنتے رہتے ہیں کہ، کیا میر قنوطی شاعر تھے؟ یا میر کی یاسیت اور قنوطیت پر تبصرہ کیجئے۔ اس پر بہت زیادہ تفصیل سے بحثیں ہوئی ہیں اور اب بھی جاری ہیں اور جاری رہیں گی۔ انسانی نفسیات Human Psychology کا عجیب معاملہ ہے وہ غم و رنج سے بہت جلد بیزار ہو جاتا ہے اور عیش و مسرت کی پناہ میں سکون محسوس کرتا ہے حالانکہ یہ سکون بھی عارضی ہوتا ہے۔ میر کے یہاں مایوسی نہیں بلکہ سوز و گداز ہے اور یہ دل گداختگی اردو کے تمام شعراء سے بالکل منفرد ہے۔ وہ دل پر خوں کی ایک گلابی سے زندگی بھر مدہوش رہے۔

دل پر خوں کی اک گلابی سے   عمر بھر ہم رہے شرابی سے

وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ دنیا عشرت گاہ نہیں بلکہ زندگی کے گلشن کا ہر گل خون سے لبریز ساغر ہے۔

یہ عیش گہہ نہیں ہے یاں رنگ اور کچھ ہے
ہر گل ہے اس چمن میں ساغر بھرا لہو کا

میر کے اشعار کی اثر آفرینی ایک میٹھی چبھن کے ساتھ کشش بھی رکھتی ہے اس لئے کہ میر کا عشق بھی اردو کے دیگر شعراء سے مختلف ہے۔ اس کے جذبات عشق کی آگ میں تپ کر کندن بنتے ہیں اسی لئے اس میں چمک اور دائمی چمک دمک ہے جو آج بھی دلوں کو روشنی اور گرمی بخشتی ہے۔ میر کے جذبات حقیقت سے لبریز ہیں۔ ان میں تصنع نہیں۔ میر کے مطالعہ کی قدر و قیمت یہی ہے کہ ان کے یہاں ہلکا پن اور سوقیانہ انداز نہیں۔ وہ غموں سے بیزار نہیں بلکہ غم کے جانے کا بھی غم کرتے ہیں۔ وہ چھاتی پر نشان عشق کو دھونے سے منع کرتے ہیں کیونکہ وہ ان داغوں کو امانت سمجھتے ہیں۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ نیاز عشق ناز حسن سے کبھی ہاتھ نہیں کھینچتا اور اس طرح سر بر آستاں مارا جاتا ہے۔

کب نیاز عشق، ناز حسن سے کھینچے ہے ہاتھ
آخر آخر میر سر بر آستاں مارا گیا

غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا
غم کے جانے کا نہایت غم رہا

دراصل میر کی شخصیت اور شاعری اس شعلۂ جوالہ کے مانند ہے جس میں لرزتے ہوئے شعلوں کے ساتھ گریۂ شبنم بھی ہے وہ جب یہ فرماتے ہیں۔

یہ جو چشم پُرآب ہیں دونوں
ایک خانہ خراب ہیں دونوں

ایک سب آگ ایک سب پانی   دیدہ و دل عذاب ہیں دونوں

عالم عالم عشق و جنوں دنیا دنیا تہمت ہے
دریا دریا روتا ہوں، صحرا صحرا وحشت ہے

صبح سے آنسو نومیدانہ جیسے ودا ہی آتا تھا
آج کسو خواہش شاید دل سے ہمارے رخصت ہے

میر ہمارے ان شاعروں میں سے تھے جنھوں نے صلح کل کے پیغام کو انتہائی خوبصورت پیرائے میں پیش کیا ہے۔ جو شاعر وحدت الوجود کے فلسفہ کو وحدت الشہود کے پیمانے میں ڈھال کر اس طرح پیش کرے کہ۔

اس کے فروغِ حسن سے جھمکے ہے سب میں نور
شمعِ حرم ہو یا کہ دیا سومنات کا

یہ وہ زبردست پیغام ہے جو عالمِ انسانیت کو اخوت و مساوات کا درس دیتا ہے۔ درج ذیل اشعار بھی ملاحظہ ہوں۔

نازِ بتاں اٹھا چکا دیر کو میر ترک کر
کعبے میں جاکے رہ میاں تیرے مگر خدا نہیں

سرنشینِ رہِ میخانہ ہوں، میں کیا جانوں
رسم مسجد کے تئیں شیخ کہ آیا نہ گیا

شریف مکہ رہا ہے تمام عمر اے شیخ
یہ میر اب جو گدا ہے شراب خانے کا

ابر اٹھا تھا کعبے سے اور جھوم پڑا میخانے پر
بادہ کشوں کا جھرمٹ ہے گا شیشے اور پیمانے پر

یارانِ دیر و کعبہ دونوں بلا رہے ہیں
اب دیکھئے ہمارا جاتا کدھر بنے ہے

درج بالا اشعار سے میر کی انسان دوستی اور وسیع المشربی کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ یہ اشعار تو مشتے نمونہ از خروارے ہیں ورنہ میر کے دواوین میں صدہا اشعار اسی انداز فکر کے ساتھ میں ڈھلے ہوئے ہیں جن سے ان کے مسلک و مشرب کو آسانی سے سمجھا جاسکتا ہے۔

میر کا عہد، بہت جھوری اور افراتفری کا تھا جس سے میر کا کلام عبارت ہے۔ دہلی کی زبوں حالی، تباہی، حملوں پر حملے اور اس معاشرت سے اس دور کی تاریخی حقیقت کو معلوم کیا جاسکتا ہے۔ جب وہ کہتے ہیں۔

دلی کے نہ تھے کوچے اوراق مصور تھے
جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئے

دل کی بربادی کی اس درجہ خرابی کہ نہ پوچھ
جانا جاتا ہے کہ اس راہ سے لشکر نکلا

آج کے اس دورِ ظلمات میں جبکہ انسانی اقدارِ حیات پامال ہو رہی ہیں میر کی شاعری اپنی تمام تر تابناکیوں کے ساتھ حوصلہ زیست اور روشنی عطا کر رہی ہے اور تلخیٔ حیات میں زندگی کا پیغام دیتی ہے۔

صبر کرو بے تاب رہو، خاموش پھرو یا شور کرو
کس کو یاں پروا ہے کسی کی ٹھہرو آؤ جاؤ تم

میر کا درج بالا شعر آج کے اس عالمی معاشرہ Global Society پر بھی صادق آتا ہے جہاں انسان اپنی تمام تر اخلاقی قدروں کو کھو چکا ہے۔ اور بے چارگی اور بے بسی کے عالم میں چار و ناچار جی رہا ہے۔ OO

تفہیم میر کے مسائل .. (صفحہ ۳۰ کا بقیہ)

ان اشعار میں مختلف کیفیتیں اور مختلف تصویریں ہیں جو صاف ہونے کے بعد بھی پوری طرح اپنے کو ظاہر نہیں کرتیں۔ اس طرح کے اشعار کی میر کے کلام میں کمی نہیں ہے۔ یہ بظاہر سادہ ضرور نظر آتے ہیں لیکن ان میں استعاروں کی نوعیت، رعایتوں کے دروبست اور ہندی، پراکرت اور برج کے الفاظ معنی کو جن نئے رخوں کی طرف لے جاتے ہیں وہ آسانی سے نہیں کھلتے۔ میر اپنے کو سوختہ جاں کہتے ہیں لیکن ان کے یہاں جو آگ کی لپٹ ہے وہ اچھے اچھوں کو جلا دیتی ہے۔

دل سوختہ ہوں مجھ کو تکلیف حرف مت کر
اک آگ کی لپٹ سی نکلے ہے ہر سخن میں

میر کے کلام کی یہ آگ کی لپٹ ہی ہے جو دو سو سال بعد بھی دلوں کو گرمائے ہوئے ہے۔ OO

وا اُس سے سرِ حرف تو ہو گو کہ یہ سر جائے
ہم حلق بریدہ ہی سے تقریر کریں گے
— میر

انیس انصاری
۴، وکرمادتیہ مارگ، لکھنؤ

میر تقی میرؔ اور انکی ہمعصر ہندی شاعری

اردو شاعری کے خدائے سخن میر تقی میرؔ ۱۷۲۲ء۔۱۸۱۰ء کا عہد ہندی شاعری میں ریتی کال (یا جونب وسطی عہد اتر مدھ کال) ۱۶۴۳ء ۱۸۴۳ء کے نام سے معروف ہے۔ میر تقی میرؔ کی پیدائش آگرہ میں ہوئی تھی۔ ان کی زیادہ تر اور اہم شعری تخلیقات دہلی میں لکھی گئیں اور نواب آصف الدولہ کے عہد میں وہ لکھنؤ آ گئے جہاں ان کا انتقال ہوا۔

ہندی شاعری کا ریتی کال (یا جونب وسطی عہد ومابعد عہد وسطی) میرؔ کی پیدائش سے تقریباً دو سو سال پہلے شروع ہوتا ہے۔ لیکن اس کے دائرے میں میرؔ کا تقریباً پورا عہد شامل ہو جاتا ہے اس لئے ہم میرؔ کی ہم عصر ہندی شاعری کو ریتی کال کے شعراء کے شعری رجحانات کی مدد سے سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

میرؔ کا زمانہ سیاسی، سماجی اور تہذیبی سطح پر افراتفری اور انحطاط کا زمانہ تھا۔ سیاسی سطح پر یہ وقت سائنس اور تکنیک میں پچھڑی ہوئی ہندوستانی، چینی، افریقی اور موجودہ تیسری دنیا کی دوسری تہذیبوں کی شکست کا عہد تھا ۱۵۰۰ کے قریب یورپ نے سائنس اور تکنیک کی دوڑ میں آگے بڑھنا شروع کر دیا تھا۔

میرؔ کا عہد سیاسی طوائف الملوکی کا دور تھا۔ ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب کے انتقال کے بعد ان کا دوسرا بیٹا معظم بہادر (شاہ اول) تخت پر بیٹھا اور ۱۷۱۲ء تک حکومت چلتی رہی۔ اس کے بعد مغلیہ سلطنت کا زوال شروع ہوا تو ۱۸۵۷ء تک مرکزی حکومت کو استحکام حاصل نہ ہو سکا۔ مرکز کی کمزوری کی وجہ سے چھوٹے چھوٹے نوابوں اور جاگیرداروں نے خود مختار ہونے کی کوششیں شروع کر دیں۔ ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ نے دہلی پر حملہ کیا۔ پھر ۱۷۴۷ء سے ۱۷۶۹ء کے درمیان احمد شاہ درانی نے ۹ حملے دہلی پر کئے۔ ۱۷۶۴ء میں بکسر کی لڑائی میں ہندوستان کی متحدہ طاقت بشمول شجاع الدولہ کو انگریزوں کے مقابلہ میں شکست ہوئی اور انگریز حاوی ہونا شروع ہو گئے۔

مرہٹے، روہیلے، جاٹ، افغان، سکھ سب خود مختار ہونا چاہتے تھے اور اس طرح بدامنی اور شورش کی راہ ہموار ہوتی گئی۔ یورپی خاص طور سے برطانی تاجروں اور حکمرانوں نے شمالی ہند کے بیشتر علاقوں پر اپنا اقتدار قائم کر لیا ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے براہ راست انتظام سنبھالنے کے بعد مغلوں کا ٹمٹماتا چراغ بھی بجھ گیا۔

۱۷۶۴ء میں بکسر کی لڑائی میں شجاع الدولہ کی شکست کے بعد اودھ کے نواب برطانی تاجروں اور حکمرانوں کے وظیفہ خوار ہو گئے دوسرے راجاؤں کی طرح اودھ کے نواب بھی خود مختار ہو گئے اور برطانوی مفادات کے لئے استعمال ہوتے رہے ۱۸۱۸ء میں غازی الدین حیدر نے اودھ کے بادشاہ ہونے کا اعلان کیا۔ نوابوں نے سیاسی سطح پر مغلوں سے آزادی حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن تہذیبی سطح پر مغل دربار کے معیاروں کی نقل کرتے رہے۔ یہی حال بندیل کھنڈ اور راجستھان کے راجواڑوں کا تھا۔

اس عہد میں سماجی سطح پر بھی زوال کا اثر تھا جاگیرداری نظام میں مزدوروں اور کاشتکاروں، چھوٹے دوکانداروں کا استحصال عام بات تھی ایسے میں تقدیر پرستی اور اخلاقی زوال کے رجحانات قوی تر ہوتے گئے۔ رشوت ستانی عورت کو ذاتی ملکیت کی طرح برتنا اور عیش پرستی کے وسیلوں کی تلاش غالب رجحان بن کر ابھرے غریب ہندو اور مسلمان مندروں اور مزاروں پر دعائیں مانگنے میں مصروف تھے۔ لوگ توہم پرستی اور کورانہ تقلید کے شکار ہوتے گئے۔

شاعر اور فنکار درباروں سے وابستہ تھے اس لئے انھیں اس بات کی آزادی کم تھی کہ وہ اپنی ذاتی پسند کے مطابق تخلیق کر سکیں انھیں شاہوں اور رئیسوں کی پسند و ناپسند کا خیال رکھنا پڑتا تھا۔ فارسی زبان کے غلبہ کی وجہ سے فارسی ادب کے صنائع و بدائع کا اثر بھی ہندوستانی زبانوں پر پڑا۔ مصوری میں سنہرے رنگوں اور جامد تصویروں کا چلن عام ہوا۔ رفتار اور حرکت میں کمی آئی۔ البتہ راجستھانی اور کانگڑا دبستانوں کی مصوری میں عام زندگی سے رشتہ

استوار رہا۔ موسیقی اور فن تعمیر بھی درباروں کے زیر اثر عوام سے دور ہوگئے۔

اس سیاسی، سماجی، تہذیبی اور اخلاقی زوال کے پس منظر میں میر نے اپنے ذاتی فکر کے چراغ کو روشن رکھا۔ انھوں نے اس انحطاط پذیر معاشرہ اور زوال آمادہ تہذیب کے ماحول میں بھی حسن اور عشق کا پاکیزہ اور ارفع تصور پیش کیا۔ درباروں اور رئیسوں پر انحصار کے باوجود اپنی پسند اور ناپسند کو اہمیت دی۔ میر کے یہاں جاگیرداری کی قدروں سے الگ ہٹ کر وحدت انسان کا اہم تصور جگہ جگہ ملتا ہے جس کا ایک سرا قرون وسطیٰ کے تصوف، بھگتی تحریک اور سریت سے جا ملتا ہے۔ میر کا اعتقاد تھا کہ سب انسان مذہب، ذات پات اور پیشہ کی حد بندیوں کے باوجود ایک رشتہ سے منسلک ہیں۔ عشق اور دل خارجی حد بندیوں سے بالاتر ہے۔ آدمی دل سے بنتا ہے اور عشق خدا ہے صرف انسان سے محبت کر کے خدا تک پہونچا جا سکتا ہے اس لئے دل توڑ کر کعبہ اور مندر بنانا بے سود ہے۔ انسانوں میں کھو جانا اور دنیا کو برتنا نجات کا صحیح راستہ ہے۔ اس میں گناہ بھی شامل ہے جو خدا کی رحمت کو باعمل کرتا ہے۔ اس طرح جنسی محبت انسانوں کی محبت اور خدا کی محبت تینوں مل کر ایک ہو جاتی ہیں۔ میر کی شاعری دل اور دہلی کی خرابی کی دستاویز ہے جس میں ذاتی غم اور عہد کے غم کا فرق مٹ جاتا ہے۔ چند مثالیں دیکھئے۔

غیر از خدا کی ذات مرے گھر میں کچھ نہیں   یعنی کہ اب مکان مرا لامکاں ہوا

نہ ہو کیوں غیرتِ گلزار وہ کوچہ خدا جانے
لہو اس خاک پر کن کن عزیزوں کا بہا ہوگا

دل کی آبادی کی اس حد ہے خرابی کہ نہ پوچھ
جانا جاتا ہے کہ اس راہ سے لشکر نکلا

جم گیا خوں کفِ قاتل پہ ترا میرؔ زبس
اس نے رو رو دیا کل ہاتھ کو دھوتے دھوتے

منعم نے بنا ظلم کی رکھ کر گھر تو بنایا   پر آپ کوئی رات ہی مہمان رہے گا

گر پرستش خدا کی ثابت کی
کسو صورت میں ہو بھلا ہے عشق

کس کو کہتے ہیں نہیں میں جانتا اسلام و کفر
دیر ہو یا کعبہ مطلب مجھ کو تیرے در سے ہے

مت رنجہ کر کسی کو کہ اپنے تو اعتقاد   دل ڈھائے کر کعبہ بنایا تو کیا ہوا

غلط تھا آپ سے غافل گزرنا   نہ سمجھے ہم کہ اس قالب میں تو تھا

آدم خاکی سے عالم کو جلا ہے ورنہ   آئینہ تھا تو مگر قابلِ دیدار نہ تھا

گل ہو مہتاب ہو آئینہ ہو، خورشید ہو میرؔ
اپنا محبوب وہی ہے جو ادا رکھتا ہے

دور بیٹھا غبار میرؔ اس سے   عشق بن یہ ادب نہیں آتا

مختصراً میر کی شاعری میں جاگیرداری نظام کے خلاف احتجاج حسن اور عشق کا پاکیزہ اور ہمہ گیر تصور، فطرت سے ہم آہنگی، حزن اور درد کی لَے، داخلیت وسیع المشربی، انسان کی عظمت، خودداری اور بلند حوصلہ، قلندرانہ شان کے جذبات بھرپور روپ میں نظر آتے ہیں۔ اسلوب میں سادگی اور پرکاری، ندرت نشتریت، ایجاز، موسیقیت، محاوروں، تشبیہوں اور استعاروں کا استعمال اور عوام کی زبان میں بات کہنے کا سلیقہ پایا جاتا ہے۔ خود میر نے کہا ہے۔

شعر میرے ہیں گو خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

میر کے پہلے اور ان کے ہم عصر ہندی شاعر ریتی کال کے شاعر کہلاتے ہیں ان شاعروں کا غالب رجحان سنسکرت کے اچاریوں کے ذریعہ شعری تخلیقات کے لئے مقرر کئے گئے اصولوں کی نقل کرنا تھا۔ اس کی ایک شکل ریتی کرم (عملی تقلید) کی تخلیقات کی تھی جن میں شاعر النکاروں (صنائع و بدائع) اور گنوں (شعری محاسن) کے وسیلہ سے صرف شعروں

کی تشریح کرتا ہے یا مثال دے کر شعر لکھتا ہے وہ مثالیں زیادہ تر سنسکرت کے کلاسیکی شاعروں سے مستعار ہوتی تھیں۔ اس طبقے میں جسونت سنگھ، یعقوب خاں، رسک سومتی، دلپتی رائے، ونشی دھر، گووند اور رس روپ کی کچھ تخلیقات شامل ہیں۔ اس ریتی بدھ (روایت پسند) شاعری کی دوسری شکل لکشنوں (محاسن شعری) اور ان کے مطابق وسیلے مثالوں کی طبع زاد تخلیق میں ظاہر ہوئی، چنتامنی، متی رام بھوشن داس، کل پتی، شری پتی پدماکر اور گوال وغیرہ کی تقلیدی یا روایت پسند شاعری اسی خانے میں آتی ہے۔

تیسری شکل میں لکشنوں (محاسن شعری) کو اہمیت نہیں دی گئی سنسکرت کے شعری اصولوں کے دائرے میں رہتے ہوئے بھی اس طبقہ کے شاعروں نے لکشنوں (محاسن شعری) کے بجائے شاعرانہ تخلیق پر زیادہ زور دیا ہے۔ بہاری، متی رام، بھوپتی، چندن، بھٹی جی، آچاریہ دیو، بھکاری داس، سید غلام نبی بلگرامی، رسلین اس اسلوب کے نمائندے شاعر ہیں۔ یہ شاعر بنیادی طور پر شرنگار (تغزل) کے شاعر ہیں۔

مختصراً ریتی بدھ یا (روایت پسند) شاعری پر شرنگار رس، نایک، نایکا بھید اور النکاروں کے استعمال کا اسلوب حاوی تھا۔ ریتی کال میں ریتی بدھ (روایتی) شاعری بنیادی رجحان ہے۔

ظاہر ہے کہ ہندی کی ریتی بدھ شاعری اور میر کی شاعری میں کوئی مماثلت نہیں ہے۔ ریتی بدھ کی شاعری بنیادی طور پر درباری تہذیب کے زیر اثر پروان چڑھی تھی۔ یہ شاعری اردو میں جرأت اور ناسخ کے لکھنوی دبستان کی اردو شاعری سے زیادہ قریب ہے۔ جیسے لکھنؤ دبستان کی اردو شاعری میں تصنع اور بناوٹ، شرنگار (صنائع و بدائع (النکاروں) پر زور (جنسی معاملہ بندی، وغیرہ کا اظہار ہوا ہے۔ وہی بات ریتی بدھ ہندی شاعری میں بھی نظر آتی ہے۔ یہ دونوں دھارے سیاسی سطح پر مغلوں سے سیاسی خود مختاری لیکن تہذیبی معاملوں میں ان کی نقل کرنے یا ان سے آگے بڑھ جانے کی نوابوں اور رجواڑوں کی ذہنیت سے پھوٹے تھے۔

ریتی بدھ (روایت پسند) شاعری کے برخلاف ایک متوازی دھارا اس دبستان کا تھا جسے ریتی مکت یا غیر تقلیدی غیر روایتی شاعری کہا جاتا ہے۔ ریتی مکت (غیر روایتی) شاعری کی اہم خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) اس دھارا کے شاعروں نے اپنی ذاتی شعری آدرشوں کا اظہار کیا۔ انھیں اپنے زمانے کے ریتی بدھ شعری آدرشوں سے الگ سمجھا گھنانند نے خاص طور پر اپنے شعری آدرشوں کا شد و مد کے ساتھ اعلان کیا۔ ان کی شعری دنیا جذبوں میں ڈوبی ہونے کی وجہ سے داخلی زیادہ ہے۔ شعوری طور پر خارجی نہیں ہے۔ جیسی کہ بہاری، متی رام، پدماکر وغیرہ کے یہاں ہیں۔ جذبے سے سرشار ہونے کی وجہ سے یہ طبقہ عقل کو شعریت سے ہم آہنگ صفت نہیں مانتا۔ گھنانند اور عالم کی شاعری میں جذبے کی تہہ داری تہہ در تہہ کھل کر آتی ہے۔

(۲) شاعروں کے عشق کے تجربے کو اظہار ذات کے اسلوب میں پیش کیا گیا ہے۔ ریتی بدھ کے شاعروں نے عاشق، محبوب یا نایک نایکہ کے وسیلے سے منصوبہ بند طریقے سے محبت کا اظہار کیا ہے لیکن ریتی مکت یا غیر روایتی شاعر اپنی نجی زندگیوں میں عشق سے مجروح ہوئے تھے۔ یوں تو اظہار ذات کی روایت بھکتی کال کے ادب سے شروع ہو گئی تھی لیکن بھکتی شاعری میں شاعر عبادت کے احساس اور عشق حقیقی کے جذبات سے دو چار ہوتا تھا۔ ریتی مکت شاعری میں عشق مجازی کے دکھوں کا راستہ کھلا۔ ریتی بدھ (روایتی) شاعری میں اشیاء اور لوازمات اہم ہیں۔ ریتی مکت (غیر روایتی) شاعری میں فرد اور عشق کے اثرات ہندی میں مجازی عشق کی شاعری میں یہ نیا اسلوب تھا۔ شاید یہ فارسی شاعری کا اثر تھا۔ کیونکہ فارسی شاعری میں عاشق صیغۂ متکلم میں عشق کا اظہار کرتا ہے۔

(۳) اس اسلوب میں درد اور حزن کی لے تیز ہے۔ وصل کا بیان کم ہے اور اگر ہے تو سوز درد سے متاثر ہے۔ ریتی بدھ شاعری میں وصل کو خوشی اور ہجر کو غم کے الگ الگ خانوں میں رکھا گیا ہے۔ ریتی مکت شاعری میں وصل میں بھی رنج اور درد کا احساس چھایا رہتا ہے شاید فارسی شاعری کی روایت کا اثر یہاں بھی ہے۔ فارسی میں عشق اور غم الگ نہیں ہو پاتے۔ دوسرے اس وقت کے سماج میں مرد کے دل میں گھٹن اور غم کا احساس حاوی تھا۔ سامنتی نظام میں مرد کے درد کی داستان کو سننے والا کوئی نہ تھا۔ ان شاعروں نے درد کو اندر ہی اندر پی لینے اور اسے ظاہر نہ کرنے کا بار بار ذکر کیا ہے

یہ بے چینی عشق کے غم کے روپ میں ظاہر ہوئی یعنی ذاتی عشق کی داستانِ غم کے درون میں سماجی اضطراب بھی لہریں مار رہا تھا۔

(۴) اس داستان کی سب سے بڑی خاصیت پرانی شعری روایت کو ترک کرنا ہے۔ ریتی کال کا ادب النکاروں کی شعبدہ بازی یا نائیکا بھید یا بھاؤ بھید سے سجا ہوا ہے۔ اس طبقے کے شعرا کو نائیکا بھید کا عرفان کلاسیکی روایت سے زیادہ ہوتا تھا۔ زندگی سے کم۔ غیر روایتی شاعروں نے شعوری طور پر کوشش کی کہ النکاروں سے محفوظ رہ سکیں۔ ٹھاکر نے عام طور پر آسان زبان میں شعر کہے ہیں۔ گھنانند کے یہاں النکاروں کا سب سے زیادہ استعمال ہوا ہے لیکن وہ دانستہ طور پر کوشش کر کے استعمال نہیں ہوئے بلکہ جذبے کے اظہار کا حصہ بن کر۔ گھنانند نے محاورے تکشناؤ (استعاروں اور بالواسطہ اظہار) سے اظہار کا نیا راستہ بنایا۔ ٹھاکر کے یہاں بھی محاوروں کا استعمال زیادہ ہے۔ النکاروں کا کم۔ ان شاعروں کی محبوبائیں جیتی جاگتی انسان ہیں۔ ان کے موضوعات اور اسلوب دونوں روایت سے الگ ہیں۔

(۵) ان شاعروں کے عشق کا تصور اَرفع ہے اس میں بوالہوسی نہیں ہے۔ عاشق ہجر کے دکھ سہ کر بھی محبوبہ کے لئے تمنائے خیر کرتا ہے عشق کے سوز کو خاموشی کے ساتھ سہتا ہے۔ گھنانند، عالم، بودھا (۱۷۷۳ء - ۱۸۰۳ء) ٹھاکر اور دیوج دیو سب کے یہاں عشق کی انفرادیت کا اظہار ہوا ہے۔ ان کا عشق جذباتی ہے۔ جس میں حسرتوں کا غلبہ ہے۔ ریتی بدھ شاعری میں عشق پاکیزہ نہیں شعوری ہے اور ظاہری شکل و صورت کے گرد گھومتا ہے۔ اسی لئے کبھی کبھی عریانیت آ جاتی ہے۔ غیر روایتی شاعری میں احساس اور جذبے کی حکمرانی ہے ان کا عشق دشوار تر ہے۔ یہ روایت سودا اس کے یہاں بھی ہے فارسی شاعری میں بھی یک طرفہ عشق کی روایت ہے جس کا اثر ریتی مکت شاعری پر پڑا۔ ذاتی زندگی میں عشق میں ناکامی کے تجربے سے بھی یہ لوگ گذرے تھے۔ ان کا محبوب بے حد سخت دل ہے لیکن ناکامی سے عاشق مایوس نہیں ہوتا۔ اس کا عشق پختہ ہوتا ہے۔

(۶) فارسی کے شعری رجحانات کا اثر ریتی مکت شاعری کے موضوعات فکر اور اسلوب پر پڑا۔ سکھک کلا (پربندھ کاویہ طویل مسلسل نظم) کے برعکس) کا عروج تشبیہ و استعاروں میں تبدیلی، شرنگار میں نامراد محبوبہ کا بیان فارسی کے اثر کا نتیجہ ہے۔ سوئیا میں آخری مصرعہ زیادہ بھرپور اور بااثر رکھنے کا اسلوب بھی فارسی شعرا کی تقلید تھی۔ گھنانند اور عالم فارسی پر دسترس رکھتے تھے۔ گھنانند محمد شاہ بادشاہ کے میر منشی بھی تھے۔ فارسی درباری زبان تھی جس کا اثر ہندی پر پڑنا ناگزیر تھا۔ خیال میں شدت، نزاکت، انفرادیت، حزن، داخلیت، صوفیانہ رنگ، مایوسی اور یک طرفہ محبت کا اظہار فارسی روایت کی دین ہے۔

میر اور ہندی کے ریتی مکت یا غیر روایتی شاعروں کی فکر، اسلوب اور ادائگی کے انداز میں بڑی مماثلت ہے۔ دونوں کے یہاں جذبے کا زور اور شدت، نزاکت، انفرادیت، حزن، مایوسی، صوفی تصورات بالواسطہ اظہار، داخلیت، مجازی اور حقیقی عشق کا اتصال قلبی واردات کا بیان اور آزادیٔ خیال کا زور ہے۔ زبان اور اسلوب سادہ اور عوام کے محاورے سے قریب ہے۔ اس پہلو پر زیادہ تفصیل سے کام کرنے کی ضرورت ہے کہ میر اور ریتی مکت کویوں کے درمیان کتنی مماثلت اور کتنا فرق ہے۔ اور اس کے اسباب کیا ہیں۔

ریتی کال میں ویر کاویہ (شجاعانہ رزمیہ) اور نیتی کاویہ (اخلاقی شاعری) کی چھوٹی چھوٹی دھارا بھی بہہ رہی تھیں۔ ان میں بالعموم راجاؤں اور سامنتوں کی بہادری اور سخاوت کی داستانیں پربندھ کاویہ (طویل مسلسل نظموں) کی شکل میں لکھی گئی ہیں۔ اس طرح نیتی کاوی کے تحت رامائن اور مہابھارت کی کہانیوں اور دوسری دھارمک اور اخلاقی کہانیوں پر قلم اٹھایا گیا ہے جہاں ویررس کی شاعری، راجواڑوں اور مربیوں کے نمک حق ادائگی کے مقصد سے لکھی گئیں وہیں نیتی کاویہ کی شاعری جاگیردارانہ نظام میں فرد کی گھٹن کو کم کرنے کا وسیلہ بنی لیکن یہ دونوں لہریں ادبی لحاظ سے زیادہ اہمیت کی حامل نہیں ہیں۔

میر نے اپنے مربیوں کی شان میں قصیدے لکھے ہیں اور کربلا کے واقعات پر مرثیے بھی۔ لیکن میر کا بنیادی مزاج قلندرانہ تھا۔ ؎

خوش رہا جب تلک رہا جیتا
میر معلوم ہے قلندر تھا

اس لئے ان کی اخلاقی یا مذہبی نوعیت کی شاعری یا دیسوں کی شان میں لکھے گئے قصیدوں میں پھیکاپن ہے۔ دراصل اردو شاعری کا مزاج زیادہ وسیع المشرب ہے جہاں اخلاقی یا مذہبی شاعری کی گنجائش کم رہی ہے۔ اس لئے میرؔ کو ریتی کال کے یا بھکتی کال کے شاعری کے مقابلہ میں پرکھا جانا دونوں کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔

میرؔ اور ریتی کال کے ہندی کویوں کے درمیان ایک نمایاں فرق قابل غور ہے ریتی کال کے کویوں نے عام طور پر کھڑی بولی کے بجائے برج بھاشا کو اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا میرؔ کی زبان کھڑی بولی کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ موجودہ زمانے کی ہندی کا ڈھانچہ کھڑی بولی نے مہیا کیا ہے اور موجودہ عہد کی اردو کا بھی۔ یہ الگ سے مطالعہ کا موضوع ہے کہ میرؔ کے ہم عصر ہندی کے ریتی کال کے کویوں نے کھڑی بولی کا استعمال کیوں نہیں کیا۔ کیا وہ یہ اندازہ نہیں لگا سکے تھے کہ ان کے ہم عصر میرؔ صاحب کا فرمایا ہوا ہی آگے چل کر ہندوستان میں مستند ہونے والا ہے۔



ؔ اس مضمون کی تیاری میں ڈاکٹر کلپنا پرساد کے تعاون کے لئے شکرگذار ہوں۔ انھوں نے ہندی شاعری کے سمجھنے میں بڑی مدد دی۔

(الف انصاری)

کتابیات:

ؔ Paul Kennedy, The Rise and fall of the great Powar (1989) Fontana Press, London, P 189 – 193

ؔ علی سردار جعفری "پیغمبران سخن" (۱۹۸۷ء) ریڈ شاٹ ببلی کیشن بمبئی ص ۱۲۲-۸۰۔

(۳) ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی "میر تقی میر حیات اور شاعری" (۱۹۵۴ء) انجمن ترقی اردو ہند۔ علی گڑھ

(۴) ڈاکٹر نگیندر "ہندی ساہتیہ کا اتہاس" ۱۹۹۱ء میور پیپر بیکس نوئڈا۔

(۵) ڈاکٹر وے وینکٹ رمن راؤ، ریتی کالین کاویہ کی سانسکرتک پرشٹھ بھومی (۱۹۷۲ء) متھرا جواہر پستکالیہ۔

(۶) ڈاکٹر راج کشور پانڈے "ہندی ساہتیہ کا اتر" مدھیہ یگ (۱۹۷۱ء) ہندی ساہتیہ بھنڈار، لکھنؤ

معتقد کون نہیں ..... (صفحہ ۴۴ کا بقیہ)

پر میرؔ کا یہ مصرع آگیا۔

معتقد کون نہیں میرؔ کی استادی کا

اندازِ میرؔ

اندازِ میرؔ کو ڈاکٹر عبداللہ نے پانچ حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ (۱) خلوص و صداقت (۲) معمولات کی کامیاب مصوری (۳) لب و لہجہ عام بول چال والا انداز (۴) پیرایۂ ادا کی مانوسیت (۵) صوتی محاسن۔

خلوص و صداقت کا مطلب یہ ہے کہ جذبات کی ایسی سچی و صحیح تصویر کشی جو سننے والے کے دل پر وہی اثر ڈالتی ہے جو خود شاعر کے دل میں پیدا ہوتی ہے میرؔ جب کسی جذبے کا خواہ وہ احساس الم ہو یا کیفیت نشاط ایسے انداز میں اظہار کرتے ہیں کہ سننے والے کے دل میں بھی وہی عالم و کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور یہی میرؔ کی سب سے بڑی خصوصیت ہے کہ ان کے کسی جذبے سے قاری کو بیگانگی کا احساس نہیں ہوتا ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ اپنی دلی کیفیت ہے۔ اس اظہار صداقت میں میرؔ کے لب لہجہ کو بھی بڑا دخل ہے۔ ان کا لہجہ کبھی عوامی ہوتا ہے کبھی وہ خود اپنے دل سے مخاطب ہوتے ہیں اس تخاطب کا انداز بھی میرؔ کا انداز ہے جیسے ان کو دنیا سے کچھ لینا دینا ہے نہ کہنا سننا۔ وہ اپنے حال میں مست۔ اپنے دل سے اپنے دل کی باتیں ہیں

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے
دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

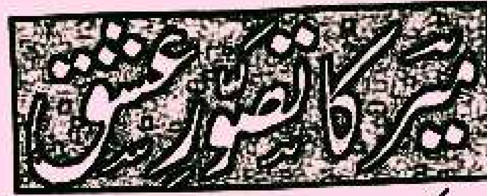
حوادث اودھے پر دل کا جانا عجب اک سانحہ سا ہوگیا ہے

نثر نظم ہر صنف میں بعد میں آنے والوں نے اپنے پیشرؤں کی نقل و تقلید کی ہے۔ فراقؔ نے بھی میرؔ کے انداز و طرز پر بہت سی غزلیں کہیں۔ اثر لکھنوی اپنے تئیں میرؔ کا وارث جانتے رہے مگر اگر ہمارے عہد میں کسی کو میرؔ کا مقلد و وارث کہا گیا (صحیح یا غلط) وہ ناصر کاظمی تھے جبکہ انھوں نے خود کہا ہے کہ ؎

میرؔ کا شیوۂ گفتار کہاں سے لاؤں

۵

وقار ناصری
۴۶۸/۴۷ شیش محل، حسین آباد، لکھنؤ ۳



میر کے شارحین اور محققین نے شعروادب کے حوالے سے میر شناسی کے جو باب وا کئے ہیں ان میں بہت کچھ ایسا ہے جو آج بھی تشریح طلب ہے اسکی وجہ صرف اتنی ہے کہ ان کی عظمت کے اعتراف کے باوجود بہت کم لوگوں نے ان کی زندگی اور شاعری کو جانچنے اور پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ غالب اور اقبال پر تو نہ جانے کتنوں نے صفحے کے صفحے سیاہ کرڈالے مگر میر یہاں بھی اپنے دل کے مرثیے لئے کھڑے رہے لیکن کسی نے ان پر توجہ نہ کی۔ اثر لکھنوی سے محمد حسن عسکری تک جن چند لوگوں نے ان کی زندگی میں تاک جھانک کرنے کی کوشش کی ہے انھیں بھی اس میر کو ڈھونڈنے میں دشواری ہوئی جس نے خود کو چھپانے اور ظاہر کرنے میں طرح طرح کے تصورات قائم کئے میر کا تصور عشق بھی ان میں سے ایک ہے جہاں میر کی تلاش گویا اس منزل کی تلاش ہے جو عشق سے عشق کی منزل ہے۔

میر کے والد علی متقی نے سب سے پہلے ان کو تعلیم دی "بیٹا عشق کرو، عشق ہی اس کارخانے میں متصرف ہے۔ اگر عشق نہ ہوتا تو نظم کل قائم نہیں رہ سکتا تھا۔ بے عشق زندگی وبال ہے۔ عشق میں جی کی بازی لگادینا کمال ہے۔ عشق بناتا ہے، عشق ہی کندن کردیتا ہے دنیا میں جو کچھ ہے عشق کا ظہور ہے۔ عشق آگ کی سوزش ہے۔ پانی عشق کی رفتار ہے، خاک عشق کا قرار ہے، ہوا اس کا اضطرار ہے۔ موت عشق کی مستی، زندگی عشق کی ہوشیاری ہے، رات عشق کا خواب اور دن عشق کی بیداری۔ مسلمان عشق کا جمال ہے، کافر عشق کا جلال ہے۔ نیکی عشق کا قرب ہے، گناہ عشق کی دوری ہے۔ جنت عشق کا شوق ہے، دوزخ عشق کا ذوق ہے۔ عشق مقام عبودیت و عارفیت و زاہدیت و صدیقیت و خلوصیت و مشتاقیت و خلیت و حبیبیت سے بہت بلند ہے۔"

(ذکر میر۔ مترجم نثار احمد فاروقی)

عشق کا یہ تصور جسے صوفیا کرام نے ہمہ اوست اور ہمہ از اوست کی بنیاد قرار دیا ہے۔ اسی کے ارد گرد سالک و سلوک کے تمام مراحل دائروں و خانقاہوں میں حجاب اکبر اور حجاب اصغر کے درمیان عشق الٰہی کے اسرار و رموز سمجھنے میں اتنا آگے نکل گئے کہ ان کے لئے عشق کہیں مزرع زندگی اور کہیں جان سے گزرنے کے علاوہ کچھ نہیں رہا۔ انا الحق کی صداؤں میں انھیں صرف یہ یاد رہا۔

عشق ایک مزرع گلاب ہے۔
اس کی پگڈنڈیاں ان کے لئے ہیں
جو عاشقوں کے قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔
عشق کی نشانیاں توفیق اور مہربانیاں
ان کی منزلیں ہیں
اور مجبوریاں غم خاموش اور برداشت
کبھی نہ ختم ہونے والا سوز، ہمیشگی اور اذیت ناکی
اس کی شان ہے۔
اس کے سوا باقی سب گم کردہ منزل
جہالت اور وحشت تنہائی
اور بے جا گردش ہے
عشق مزرع زندگی ہے

(دشت سوس۔ جمیلہ ہاشمی)

مگر میر کا عشق صوفیا سے متاثر ہونے کے باوجود اس طرح کے عشق کا جویا نہ تھا۔ ان کا عشق تو انسانی جذبات، جسمانی تقاضوں،

ہجر و وصال اور ان انسانی رشتوں کی جستجو تھا جو صدیوں سے انسان کے دل کی دھڑکن ہتے۔ اس عشق نے تو خود انھیں اس جنون میں مبتلا کر دیا تھا۔ ہ چاندنی رات میں ایک پیکر خوش صورت کمال خوبی کے ساتھ کرۂ قمر سے میری طرف بڑھتا اور مجھے بے خود کر دیتا تھا۔ جدھر بھی میری آنکھ اٹھتی اسی رشکِ قمر پر پڑتی۔ جس طرف بھی دیکھتا تھا اسی غیرت حور کا تماشا کرتا تھا۔ میرے گھر کے در و بام اور صحن (گویا) ورقِ تصویر ہو گئے تھے یعنی شش جہت میں وہی حیرت افزا (چہرہ) نظر آتا تھا کبھی چودھویں کے چاند کی طرح سامنے ہوتا۔ کبھی منزل دل اس کی سیرگاہ ہوتی اگر گل مہتاب پر نظر پڑ جاتی تو گویا جان بے تاب میں آگ سی لگ جاتی ہر رات اس سے صحبت رہتی اور ہر صبح اس بن وحشت رہتی۔ جب سفیدۂ سحر نمودار ہوتا تو وہ جلے دل سے ٹھنڈی آہ بھرتی۔ یعنی ایک آہ بھر کر چاند کی طرف واپس ہو جاتی۔ میں تمام دن جنون کرتا اور اسکی یاد میں دل کو خون کرتا۔ دیوانہ و مست کی مانند کف بر لب ہاتھوں میں پتھر لئے پھرتا۔ میں افتاں، خیزاں اور لوگ مجھ سے گریزاں۔

چار مہینے تک وہ گل شب افروز نت نئے گل کھلاتا رہا اور اپنے فتنۂ خرام سے قیامت ڈھاتا رہا ناگاہ موسم بہار آیا۔ جنون کے داغ (اور بھی) ہرے ہو گئے یعنی میں آسیبی سا ہو گیا اور مطلق کسی کام کا نہ رہا بس وہ خیالی صورت نظر میں اور اس کی مشکیں زلفوں کا دھیان سر میں لائق گناہ گیری ہو گیا یعنی زندانی و زنجیری ہو گیا۔"

(ذکر میر۔ مترجم نثار احمد فاروقی)

عشق کی اس کڑی کو میر نے چاند میں ایک صورت نظر آنے کی بات کہہ کر پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس جنون کے پیچھے کوئی مہوش ضرور تھا۔ اب یہ خان آرزو کے گھر یا خاندان کی کوئی لڑکی ہو یا کوئی اور ماہ پارہ مگر اس سے ایک بات ضرور واضح ہو جاتی ہے کہ صوفیانہ میلان کے باوجود میر کا عشق میر کا عشق تھا۔ نہ کہ ان کے والد علی متقی کا عشق جو کہتے تھے عشق الٰہی کو اپنا پیشہ کرو۔ یہ میر کا اپنا عشق تھا۔

لیتے ہی نام اس کا سوتے سے چونک اٹھے ہو
ہے خیر میر صاحب کچھ تم نے خواب دیکھا

پیار کرنے کا جو خوباں ہم پہ رکھتے ہیں گناہ
ان سے بھی تو پوچھتے کیوں اتنے تم پیارے ہوئے

گلی میں اس کی گیا سو گیا نہ بولا پھر
میں میر میر کر اس کو بہت پکار رہا

یہ سچ ہے کہ میر یار باش نہیں تھے ہر کسی سے ملاقات ان کا شیوہ نہ تھا مگر وہ آدم بیزار بھی نہیں تھے۔ ابدالی کے حملوں، جاٹ اور مرہٹہ گردی نے ہر چند دلی کی صورت بگاڑ دی تھی۔

اے مصحفی اس کا کروں مذکور کہاں تک
اوصاف تو یہ گلشن دہلی میں خزاں تھے

مگر پھر بھی دلی کو وہی مرکزیت حاصل تھی جو زمانۂ سلطنت اور مغلیہ دور میں اس کا طرۂ امتیاز تھی۔ میلے ٹھیلے، رقص و سرود اور دوسرے معمولات اسی طرح جاری تھے جیسے پہلے ہوتے آئے تھے۔ شاعروں اور مراختوں کی دھوم تھی۔ میر سجاد، میاں صلاح الدین، میاں کمترین، میاں علی نقی، حافظ حلیم، میر درد اور خود میر کے ہاں ہر ماہ مشاعرہ ہوتا تھا۔ قزلباش خاں امید، میاں شرف الدین مضمون، محمد شاکر ناجی، اشرف علی خاں پیام، محمد حسین کلیم، میر سجاد، کرم اللہ خاں درد، میاں سعادت علی خاں سعادت، اشرف علی فغاں، میر گھاسی، میر حسن حسن، میر عبد الحیٔ تاباں اور دیگر شعرائے دہلی سے میر کے خاصے مراسم تھے۔

عشق کے موضوع کے درمیان یہ چند سطریں محض اس لئے ہیں کہ یہ غلط فہمی دور ہو جائے کہ میر انسانوں میں رہ کر انسانوں سے دور تھے۔ وہ اسی سماجی زندگی کا حصہ تھے جس میں حسن و عشق، عورت مرد کے جنسی تعلقات حتیٰ کہ امرد پرستی تک کے بہانے موجود تھے۔

دل عجب شہر تھا خیالوں کا
لوٹا مارا ہے حسن والوں کا

اے عشق بے محابا تو نے تو جان مارے
ٹک حسن کی طرف ہو کیا کیا جوان مارے

حسن اے رشک مہ نہیں رہتا
چار دن کی ہے چاندنی یہ بھی

کام تھے عشق میں بہت پر میر
ہم ہی فارغ ہوئے شتابی سے

وصل اس کا خدا نصیب کرے
میر دل چاہتا ہے کیا کیا کچھ

وصل میں رنگ اڑ گیا میرا
کیا جدائی کو منہ دکھاؤں گا

لیٹ کر سونے سے شب کے کبھی پھولوں کی جو بد ھی
تو کیا ہو کر وہ جھگڑالو گلے کا ہار اٹھ بیٹھا

ساتھ کے پڑھنے والے فارغ تحصیل علمی سے ہوئے
جہل سے مکتب کے لڑکوں میں ہم دل بہلاتے ہیں ہنوز

میر کی مثنویوں، شعلۂ عشق، دریائے عشق، معالاتِ عشق، جوشِ عشق، اعجازِ عشق اور درحالِ عشق میں معاملاتِ عشق اور اعجازِ عشق کے ابتدائیہ چند اشعار کو چھوڑ کر جو خدا رسول اور خاندانِ رسولؐ سے عشق پر مبنی ہیں باقی سارے اشعار اسی عشق کی کہانی ہیں جو عورت مرد کی محبت کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔

محبت نے ظلمت سے کاڑھا ہے نور
نہ ہوتی محبت نہ ہوتا ظہور
محبت مسبب محبت سبب
محبت سے آتے ہیں کارِ عجب
شعلۂ عشق

عشق ہے تازہ کار و تازہ خیال
ہر جگہ اس کی اک نئی ہے چال

دل میں جا کر کہیں تو درد ہوا
کہیں سینے میں آہ سرد ہوا
دریائے عشق

عشق سے رنگ زرد ہوتا ہے
عشق سے دل میں درد ہوتا ہے
رہتے ہیں عشق ہی میں مژگاں تر
یہیں دیکھی ہیں آنکھیں آتے بھر
معاملات عشق

یعنی میر اک خستۂ غم تھا
سرتاپا اندوہ و الم تھا
آنکھ لڑی اس کی اک جا گہہ
بے خودی ہو گئی بے جان آگہہ
جوشِ عشق

نہ ہے عشق نیرنگ سازی تری
کہ ہے کھیلنا جی پہ بازی تری
تجھی سے ہے آب رخ زرد زرد
تجھی سے مرے دل میں اٹھتا ہے درد
اعجاز عشق

عشق اپنا آپ ہی شیدا ہوا
تھا جو پنہاں پردے میں پیدا ہوا
نظم کل کا ڈول ڈالا عشق نے
انس سے انساں نکالا عشق نے
درحالِ عشق

عشق کے ان احساسات کے بعد یہ کہنا کہ میر صرف درد و غم اور بہتّر نشتر کے شاعر ہیں میر کو اس میر سے جدا کر دیتا ہے جس کے گواہ خود میر کے اشعار ہیں۔ میر کے کلیات کا مطالعہ کئے بغیر اس طرح کے فیصلے میر شناسی میں کتنے معاون ہیں یہ تو وہی بجھ سکتے ہیں جنہوں نے بہتّر نشتر کا توشہ چھوڑ کر ہمیں اس میر سے دور کرنے کو شش کی ہے جس کے اشعار میں زندگی کا ہر رنگ موجود ہے۔ بہتر پچھتر برس

قبل "کبھی سرکاؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ" لکھنے والے شاعر فانی بدایونی میر سے کم پریشان نہیں رہے لیکن وہ جس شہر سے گذرے وہاں محبت کی نئی داستان چھوڑ آئے۔ میر کے عشق کو سمجھنے کے لئے سلیمان شکوہ کا یہ شعر ہی بہت ہے۔

دربار میں کرے ہے بیاں اپنے عشق کا
دیکھو تو اس بڑھاپے میں تم میر کی ہوس

میر نے کتاب عشق رقم کرنے کے لئے صرف خیالی پیکروں کا سہارا نہیں لیا بلکہ انھوں نے اٹھارہویں صدی کے اس معاشرہ میں کہ جہاں جہاں دار شاہ، لال کنور، شاہ عالم اور عزیزن کے عشق کے قصے مشہور ہوں نہ جانے کیا کیا اپنی آنکھوں سے دیکھا اور کانوں سے سنا ہوگا۔ میر کے لئے عشق کے یہی تجربے تھے جو ان کے اشعار میں ڈھل کر ہجر و وصال کے افسانے بن گئے ان میں ان کے عشق کی وہ کہانیاں بھی شامل ہیں جن کو کہنے کے لئے انھوں نے ایک ایسا شعری نظام تراشا جس کی معنویت عشق کے نئے نئے مفہوم دیتی ہے۔

میر نے "دریائے عشق" میں جو عشقیہ داستان نظم کی ہے اس سے ملتی جلتی کہانی سید حسین شاہ حقیقت شاگرد جرأت نے ۹۷-۱۷۹۶ء کے درمیان "جذب عشق" کے نام سے نثر میں لکھی تھی۔ حقیقت کے برادر کلاں سید حسن شاہ ضبط ہیں جن کا فارسی ناول "نشتر" ہے جس کا اردو ترجمہ انجم حسین کسمنڈوی نے کیا تھا۔ دریائے عشق اور جذب عشق دونوں میں نوجوان عاشق تالاب میں ڈوب جاتے ہیں اس کے بعد ان کی محبوبائیں بھی خود تالاب میں ڈوب جاتی ہیں۔ جال سے لاشیں نکالنے پر دونوں قصوں میں لاشیں اس طرح باہر نکلتی ہیں کہ باہم ایک دوسرے سے پیوست ہیں۔ میر نے دریائے عشق میں اس کیفیت کو یوں نظم کیا ہے۔

نکلے باہم ولے موئے نکلے — دونوں دست و بغل ہوئے نکلے
ربط چسپاں بہم ہویدا تھا — مر گئے پھر بھی شوق پیدا تھا
ایک کا ہاتھ ایک کی بالیں — ایک کے لب سے ایک کو تسکیں
جو نظر ان کو آن کرتے تھے — ایک قالب گمان کرتے تھے
کیا کھوں مل رہے وہ وصلی دار — ہم دگر سے جدا ہوئے دشوار
کیوں نہ دشوار ہووے ان کا فصل — جان دے دے ہوا ہو جن کا وصل
حیرت کار عشق سے مردم — شکل تصویر آپ میں تھے گم

جذب عشق کے آغاز میں سید حسین شاہ حقیقت نے بتایا ہے کہ یہ سچا واقعہ ۱۲۰۴ھ مطابق ۹۰-۱۷۸۹ء میں موضع سیری میں جو قصبہ چھاتا سے متصل پرگنہ برندابن میں واقع ہے پیش آیا ہے۔ جذب عشق آصف الدولہ کے دور اختتام یعنی ۹۷-۱۷۹۶ء میں مکمل ہوئی حقیقت اور میر دونوں اس وقت لکھنؤ میں تھے۔ ہو سکتا ہے کہ میر نے جذب عشق کو پڑھا ہو یا پانچ چھ برس میں اس واقعہ کی شہرت اتنی ہو گئی ہو کہ ہر طرف اس کا شہرہ ہو گیا ہو۔ بہر حال میر کی مثنوی دریائے عشق اور جذب عشق میں تھوڑی بہت مماثلت خاص کر اختتام میں ایسی ہے کہ دونوں میں بیان کیا گیا قصہ ایک ہی لگتا ہے۔ دونوں قصوں کا حوالہ دینے کی ضرورت اس لئے پڑی کہ لوگ میر کی عشقیہ شاعری کو ان کی وحشت کا قصہ نہ سمجھیں۔ اس میں وہ زمینی سچائی بھی موجود ہے جو اٹھارہویں صدی کے دلی اور لکھنؤ کی سماجی اور تہذیبی زندگی کا آئینہ ہے۔ اس آئینے میں دلی کے اوراق مصور جیسے کوچے ہوں یا لکھنؤ کے پری خانے یہ سب اس دور انتشار کے اس عشق کی داستاں ہیں جس کو میر نے بار بار اپنے اشعار میں بیان ہی نہیں کیا بلکہ اس حقیقت کو بھی بیان کیا ہے کہ چاہے صوفیہ کا عشق ہو یا عام انسانوں کا عشق دنیا میں ہر طرف عشق ہی عشق ہے۔

عشق ہی عشق ہے جدھر دیکھو
سارے عالم میں بھر رہا ہے عشق



عشق وہ ہے کہ جو تھے خلوتیِ منزلِ قدس
وہ بھی رسوائے سر کوچہ و بازار ہوئے

اپنے جی ہی نے نہ چاہا کہ پئیں آبِ حیات
یوں تو ہم میر اسی چشمے پہ بے جان ہوئے

— میر

فیاض رفعت
۲۸/۳۴۳، ایلڈکو گرینس ڈریم ولا، گومتی نگر، لکھنؤ ۱۰

کچھ شعر فہمی اور میر شناسی کے بارے میں

آج ہمارا موضوع سخن میر ہیں جو عام طور پر خدائے سخن کے طور پر مشہور و ممتاز ہیں اور ہمارے طالب علمی کے زمانے میں جن کے بہتر نشتر کافی شہرت رکھتے تھے۔ جب ہم بی اے میں آئے اور اردو کو اختیاری مضمون کے طور پر اختیار کیا تو ہمارا سابقہ رشید احمد صدیقی، آل احمد سرور مجنوں گورکھپوری، خورشید الاسلام، نسیم احمد قریشی اور معین احسن جذبی سے ہوا۔ شاعری کا سبق جذبی صاحب پڑھاتے تھے وہ خود بہت مشہور شاعر تھے اور ان کے دو چار شعر ہمیں بھی یاد تھے۔ جنھیں ہم موقع بے موقع پڑھتے رہتے تھے۔ یوں تو ہمارے سبھی استاد ادب و شاعری کے اعلا درجے کے شناور تھے مگر ہمیں خصوصی طور پر معین احسن جذبی بطور استاد زیادہ اپیل کرتے تھے۔ ان کی شخصیت کی وجدانی کیفیت ان کا استغراق تھا۔ معنی کی تہیں کھولنے اور طرفیں روشن کرنے میں وہ لاجواب تھے۔ میر و غالب کی غزلوں کی تشریح وہ ایسے ببک انداز میں کرتے کہ ایک ایک لفظ نقش کی صورت ذہن و دل پر ثبت ہو جاتا۔ میر نے بظاہر سہل ممتنع میں بے شمار اشعار کہے ہیں۔ پہلی قرأت میں وہ ہمارے حواس پر چھا جاتے ہیں۔ جذبی صاحب کی خوبی یہ تھی کہ وہ کبھی شعر کی تشریح کرتے تو موجودہ لفظ کے بطون سے نئے لفظ و معنی کی کہکشاں کی جستجو و تلاش میں سرگرداں نظر آتے۔ ان دنوں ہم استعارے اور مضمون کے فرق سے واقف نہیں تھے جذبی صاحب نے بتلایا۔ یا پھر ہم اس طرح سمجھے کہ شاعر کے اسلوب ہی سے معنی آفرینی اور مضمون آفرینی کا جہان تازہ آباد ہوتا ہے اور استعارہ اسے نمایاں کرنے میں ممد و معاون ہوتا ہے اور شاعر کے اسلوب کو سمجھنے کے لئے لازم ہے کہ اس کے تخلیق کردہ اشعار کی بار بار قرأت کی جائے۔ ایک ایک لفظ کے نہائے اشارے اور در و بست کو سمجھا جائے یعنی لفظوں کی ترتیب اور قرأت سے کئی طرح کی آوازیں پیدا ہوتی ہیں۔ جذبی صاحب نے ہمیں یہ بھی درس دیا کہ شعر کے ظاہری معنی پر اصرار کرنے کے بجائے شاعر نے ماورائے سخن جو کہا ہو اسے اپنی شعری جمالیات کا حصہ بنائیں اور اپنے طور پر معنی و مفاہیم کی تلاش و جستجو سے کام لیا جائے۔

ان کے علاوہ خلیل الرحمٰن اعظمی نے میر کے رنگ میں غزلیں کہہ کر ہمیں باور کرایا کہ ماضی کے ورثے کو گلے لگائے بغیر شعر کی سچی تعبیرات تلاش کرنا ممکن نہیں اور یہ کہ ہر بڑا شاعر اپنے عہد کے علاوہ مستقبل پر اپنے اثرات مرتب کرتا ہے۔

آل احمد سرور کی ریڈیائی تقریروں کا انتخاب، تنقیدی اشارے ہمارے نصابیات کا حصہ تھی۔ وہ پروفیسر ہو کر لکھنؤ سے علی گڑھ آئے تو ان سے بھی ادب کو سیکھنے سمجھنے کا موقع نصیب ہوا۔ سرور صاحب شاگردوں کے ساتھ ایک خاص طرح کا فاصلہ قائم رکھتے تھے یعنی جذبی صاحب کی ضد تھے۔ وہ کبھی کبھی کلاس میں آجاتے اور جو ان کا جی چاہتا پڑھنا شروع کر دیتے۔ ان کے پڑھانے کا انداز قطعی غیر نصابی تھا مگر ان کا کمال یہ تھا کہ وہ جو بات بھی کہتے وہ دل میں اتر جاتی۔ انھیں بے شمار اشعار یاد تھے۔ وہ خود بھی شاعر تھے اور ان کے ذوق و جستجو کی جتنی بھی داد دی جائے وہ کم ہے بعد میں جب ذرا ہمارا شعور بالغ ہوا اور ہمیں تھوڑا بہت سلیقہ آیا تو ہم نے حسین عسکری کی چھوٹی سی کتاب آدمی اور انسان پڑھی۔ ساقی کراچی کے پرانے شمارے نکال کر جھلکیاں پڑھیں۔ ایسی ادب کے تعلق سے دانشور اور دانشوری کی نفسیات روشن ہوئیں غرض یہ کہ مغربی شعریات کے اصول و ضوابط کہیں کہیں سے سمجھ میں آنے لگے۔

انہی دنوں علی گڑھ میگزین میں ڈاکٹر سید عبداللہ کے میر پر مضامین پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ مضامین پر تنقیدی رائے قائم کرنے میں ہمیں خاصہ تامل ہے وجہ تسمیہ کیا بیان کریں کہ ہمیں اپنی دانائی و بینائی کا غرّہ نہ کبھی پہلے تھا نہ اب ہے۔ ایک قاری کی حیثیت سے ہم تو محض اتنا جانتے ہیں کہ اگر آپ کی تخلیق مسرت بخش اور دل آسا ہے تو بس سمجھ لیجئے کہ آپ داد کے مستحق ہو گئے۔ اور اگر آپ کی تخلیق (شعر، افسانہ، انشائیہ کچھ بھی ہو سکتا ہے) مسرت کے ساتھ ساتھ بصیرت بھی فراہم کرتی ہے تو آپ کا لکھا نقش بر آب قرار دینے میں لوگوں کو عزیمت کا احساس ہوگا۔ اور وہ آپ کی قدر افزائی کو لازم جانیں گے۔ شعر فہمی کے لئے صحیح شعر خوانی بھی لازم امر قرار دی گئی ہے اور شعر خوانی کے لئے لفظوں کی پرکھ اور پہچان کے مشکل مرحلہ سے گزرنا پڑتا ہے۔ لفظوں کی موزوں ترین ادائگی اسی وقت ممکن ہے کہ آپ لفظ کی تہہ در تہہ معنویت سے آشنا ہوں چونکہ اردو لکھتے وقت اعراب و اوقاف سے گریز کیا جاتا ہے۔ خصوصاً اشعار کی قرأت کے وقت موزوں ترین ادائگی کے لئے یا تو آپنے اساتذہ سے تربیت حاصل کی ہو یا پھر کلاسکی شعری نظام کی تاریخ و تہذیب پر آپ کی عمیق نگاہ ہو۔ کون سا لفظ کس طرح ادا کیا جائے اس نازک ترین ہنر سے شعر کی تعبیر و تشریح میں آسانی پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک لفظ کی ایک سے زیادہ جہات ہوتی ہیں جو خصوصی طور پر شعر میں طلسم جیسی کیفیت پیدا کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوتی ہیں۔ شعر میں اس طلسم اور اسرار کو سمجھنے کے لئے لفظوں کے در و بست پر ماہرانہ قدرت اسی وقت ممکن ہے جب آپ جستہ جستہ لغات کا مطالعہ کرتے رہتے ہوں ورنہ شعر آپ کے سر سے گذر جائے گا۔ یہاں ہم شمس الرحمٰن فاروقی کے حوالے سے میر کے دیوان ہشتم سے ایک شعر درج کرتے ہیں۔

فلک نے پیس کر سُرمہ بنایا
نظر میں اسکی میں تو بھی نہ آیا

اب شعر کی تشریح، تفسیر و تعبیر ملاحظہ فرمایئے۔ فاروقی صاحب نے کیسی فاضلانہ تشریح کی ہے جس سے ان کی شعری جمالیات کی نیرنگی کے ساتھ ساتھ لفظوں کی معنوی کائنات بھی روشن ہوتی چلی جاتی ہے۔

یہاں بھی اگرچہ "سرمہ" اور "نظر میں آنا" کی ظاہری رعایت سامنے کی ہے لیکن دراصل یہ مناسبت کا شعر ہے اور اس کے قرینے دور کے ہیں۔

۱. نظر میں آنا = توجہ کو اپنی طرف کھینچنا
۲. نظر میں آنا = دکھائی دینا
۳. نظر = آنکھ۔ نظر میں آنا = آنکھ میں لگنا (یعنی سرمہ کا آنکھ میں لگایا جانا۔
۴. آنکھ میں سرمہ لگتا ہے، تو آنکھ کی روشنی بڑھتی ہے یا آنکھ صحت مند ہوتی ہے۔
۵. آسمان کی آنکھ مریض ہے غالباً وہ
۶. یرقان زدہ ہے۔ یرقانی آنکھ کو چیزیں زرد نظر آتی ہیں سرمہ اسے کیا دکھائی دے گا۔
۷. آسمان نے مجھے سرمہ تو بنا دیا لیکن نہ اس کی بینائی بڑھی اور۔
۸. نہ وہ پھر دیکھ سکا کہ اس نے پیس پیس کر کسی چیز کو سرمہ بنا دیا ہے۔

یہ بھی خیال رکھیں کہ "فلک" اور "پیس کر" میں بھی مناسبت ہے کیونکہ آسمان کو چکر کھاتا ہوا فرض کرتے ہیں اور اسے اکثر "آسیا" (یعنی چکی) سے تشبیہہ بھی دیتے ہیں۔ لہٰذا آسمان نے متکلم کو محض از راہ سنگدلی پیسا بلکہ پیسنا اس کا کام ہی ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ سب مناسبتیں ایک جیسی پیچیدہ نہیں ہوتیں لیکن سب شعر بھی ایک جیسے معنی خیز نہیں ہوتے۔ اصلی بات یہ ہے کہ جب مناسبت ہوگی تو معنی زیادہ مضبوط اور وسیع اور بہتر نکلیں گے۔

فاروقی صاحب نے ایہام، رعایت اور مناسبت شعری پر اپنے غالب خطبہ اردو غزل کے اہم موڑ میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور شعر کی عربی فارسی روایت کے پس منظر میں معنی آفرینی اور مضمون آفرینی کا سراغ لگایا ہے اور دونوں کے بیّن فرق کو

واضح کیا ہے۔ اس کی دیگر عالمانہ کتابوں میں شعر، غیر شعر اور نثر کا مطالعہ بھی سود مند ثابت ہوگا۔ انھوں نے جہاں غالب کی بھی سیر کی ہے اور میر کے کوچے میں بھی دن رات گزارے ہیں۔ شعر شور انگیز ان کا ایسا کارنامہ بے مثالی ہے جسے تا دیر یاد رکھا جائے گا۔ ڈھائی ہزار صفحات پر مشتمل شعر شور انگیز کی چار جلدیں میر شناسی کے ساتھ ساتھ عملی تنقید کا بھی بہترین نمونہ ہیں۔ جیسا ابوالکلام قاسمی نے اپنی کتاب شاعری کی تنقید میں ایک باب شعر شور انگیز پر نقد و نظر کی صورت میں پیش کیا ہے انھوں نے بڑی عرق ریزی اور جانفشانی کے ساتھ نقد میر سے متعلق فاروقی کی ساعی جمیلہ کو سراہنے کے ساتھ ساتھ ان سے اختلاف کی گنجائش بھی نکالی ہے۔

فاروقی نے منشاء مصنف کو سب کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی مصنف کی حیثیت کو رولاں بارت کی طرح قابل تردید و تنسیخ نہیں بتاتے۔ اس ضمن میں فاروقی کی شخصیت نہایت آزاد تنقیدی فکر کے مالک کی حیثیت سے ابھرتی ہے وہ دریدا کے لاتشکیلی نقطۂ نظر والے لازمی طور پر منشائے مصنف کے خلاف معنی ڈھونڈنے کے رویے سے بھی اختلاف کرتے ہیں اور خود کو اور رولاں بارت کے انتہا پسندانہ تصورات سے بھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ فاروقی منشائے مصنف کو سب کچھ نہیں سمجھتے مگر وہ یہ بھی کہتے ہیں۔

"متن بنانے والے کی حیثیت سے مصنف ناقابل تردید و تنسیخ ہے۔ اصل متن کیا ہے؟ یا کیا ہونا چاہئے۔ ان سوالوں کے جواب میں مصنف کا فیصلہ آخری ہے۔"

لیکن اس موقع پر یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ اگر متن بنانے والے کی حیثیت سے مصنف کی کوئی اہمیت ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم قاری کی حیثیت سے اس کے مدعا کے اسیر ہو کے رہ جائیں جبکہ صورت حال یہ ہے کہ بجائے خود نہ کسی بھی مصنف کے مدعا کا تعین آسان ہے اور نہ ہمیں اس مدعا سے زیادہ سروکار ہونا چاہئے۔

فاروقی صاحب نے میر پر جو پرشکوہ کام کیا ہے اس کی عظمت سے کوئی منکر نہیں مگر ان کے مقدمات سے کلی اتفاق کرنا لازم نہیں منشائے مصنف سے قطع نظر قاری اساس تنقید کی بھی اپنی جگہ بڑی اہمیت ہے۔ مابعد جدیدیت کے مفکرین نے تو مصنف کی موت کا اعلان کر دیا ہے گو کہ یہ انتہا پسندانہ اعلان ہے مگر کلی طور پر حوادث سے خالی نہیں۔ تخلیق کا اپنا ایک الگ وجود ہوتا ہے جو مصنف سے ہم رشتہ ہو بھی سکتی ہے اور نہیں بھی۔ عالم سکرات میں جو شعر وجود میں آتے ہیں ان کی تشریح و توضیح سے تو شاعر بھی قاصر رہتا ہے اور پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ شاعر نے جو متن بنایا ہے وہ کلی طور پر اس کے مافی الضمیر کا آئینہ دار ہو۔ ان تمام مفروضات کے باوجود فاروقی صاحب کی بے مثل ذکاوت و ذہانت نے اطلاقی تنقید کے دبستان میں نئے شگوفے کھلائے ہیں اور ان کے علم و فضل کے بسط و کشاد کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ انھوں نے شرح غالب اور شرح میر میں اپنی زندگی کے بیس پچیس سال کھپا دئے اور یہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں حق تو یہ ہے کہ انھوں نے تشریح و تفسیر کے کام کو تخلیقی بلندیوں تک پہونچا دیا۔

یونیورسٹیوں میں پڑھائے جانے والے انتخابات سے نامطمئن ہونے کی بنا پر فاروقی صاحب کی کتاب شعر شور انگیز وجود میں آئی جس کا اظہار انھوں نے جلد اول کی تمہید میں کیا ہے۔ گو کہ انھوں نے اپنے پیش روؤں کی تائید و توثیق کرتے ہوئے دبستان تنقید کے بعض اکابرین کی خدمات جلیلہ کا اعتراف بھی کیا ہے۔ مثال کے طور پر وہ رقم طراز ہیں: "اثر لکھنوی کا انتخاب (کلام میر) نسبتاً بہتر ہے لیکن وہ آسانی سے نہیں ملتا پھر اس میں تنقیدی بصیرت کے بجائے عقیدت سے زیادہ کام لیا گیا ہے۔ محمد حسن عسکری کا انتخاب 'ساقی' کے ایک خاص نمبر کی شکل میں چھپا تھا اور اب کہیں نہیں ملتا۔ عسکری صاحب نے ایک مخصوص اور ذرا محدود نقطۂ نظر سے کام لیتے ہوئے میر کے بہترین اشعار کی جگہ میر کی مکمل یا اگر مکمل نہیں تو نمائندہ تصویر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس طرح میر کے بہت عمدہ اشعار کے ساتھ کم عمدہ اشعار بھی انتخاب میں آگئے ہیں لہٰذا اس انتخاب کی روشنی میں میر کے شاعرانہ مرتبے کے باب میں صحیح رائے نہیں قائم ہو سکتی۔

میر کا سب سے اچھا انتخاب سردار جعفری نے کیا ہے بعض محدود

اور نقطۂ نظر کی تنگیوں کے باوجود ان کا دیباچہ بھی بہت خوب ہے سردار جعفری کا متن عام طور پر معتبر ہے لیکن سردار جعفری نے میر کے کئی رنگوں کو نظر انداز کر دیا ہے اور بہت سے کمزور شعر بھی شامل کئے ہیں خاص کر ایسے شعر جن کی سیاسی یا انقلابی تعبیر کسی نہ کسی طرح ممکن تھی۔

اس بات کے باوجود کہ میں نے اپنے بیشتر انتخابات سے عدم اطمینان کا اظہار کیا ہے مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی تامل نہیں کہ میں نے ہر انتخاب سے کچھ نہ کچھ سیکھا ضرور ہے۔ سردار جعفری، اثر لکھنوی اور محمد حسن عسکری کے انتخابات کا ذکر آچکا ہے۔ ان کے علاوہ بھی جو انتخابات پیش نظر رہے ہیں ان میں حسرت موہانی (مشمولہ انتخاب سخن) مولوی عبدالحق مولوی نور الرحمٰن، حامدی کاشمیری، قاضی افضال حسین، ڈاکٹر محمد حسن اور ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی کے انتخابات کا ذکر لازم ہے۔ آخر الذکر خاص طور پر توجہ کے قابل ہے کیونکہ اس کے مرتب پاکستان کے مشہور سائنسداں اور نوے سالہ عالم و مفکر ہیں۔ ان کا انتخاب ان لوگوں کے لئے تازیانۂ عبرت ہے جو ادب کو صرف ادیبوں کا اجارہ سمجھتے ہیں:

تعین متن کے سلسلہ میں جن نسخوں کو سامنے رکھ کر انتخاب تیار کیا گیا ہے ان کی فہرست بھی فاروقی صاحب نے فراہم کی ہے جو درج ذیل ہے۔

نسخۂ فورٹ ولیم (کلکتہ ۱۸۱۱) مرزا جان طپش اور کاظم علی جوان کا مرتب کردہ۔ نایاب نسخہ نثار احمد فاروقی سے حاصل کیا۔

۲. نسخۂ نول کشور (لکھنؤ ۱۸۶۷) یہ نسخہ نیر مسعود نے فراہم کیا

۳. نسخۂ آسی (نولکشور لکھنؤ ۱۹۴۱ء) اطہر پرویز مرحوم سے حاصل کیا گیا۔

۴. کلیات غزلیات۔ مرتبہ ظل عباس عباسی (علمی مجلس دہلی ۱۹۶۷) اس کو میں نے بنیادی متن قرار دیا ہے کیونکہ یہ فورٹ ولیم کی روشنی میں مرتب ہوا ہے۔

۵. کلیات۔ جلد اول۔ مرتبہ احتشام حسین۔ جلد دوم۔ مرتبہ مسیح الزماں (رام نرائن ـ الہ آباد ۱۹۷۰)

۶. کلیات۔ جلد اول۔ دوم۔ سوم (صرف چار دیوان) مرتبہ اکبر علی فائق مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۵ بقیہ جلدیں بعد میں طبع ہوئیں۔

۷. دیوان اول مخطوطہ محمود آباد مرتبہ اکبر حیدری کاشمیری 1971

۸ مخطوطہ دیوان اول مملوکہ نیر مسعود (تاریخ درج نہیں لیکن ممکن ہے کہ یہ مخطوطہ محمود آباد سے بھی پرانا ہو۔ دیوان اول کی کئی مشکلیں اس سے حل ہوئیں۔

انتخاب کو باقاعدہ مرتب کرنے کا کام جون ۱۹۷۹ میں شروع کیا گیا۔ انتخاب کا یہ کام ۱۹۸۲ء میں ختم ہوا۔ اسی مہینے میں شرح نویسی شروع ہوگئی۔ شرح نویسی کا کام سات آٹھ برس تک چلا اس کے بعد تواتر کے ساتھ شعر شور انگیز کی چار جلدیں شائع ہوئیں۔ یہ چاروں جلدیں ڈھائی ہزار صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں۔

ارباب نقد و نظر سے بے پناہ داد سمیٹنے کے بعد فاروقی نے داستانوں پر غیر معمولی کام کیا۔ ساتھ ہی ساتھ لغت شناسی کے میدان میں بھی ان کی پیش رفت جاری ہے سبھوار اور دیگر کہانیاں لکھوا کر انھوں نے انیسویں صدی کی تہذیب و کلچر کی ترجمانی میں نشان امتیاز قائم کیا۔ سبھوار میں ایک قصہ میر کی نیرنگیٔ حیات پر مشتمل ہے غرض کہ اردو کے دو بڑے شاعروں غالب اور میر کو انھوں نے جس طرح سمجھا اور پرکھا ہے اس کی کوئی دوسری نظیر اردو ادب میں مشکل ہی سے نظر آتی ہے۔ شعر کی تفہیم کے لئے انھوں نے جو اصول وضع کئے ہیں۔ اس کے لئے انھوں نے عربی و فارسی اور انگریزی ادب کی شعری و تنقیدی روایات نیز مشرقی اور مغربی شعریات سے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ اپنی روح میں اس طور جذب کیا جیسے انھوں نے خود کو غالب اور میر کے قالب میں ڈھال لیا ہو۔

OO

جب نام ترا لیجے تب چشم بھر آوے
اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے
رنگِ گل و بوئے گل ہوتے ہیں ہوا دونوں
کیا قافلہ جاتا ہے جو تو بھی چلا چاہے
— میرؔ

احمد ابراہیم علوی
۲ بیلیغہ اسکوائر، لکھنؤ۔۲

کون ہے جو نہ کہے میر کو استادِ سخن

میر تقی میر اردو کا ایک ایسا شاعر ہے جس پر سب نازاں ہیں۔

بہترین شاعری کی جو بھی تعریف کی جائے باکمال شاعر کے لئے جیسی صلاحیت، قابلیت اور فن کاری کو لازم قرار دیا جائے میر کبھی کہیں کم نظر نہیں آتا۔ وہ جو آفاقی قدروں کی بڑی باتیں کرتے ہیں جن کو عصری حسیت بھی لازمی طور سے درکار ہوتی ہے اور جو حق گوئی اور بے باکی کو اچھی شاعری کے لئے بے حد ضروری سمجھتے ہیں وہ بھی جس انداز اور جس پیمانے سے میر کی شاعری کا جائزہ لیں انھیں کبھی میر کسی سے کم نہیں نظر آئے گا حقیقت تو یہ ہے کہ میر کے یہاں جو البیلا پن جو سخن گسترانہ پیرائیہ بیان اور سادگی میں جو شوخی نظر آتی ہے وہ دنیا کے عظیم شاعروں کے یہاں بھی لاکھ ڈھونڈے نہیں ملتی۔

اگر میر تقی میر کی عظمت کا ذکر بہت اختصار سے کیا جائے تو بس اتنا ہی کہنا کافی ہوگا کہ یہ وہ شاعر ہے جس کی عظمت کو غالب جیسے باکمال شاعر نے تسلیم کیا اور ذوق جیسے استاد فن نے سراہا ہے ثبوت کے لئے دونوں کے اشعار موجود ہیں۔

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بہ قولِ ناسخ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں

اور ذوق کا اعتراف ہے۔

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب
ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

میر کی عظمت کا سبب اس کا وہ انداز بے مثال و بے نظیر ہے جو دل کے تاروں کو چھیڑ کر ایک خاص کیفیت اور ایک خاص تاثر چھوڑتا ہے۔ میر کی شاعری اس کی پوری زندگی کی آئینہ دار ہے۔ اس کی زندگی میں سوز و گداز کو بڑی حد تک دخل تھا لہٰذا اس کی پوری شاعری سوز و گداز سے معمور ہے۔ اسی سوز و گداز میں جب شگفتگی و شائستگی اور بیساختگی اور نغمگی کا امتزاج ہوتا ہے تو الفاظ کے سانچے میں ڈھل کر ایک ایسا پیکر وجود میں آتا ہے جو اپنے حسن اور دیدہ زیبی کی بنا پر سبھی کا مرکز نگاہ بنتا ہے۔

میر کا درد بھرا دل اس کے حق میں جتنا بھی مضر رہا ہو اردو کے لئے بہت مفید ثابت ہوا کیونکہ اسی درد بھرے دل کی بدولت اردو ادب میں حکایات درد دل کا اضافہ ہوا۔

میر کی شاعری غم کی شاعری ہے اور غم بھی کسی اور کا نہیں اس کا ذاتی غم لیکن اس نے اپنے ذاتی غم کی ترجمانی کچھ اتنے لطیف اور جمیل پیرائے میں کی ہے کہ وہ سب کے غم کی ترجمانی معلوم ہوتی ہے۔ گویا اس نے آپ بیتی کو جگ بیتی کرکے پیش کیا ہے۔ وہ علی الاعلان کہتا ہے۔

مجھ کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب میں نے
درد و غم کتنے کئے جمع تو دیوان کیا

اگر وہ دیوان جمع کرنے کے لئے درد و غم کی لذت سے آشنا ہوتا تو وہ اچھا شاعر تو کیا شاید شاعر بھی تسلیم نہ کیا جاتا مگر اس نے ایسا نہیں کیا بلکہ درد و غم سے آشنا ہو کر دیوان جمع کئے۔ اسی لئے اس کا غم ایسا غم ہے جو مصنوعی نہیں اور اس کے کلام میں جس غم کی ترجمانی ہے وہ بھی مصنوعی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں اتنی تاثیر اور اتنا اثر ہے کہ وہ مٹائے نہیں مٹتا۔

شعر ایک مترنم خیال ہے۔ اچھا شعر وہ ہوتا ہے جس کا تاثر دیرپا ہوتا ہے۔ میر کا ہر شعر ترنم سے لبریز ہے اور اس کا تاثر انتہائی دیرپا۔ اچھے فن پارۂ ادب کی خصوصیت ہوتی ہے کہ اس کی شگفتگی و شادابی لافانی ہوتی ہے جب بھی جتنی بھی بار اس کا مطالعہ کیا جاتا ہے

ایک نئی لذت، نئی تازگی اور نئے کیف کا احساس ہوتا ہے میر کے اشعار میں یہ تمام خوبیاں بخوبی پائی جاتی ہیں۔ اس کا ہر شعر ترنم کا آبشار ہے۔ تاثر اور تاثیر بدرجۂ اتم اور دلنشین ہے۔ شگفتگی اور شادابی ٹپکی پڑتی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کی اہمیت و عظمت اور قدر و قیمت میں اقدار حیات کے بدلنے سے کوئی نمایاں فرق نہیں پیدا ہوتا وہ ہر عہد ہر ماحول اور ہر معاشرہ میں یکساں قدر و قیمت رکھتا ہے۔

میر کا فن یہ ہے کہ وہ الفاظ سے ترنم آہنگ پیدا کرکے تخیل کی آمیزش سے ٹھوس حقیقتوں کو بخوبی بے نقاب کرتا ہے اس کے کلام میں پائی جانے والی حقیقتیں ٹھوس بھی ہیں اور تلخ بھی اسی لئے دیرپا بھی ہیں اور پر اثر بھی۔ مثال کے طور پر صدہا اشعار لکھے جاسکتے ہیں جیسے

نام آج کوئی یاں نہیں لیتا ہے انھوں کا
جن لوگوں کے کل ملک یہ سب زیر نگیں تھا

سرسری تم جہان سے گذرے
ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا

دل وہ نگر نہیں کہ پھر آباد ہو سکے
پچھتاؤ گے سنو ہو یہ بستی اجاڑ کر

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہ شیشہ گری کا

آفاق کی منزل سے گیا کون سلامت
اسباب لٹا راہ میں یاں ہر سفری کا

یہ اشعار جتنے سادہ ہیں اتنے ہی رنگین بھی حقیقت یہ ہے کہ ان اشعار میں میر نے کوئی بھی خاص بات نہیں کی ہے وہی عام باتیں جو ہم اور سب جانتے ہیں اور جب سے دنیا بنی ہے تب سے سب لوگ ان باتوں کو جانتے آئے ہیں۔ میر کا کمال یہ ہے کہ اس نے انھیں باتوں کو کچھ اس طرح دہرایا ہے کہ یہ ہم کو بھلی معلوم ہوتی ہیں اور ہمارے دل پر اثر انداز بھی ہوتی ہیں۔ اسی لئے میر جب یہ کہتا ہے کہ

"چاہیے اہل سخن میر کو استاد کریں"

تو برا نہیں لگتا کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ:

جانے کا نہیں شور سخن کا مرے ہرگز
تا حشر جہاں میں مرا دیوان رہے گا

اور ایسا اس لئے ہے کہ:

سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا
مستند ہے میرا فرمایا ہوا

یہ بلند بانگ دعویٰ نہیں کیونکہ میر کی شاعری میں زندہ رہنے اور عظمت تسلیم کروا لینے کی ناقابل شکست قوت ہے تبھی تو غالب نے غور کیا۔

ریختہ کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

اس کا سبب یہ ہے کہ میر کی شاعری میں آفاقی قدریں بدرجہ اتم ملتی ہیں اس کا مشاہدہ درست اور خوب ہے۔ وہ دنیا، زندگی اور غم کو عالمی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے۔

میر کی شاعری کا محور اس کا فطری سوز و گداز ہے۔ دراصل اسی فطری سوز و گداز نے شدت اختیار کر الفاظ کا لباس زیب تن کر صفحۂ قرطاس پر جو نقوش چھوڑے وہی نقوش میر کے اشعار ہیں۔

سوز و گداز اور حزن و ملال کو فطری طور سے انسانی طبیعت سے خصوصی لگاؤ ہے اسی لئے انگریزی کے مشہور شاعر شیلی کا کہنا ہے کہ "ہمارے سب سے شیریں نغمے وہ ہیں جو سب سے زیادہ غمگین خیالات کی ترجمانی کرتے ہیں۔"

میر کے اشعار میں ان کے سینے سے اٹھی ہوئی "ہوک" اس کے منہ سے بے اختیارانہ نکلی ہوئی "آہ" اور اس کے ستم زدہ دل کی آواز اور درد اور تڑپ ہے۔ گویا اس کے اشعار میں جذباتِ دل اور وارداتِ قلب کی ترجمانی ہے جس کے سبب اس کے اشعار ہمارے دل میں بیٹھتے ہیں اور دماغ میں چکر کاٹتے ہیں۔

سرہانے میر کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

یک بیاباں برنگ صوتِ جرس
مجھ پہ ہے بے کسی و تنہائی

جب نام ترا لیجئے تب اشک بھر آوے
اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے

نازکی اُن کے لب کی کیا کہئے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

پتہ پتہ بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں
اس عاشقی میں عزتِ سادات بھی گئی

میر اپنے حالات پر روتا ہے۔ زمانے کی خود غرضی پر روتا ہے اور تلخ حقیقتوں پر روتا ہے مگر اس انداز سے روتا ہے کہ سننے والا محظوظ ہوتا ہے دل شکستہ نہیں۔ اچھے کلام کی تعریف یہ ہوتی ہے کہ اس میں سادگی حقیقت اور تاثر ہوتا ہے۔ اگر اس زاویۂ نگاہ سے میر کے کلام کا جائزہ لیا جائے تو بہت کم ایسے اشعار ملیں گے جن میں یہ خوبیاں نہ ہوں گی۔

میر کا کوئی بھی شعر تاثر سے معرّیٰ نہیں ہوتا یہ فیض سوز و گداز کے علاوہ اس کی شورش طبع کا بھی ہے جو اس کو دل نشین انداز اختیار کرنے کے لئے مجبور کرتی رہتی ہے اور بقول آزاد اس کی خود پسندی اور خود بینی کو بھی دخل ہے جس میں وہ غرق رہتا ہے۔

مجھ کو دماغ وصف گل و یاسمن نہیں
میں جو نسیم باد فروش چمن نہیں

شاعری اگر ساحری نہیں تو جگر سوزی ضرور ہے جس شاعر نے جگر سوزی نہیں کی وہ شاعر نہیں بن پایا جس نے جتنی جگر سوزی کی اسے اتنی ہی توقیر میسر ہوئی۔ اردو شعرا میں میر نے سب سے زیادہ جگر سوزی کی اس لئے اسے سب سے اعلیٰ مقام حاصل ہوا۔ اسکی جگر سوزی ملاحظہ ہو۔

حالت تو یہ ہے مجھ کو غموں سے نہیں فراغ
دل سوزشِ درونی سے جلتا ہے جوں چراغ
سینہ تمام چاک ہے سارا جگر ہے داغ
ہے نام مجلسوں میں مرا میرِ بے دماغ
از بسکہ کم دماغی نے پایا ہے اشتہار

میر کی تو دل سوزش درونی نے اس کلام میں تاثر پیدا کر کے اس کو دل نواز اور دل نشین بنا کر اس کو وہ رتبہ بخشا جو اردو کے کسی دوسرے شاعر کو ہنوز نہ میسّر ہوا۔ میر بننا آسان نہیں ہوتا۔ ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے تب کہیں جا کر چمن میں کوئی دیدہ ور پیدا ہوتا ہے۔ اسی لئے میر کا کہنا بجا ہے:

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

میر اردو کا وہ واحد غزل گو شاعر ہے جس کی عظمت کو ہر خاص و عام نے تسلیم کیا ہے اور اس کے فن میں اتنی تازگی و شگفتگی ہے کہ ابھی برسوں تک اسکی عظمت کو کوئی ٹھیس نہیں پہونچا سکتا۔ ○

میر کا استفہامیہ لہجہ (صفحہ ۸۲ کا بقیہ)

آخر میں ان اشعار کو بھی ملاحظہ فرمائیں جن کے استفہامیہ انداز نے ہی بلندی سے نوازا ہے اور جن کے صوفیانہ رنگ نے ان کی شاعری کے رخ کو نئے ادراک سے ہمکنار کیا ہے۔ یہ اشعار آج بھی اس انداز میں اردو قاری کی زبان پر ہیں جیسے میر کے زمانے میں رہے ہوں گے۔ یہ آج بھی اسی گہرائی اور گیرائی کے ساتھ مطالعہ کے مرحلہ سے گذرتے ہیں جیسے دو صدی قبل گزرتے رہے ہوں گے

میر کے دین و مذہب کو اب پوچھتے ہو کیا ان نے تو
قشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا
کس کا کعبہ کیسا قبلہ، کون حرم ہے، کیا احرام
کوچے کے اس کے باشندوں نے سب کو یہیں سے سلام کیا

آدمی کو ملک سے کیا نسبت — شان ارفع ہے میر انساں کی
کوہکن کیا پہاڑ کاٹے گا — پردے میں زور آزما ہے عشق
کون مقصد کو عشق بن پہونچا — آرزو عشق، مدعا ہے عشق

میر کی شاعری کے استفہامیہ لہجہ کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ ان کی شاعری جہاں وسعت فکر و نظر کی غماز ہے وہیں طرز ادا اور اسلوب بیان کے متعدد تجربوں کا بھی مظہر ہے۔ ان کی شاعری کا مطالعہ جس انداز سے بھی کیا جائے اس میں غور و فکر کے بہت سے پہلو سامنے آئیں گے جس کی ایک مثال ان کا استفہامیہ لہجہ بھی ہے۔ ○○

شاہنواز قریشی
۲۶۵/۸۰، تکیہ جنگ علی شاہ ٹوریہ گنج، لکھنؤ

انشائیہ

خرابہ دلّی کا وہ، چند بہتر لکھنؤ سے تھا

میر تقی میر جب لکھنؤ آئے تو ان کی وضع قطع دیکھ کر یہاں کے لوگ ہنسے تھے اس پر انھوں نے فی البدیہہ یہ قطعہ کہا تھا کہ.

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

اب یہ تو ہمیں نہیں معلوم ہو سکا ہے کہ لکھنؤ والوں پر اس کا کیا اثر ہوا تھا اور ان کا کیا ردعمل رہا تھا. ہمارا قیاس ہے کہ لکھنؤ والے میر کی زود گوئی کی داد دینے کے بجائے خاموش ہو گئے ہوں گے. ویسے لکھنؤ والے باہر کے لوگوں کو کم ہی تسلیم کرتے ہیں یہاں تک کہ علامہ اقبال پر بھی وہ پھبتی کسنے سے باز نہیں آئے. لکھنؤ کی ایک شعری محفل میں اقبال نے اپنی نظمیں سنائیں تو سب خاموشی سے بس سنتے رہے. جب وہ نظمیں سنا چکے تو پیارے صاحب رشید نے کہا اب کچھ شاعری بھی سنا دیجئے. یعنی ان کے مطابق اقبال کی نظمیں شاعری کے دائرے سے باہر کی چیز تھیں.

جہاں تک لکھنؤ کا تعلق ہے وہ ہمیشہ طعنہ زنوں کا شہر رہا ہو یہ بات ہم نہیں پنڈت جواہر لال نہرو کہہ گئے ہیں. بہت پہلے غالباً ۱۹۶۲ء کی بات ہے لکھنؤ یونیورسٹی کی ایک تقریب میں نہرو جی نے طلباء کو خطاب کرتے ہوئے کسی سلسلہ میں جب یہ کہا کہ اب اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں ہے تو کسی نے فوراً فقرہ کسا کہ پھر بوسہ استعمال کیجئے. نہرو جی نے یہ فقرہ سن لیا تھا. اس پر انھوں نے ہنستے ہوئے کہا تھا کہ لکھنؤ تو ہمیشہ طعنہ زنوں کا شہر رہا ہو.

ہم یہ تو نہیں جانتے کہ میر کو لکھنؤ کے طعنہ زنوں نے کہاں تک Recognition دیا. انھیں کس حد تک اپنایا لیکن اتنا ضرور جانتے ہیں کہ لکھنؤ نے میر کو دفن کے لئے دو گز زمین دیدی یعنی میر کی تدفین لکھنؤ ہی میں ہوئی لیکن یہ کوئی نہیں جانتا کہ ان کی قبر کہاں ہے. کون سی ہے.

لکھنؤ میں ایک بڑے سرمایہ دار نے میر کے نام سے ایک اکیڈمی قائم کی تھی یعنی میر اکیڈمی. اس سے میر شناسی یا میر فہمی کے کون سے باب وا ہوئے اس کے بارے میں ہم بالکل لاعلم ہیں. ہاں اس اکیڈمی کی جانب سے میر کے نام سے منسوب ایوارڈ بہت سے ادیبوں اور شاعروں کو دئے گئے یہاں تک کہ اختر عمر لکھنوی اور شاہ نواز قریشی تک کو ایوارڈ اس اکیڈمی نے دیدیا. حالانکہ میر نے کہا تھا.

امیر زادوں سے دلی کے مت ملا کر میر
کہ ہم غریب ہوئے ہیں انھیں کی دولت سے

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ میر اقتصادی نظام کی ناہمواریوں اور دولت کی غیر مساوی تقسیم کے ستم سے بھی واقف تھے. اس کے باوجود ہمارے ترقی پسندوں نے میر کو وہ Recognition نہیں دیا جس کے وہ مستحق تھے. میر نے یہ بھی کہا تھا.

ہم نہ کہتے تھے کہ مت دیر و حرم کی راہ چل
اب یہ جھگڑا حشر تک شیخ و برہمن میں رہا

اس کے باوجود ترقی پسندوں نے میر کو وہ اہمیت نہیں دی جو دی جانی چاہئے تھی. میر کا نوٹس موجودہ عہد میں جدیدیت کے

رہبر اعلیٰ شمس الرحمٰن فاروقی نے لیا. انھوں نے شعر شور انگیز کے عنوان سے میر پر پوری کتاب لکھ دی. ہمیں حیرت ہے کہ فاروقی صاحب نے عادل منصوری، محمد علوی، ظفر اقبال اور کمار پاشی پر کوئی کتاب نہیں لکھی. جدیدیت کی شور انگیزی، افراتفری اور بے راہ روی کے ہنگامے کے بعد فاروقی صاحب کو جو پناہ ملی تو کہاں ملی؟ میر کے یہاں. اس سے پہلے وہ تفہیم غالب بھی کرتے رہے جبکہ غالب کے یہاں وہ الجھاؤ نہیں ہے جس سے ان کے معاملہ میں ترسیل کی ناکامی کا المیہ سامنے آتا. ترسیل کی ناکامی کا المیہ تو جدیدیت کی دین تھا چنانچہ تفہیم کی ضرورت غالب سے زیادہ جدیدیت کو تھی. تجریدی شاعری اور علامتی افسانے کو تھی.

میر کی شاعری میں وہی نازکی ملتی ہے جو انھیں کسی کے لب میں نظر آئی تھی کہ ؎

نازکی اس کے لب کی کیا کہئے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

میر نے یہ بھی کہا تھا ؎

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا

میر کی شاعری کا مطالعہ بھی اسی طرح بڑا نازک عمل ہے.

ہم اپنے بہت سے ناقدانِ ادب سے بڑے خوفزدہ رہتے ہیں. وہ اس لئے کہ چاہے میر ہوں یا غالب یا کوئی اور شاعر، اس کا تجزیہ وہ بالکل میتھ میٹکل انداز میں کرتے ہیں بلکہ شاعری کا پوسٹ مارٹم کر دیتے ہیں. پہلے یہ ہوتا تھا کہ ہر شاعر کے یہاں مزدور اور کسان کو تلاش کیا جاتا تھا. اس کے یہاں اگر مزدور اور کسان نہیں ملا تو اسے رجعت پسند قرار دے دیا جاتا تھا. پھر وہ دور آیا جب فرد کی تنہائی اور بے بسی، زندگی کے بے معنی اور بے مقصد ہونے کا خوب رونا رویا گیا. آدرشوں اور خوابوں کی شکست و ریخت کا ڈھول پیٹا گیا یہ کام تقریباً ہر شاعر، ہر فکشن رائٹر نے کیا. معمر قلم کاروں نے بھی اور نوجوان لکھنے والوں نے بھی. اس طرح دونوں کے تجربات یکساں تھے جبکہ عمر کے مطابق تجربات میں کچھ تو فرق ہونا چاہئے تھا تجربوں کی یکسانیت دراصل فیشن کی دین تھی لیکن اس رجحان کو فروغ دینے بلکہ اسے ایک تحریک بنا دینے والوں کو بھی بالآخر میر کے یہاں پناہ لینی پڑی. میر کی شاعری کے سحر نے تو ان لوگوں کو بھی متوجہ کر لیا جن کی عمر رومانی افسانے لکھنے کی ہے چنانچہ وہ بھی میر کی شاعری اور اس پر لکھی گئی تنقیدوں کا جائزہ لینے لگے.

میر کا ایک شعر ہم نے زمانۂ طالب علمی میں پڑھا تھا. آثر لکھنوی نے اپنے ایک مضمون میں اس شعر کا حوالہ دیا تھا کہ ؎

شوخی تو دیکھو آپی کہا آؤ بیٹھو میر
پوچھا کہاں تو بولے کہ میری زبان پر

یہ شعر اسی وقت سے جانے کیوں ہمارے حافظے میں محفوظ ہو گیا. اس میں آپ ہی کو آپی لکھا گیا ہے. یہ ضرورت شعری کا تقاضا تھا لیکن عام طور سے روزمرہ کی گفتگو میں بھی ہم آپ ہی کو آپی بولتے ہیں خاص طور سے لکھنؤ میں.

زبان و بیان کی ایسی نہ جانے کتنی باریکیاں اور لطافتیں میر کے یہاں ملتی ہیں جن کے تجزیے کی ضرورت ہے.

میر کے بہت سے شعر ہمارے حافظے میں زمانۂ طالبعلمی سے محفوظ ہیں جن میں وہ اشعار بھی شامل ہیں جن کا ہم نے درج بالا سطور میں حوالہ دیا ہے ان کے علاوہ مندرجہ ذیل اشعار بھی ان میں شامل ہیں.

میر کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو ان نے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

دل سے اٹھتا ہے کہ جاں سے اٹھتا ہے
یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے

جب نام ترا لیجے تب چشم بھر آوے
یہ زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے

میر ان نیم باز آنکھوں میں — ساری مستی شراب کی سی ہے
ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے — اس کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

(بقیہ صہ ۵۹ پر)

ڈاکٹر اسلم جمشید پوری
صدر شعبہ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی میرٹھ

میر کی شاعری اور ماس کمیونی کیشن

مجھ کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب میں نے
درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

میر کی شاعری اپنے متعدد اوصاف کی بنا پر، اردو شاعری کی جان کہلانے کی مستحق ہے۔ میر کو خدائے سخن، غزل کا امام، بابائے غزل وغیرہ القاب سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ میر کے انتقال کے دو سو سال بعد بھی میر شناسی کے تعلق سے کہا جا سکتا ہے کہ اب بھی بے شمار ایسے گوشے پس پردہ ہیں جن پر سیر حاصل روشنی ڈالی جا سکتی ہے۔ میر شناسی میں مجنوں گورکھپوری سے مولوی عبدالحق، نثار فاروقی اور شمس الرحمٰن فاروقی سے احمد محفوظ تک ایک طویل فاصلہ طے ہو چکا ہے۔ میر کی شاعری کے بے شمار پہلوؤں پر گفتگو ہوتی رہی ہے۔ نت نئے انکشافات اور اشعار کے نئے مفاہیم سے میر شناسی کو تقویت ملی ہے۔

تقریباً تین صدیوں کی طویل مسافت کے بعد بھی میر کی شاعری کی تازگی میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔ آج بھی میر کے اشعار ہمیں گدگداتے ہیں۔ ہمارے احوال کی عکاسی کرتے ہیں، ہمارے دل کے تاروں کو چھیڑ جاتے ہیں کسی بھی شاعر کو یہ مقبولیت اور شہرتِ دوام یوں ہی حاصل نہیں ہوتی کوئی تو وجہ رہی ہوگی کہ میر کی شاعری آج بھی دلوں پر قابض ہے۔ موضوعات کا انتخاب و استعمال اور فن پر دسترس کسی بھی شاعر کو دوسروں سے الگ کرتی ہے۔ زمانے کے سرد و گرم کو بھی کسی شخص کی عظمت میں دخل ہے۔ میر کے تعلق سے کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی میں بہت زیادہ غم و الم نہ صرف دیکھے بلکہ ان کو زندگی بھی کیا اور میر کے زمانے کے اسی سرد و گرم نے میر کو بڑا شاعر بنایا ہے۔ پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی میر کے اس غم و الم کے تعلق سے لکھتے ہیں۔

"ہماری تاریخ میں میر کے علاوہ کوئی بڑا شاعر ایسا نہیں ہے جس نے زمانے کے سرد و گرم اتنے دن دیکھے ہوں۔ جو جنگوں میں شریک رہا ہو جس نے بار بار ترک وطن کیا ہو جس نے بادشاہوں اور فقیروں کی صحبتیں اٹھائی ہوں جس نے عسرت و تنگی کے وہ دن دیکھے ہوں کہ بقول خود اسے کتے بلی کی طرح زندگی بسر کرنی پڑی ہو۔ جس نے آرام کے دن بھی دیکھے ہوں اور جو صوفیوں میں صوفی، رندوں میں رند اور سپاہیوں میں سپاہی رہا ہو۔"

(شعر شور انگیز، شمس الرحمٰن فاروقی، جلد اول ص ۳۲)

جب کوئی حساس شخص دنیا کے حالات کا سامنا کرتا ہے تو اس کا احساس اس کی گفتگو اور تخلیق میں ضرور ہوتا ہے۔ میر جیسا حساس شاعر بھلا زمانے کے حالات سے متاثر ہوئے بغیر کیسے رہ سکتا تھا کسی واقعے کا احساس کرنا ایک بات ہے۔ احساس کا اظہار تخلیقات میں کرنا دوسری بات ہے لیکن کسی واقعے کا احساس کرنا الگ بات ہے احساس کا اظہار جو پڑھنے اور سننے والے کو بھی واقعے کا حصہ بنا دے اس کے دل میں درد کی موجیں پیدا کر دے یہ ایک بڑا فنکار ہی کر پاتا ہے اور میر نے یہی کیا۔ میر کی شاعری کی عظمت کے نکات ان کے حالاتِ زندگی میں تلاشنے کی ایسی ہی کوشش پروفیسر آل احمد سرور بھی کرتے ہیں۔

"میر کو میں مکمل شاعر کہتا ہوں۔ اس لئے کہ ایک تو ان کی شخصیت کھری ہے۔ انھوں نے زندگی کے بہت نشیب فراز دیکھے۔ امراء کی صحبتیں اٹھائیں۔ دلی کی رونق اور

اس کی بربادی دیکھی جو معزز تھے انھیں ذلیل ہوتے اور جو پنچ تھے انھیں اوپر جاتے دیکھا۔ انھوں نے جنگوں میں بھی حصہ لیا اور فقیروں کی صحبتوں میں بھی۔ انھوں نے لڑکوں سے بھی عشق کیا اور عورتوں سے بھی۔ انھوں نے جامع مسجد کی سیڑھیوں پر تہذیب اور زبان کو دیکھا اور پوری طرح جذب بھی کیا۔ انھوں نے فن کے لئے ریاض بھی کیا۔ غرض وہ گرد و پیش کی زندگی میں حصہ لیتے رہے"۔

(پہچان اور پرکھ، آل احمد سرور ص ۸۲ مکتبہ جامعہ لیمٹڈ)

پروفیسر آل احمد سرور کی بات دل کو لگتی ہے۔ انھوں نے میر کی شاعری کی عظمت کے لئے انھیں مکمل شاعر کہا ہے اور یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ کامیاب شاعر کیسا ہوتا ہے۔ وہ اپنی ذاتی زندگی میں کیا ہوتا ہے کس طرح روزمرہ کے معاملات اس کی شخصیت پر اثر انداز ہوتے ہیں اور کس طرح شخصیات شب و روز کی زندگی کی عکاسی کرتی ہیں لیکن ایک پہلو ہو سکتا ہے جبکہ فن کاری اور زبان کی دسترس ہی کسی شاعر کو میسر بناتی ہے۔ میر کی شاعری کی ہمہ وقت مقبولیت اور آج تک زندہ رہنے کا راز ان کی شاعری میں وہ تصویریں ہیں جو بنی تو ضرور لفظوں سے ہوتی ہیں لیکن ان میں عام انسانوں کی زندگی ہوتی ہے۔ ان کے دلوں کی دھڑکنیں ہوتی ہیں ان کی سرگوشیاں ہوتی ہیں۔ ان کے عشق، ان کی حسد، نفرتیں، بغض و عناد ہوتے ہیں۔ غرض زندگی کی رنگارنگی فن کاری کے ساتھ ہمارے سامنے ہوتی ہے۔ پروفیسر نثار احمد فاروقی میر کی شاعری کی ہر دل عزیزی کے تعلق سے کچھ یوں رقم طراز ہیں:

"میر کبھی اپنے ماحول سے خطاب کرتا ہے، کبھی پوری کائنات سے سرگوشیاں کرتا سنائی دیتا ہے، کبھی صرف اپنے آپ سے مخاطب ہے، کہیں تفصیل میں اجمال کا جمال دکھاتا ہے اور کبھی اجمال میں تفصیل کے رنگ بھر دیتا ہے۔ زبان و بیان پر یہ قدرت ہر شاعر کو نصیب نہیں ہوتی اور مشاہدہ و اظہار کی اسی قدرت نے اس کی قوتِ تخیلہ کو بہت تیز بیں اور دور رس بنا دیا ہے جتنی رنگارنگ، متحرک اور مختلف جہات والی امیجری ہمیں میر کی شاعری میں ملتی ہے وہ متقدمین و متاخرین شعراء میں سے اور کسی کے ہاں نظر نہیں آتی۔ یہ اس امیجری کے زور قوت کا ادنیٰ سا کرشمہ ہے کہ وہ مجرد Abstrast اشیاء کو بھی آنکھوں سے دکھا سکتا ہے"۔

واقعہ تو یہی ہے کہ زندگی کو زندگی کرنے کا جو درویشانہ شعور عام انسانوں کی سی حیثیت میر کے یہاں ملتی ہے وہ ہماری اردو شاعری میں کم کم ہی نظر آتی ہے۔ ان کی شاعری کا جس قدر مطالعہ کیا جاتا ہے متعدد نئے گوشے وا ہوتے رہتے ہیں اور یہ بھی بڑی شاعری کا وصف ہے۔ میر کو پڑھتے ہوئے کبھی ایسا نہیں لگتا کہ واعظ وعظ فرما رہا ہے۔ صرف شانی زندگی کے الاپ' الاپے جا رہے ہیں بلکہ کہیں خوشی تو کبھی غم۔ کبھی زندگی کی پرپیچ راہیں تو کبھی انسانی مکاری اور عیاری کا چہرہ مترشح ہوتا رہتا ہے ڈاکٹر جمیل جالبی میر کی شاعری کے مطالعہ کے بعد کی کیفیات کا تجزیہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"میر کے کلیات کو پڑھتے وقت ہمیں طرح طرح کی آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے کبھی وہ ہمیں غمزدہ کر دیتا ہے۔ کبھی وہ ہمارے غموں کا تزکیہ کر دیتا ہے، کبھی وہ ایسی سچائی کا شعور ہمیں دیتا ہے جس سے شاید ہم واقف تو تھے لیکن اس طرح نہیں جس طرح میر نے ہمیں واقف کرایا ہے۔ کبھی ہم اس سے اکتا جاتے ہیں لیکن ان سب کیفیات کے ساتھ میر کے شعر ہمارے ذہن کو اپنی گرفت میں لے کر ہمیں بدلتے رہتے ہیں"۔

(محمد تقی میر، ڈاکٹر جمیل جالبی ص نمبر ۹۱-۹۰، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی)

میر کی شاعری کو جب ہم آج کے جدید عہد کے تقاضوں پر پرکھتے اور تولتے ہیں تو حیرانی ہوتی ہے کہ آج کے اس انفارمیشن ٹکنالوجی کے دور میں جہاں کمپیوٹر، ٹی۔ وی، انٹرنیٹ وغیرہ نے ہماری گفتگو اور ہماری زندگی کو Communicate کرتے ہوئے Mass تک پہونچا دیا ہے یعنی آج کا زمانہ Mass Communication کا زمانہ ہے جس میں ہم IT کے کاندھوں پر سوار ہو کر صدیوں کے فاصلے منٹوں میں اور سیکنڈوں میں طے کر لیتے ہیں۔ دنیا کی اس برق رفتار ترقی نے پوری دنیا کو عالمی گاؤں Global Village بنا دیا ہے۔ ایسے میں ؟ نے دنیا کی آنکھیں کھول دی ہیں۔ اب ادب اور زبانوں کی

تعلیم کشتی جاری ہے ۔ ایسے وقت میں کیا ہمارا ادبی سرمایہ جدید عہد سے نظریں ملا سکتا ہے ؟ یہ ایک سوال ہے ؟ بات میرؔ کی شاعری کی ہو رہی ہے۔ اس زاویۂ نگاہ سے میرؔ کی شاعری کا جب جائزہ لیا گیا تو حیرت انگیز انکشافات سامنے آئے ۔ میرؔ کی غزلوں کے ہزاروں اشعار Mass Communication میں نہ صرف معاون ہیں بلکہ عوام کے ایک بڑے طبقہ کی ترجمانی کرتے ہیں۔ آپ سوال اٹھائیں گے کہ یہ کام تو پھر ہر شاعر کی شاعری کرسکتی ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ صرف وہی شاعری بڑے پیمانے پر Communication کرتی ہے جس میں مذہبوں، زبانوں اور ملکوں کی سرحدیں عبور کرنے کی طاقت ہو۔ جس میں زبان کی سہل پسندی اور عام فہمی ہو۔ میرؔ کی شاعری نہ صرف سہل ممتنع کی اعلیٰ مثال ہونے کے باعث اس زمرے میں شامل ہوتی ہے بلکہ عوامی جذبات کی ترجمانی، ذاتی غم والم کو آفاقی حیثیت عطا کرنے والی نئی عبارت اسے آج کے عہد میں بھی زندہ رکھے ہوئے ہے مثلاً چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

میرؔ صاحب زمانہ نازک ہے
دونوں ہاتھوں سے تھامئے دستار

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا

مذکورہ بالا اشعار یوں تو عام فہم اور سامنے کے معنی والے اشعار ہیں لیکن ان اشعار نے Communication کے عہد میں بھی خود کو زندہ رکھا ہے بالکل نئے مطلب و معانی کے ساتھ یعنی جب میرؔ زمانے کو بہت نازک کہتے ہیں تو آج کے عہد کا سارا منظر نامہ نظروں کے سامنے رقص کرنے لگتا ہے۔ قومی سطح پر سیاسی اور سماجی حالات نے ہمیں ایسے موڑ پر لا کھڑا کیا ہے جہاں ہر طرف افراتفری ہے۔ علاقائیت، دہشت گردی، قتل و غارت گری، نفرت کی سیاست، زبان کی برتری جیسے مسائل نے ملک کو عجیب چوراہے پر لا کھڑا کیا ہے۔ عالمی سطح پر امریکہ کی بالادستی۔ بازار پر قبضہ کرنے کے لئے چھوٹے بڑے ممالک کو لبھانے کا سلسلہ، امن و آشتی کے نام پر ایک طرف ایٹمی اور جراثیمی ہتھیاروں کی روک تھام تو دوسری طرف خرید و فروخت کا سلسلہ گلوبل وارننگ۔ ایسے میں سب سے بڑا مسئلہ ہر ملک کو اپنی عزت اور وقار بچانے کا ہے۔ ہر فرد اور قوم کو خود کو محفوظ رکھنا ایک اہم معاملہ ہے ایسے حالات میں میرؔ کہتا ہے دونوں ہاتھوں سے اپنی دستار تھامئے کیونکہ دستار زیادہ بھاری ہے یا بڑی جو ایک ہاتھ سے سنبھلے گی نہیں، ایسا نہیں ہے۔ آج دستار کو چھیننے اور لے تار تار کرنے کے ہاتھ کئی ہیں اور وہ ہر دو سمتوں سے حملہ آور ہیں ایسے میں ایک ہی علاج بچا ہے کہ دونوں ہاتھوں سے دستار سنبھال جائے۔ یہی نہیں ایک پہلو اور دیکھیں.... ہاتھ کیا ہیں؟ ان کا تعلق کس سے ہے ؟ ہاتھ روزگار یا معاش کمانے کی علامت کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ ایسا پر آشوب زمانہ ہے کہ اس میں جان اور عزت کا تحفظ پہلے ضروری ہے بعد میں زندگی رہی تو روزی روٹی کا مسئلہ آئے گا۔ پہلا اور بڑا مسئلہ تحفظ کا ہے۔

دوسرے شعر میں بھی میرؔ نے آج کے ماحول کی زبردست عکاسی کی ہے۔ وہ سانس لینے میں احتیاط برتنے کو کہہ رہا ہے۔ اسے خبر ہے کہ آج کی Polluted Life میں ہر چیز آلودہ ہو گئی ہے۔ بڑھتے ہوئے Industrialisation جس طرح Multinationals کی بھرمار کر دی ہے اس نے نہ صرف ہوا آلودہ ہوئی ہے بلکہ آوازوں کے شور نے فضا کو سماعت کے لئے خطرناک بنا دیا ہے۔ ایسے میں شاعر کہہ رہا ہے کہ لے سانس بھی آہستہ یعنی آہستہ خرامی ہی آپ کی زندگی کو تحفظ دے سکتی ہے ورنہ برق رفتاری کے نتائج برے ہوں گے کیونکہ ہر طرف زہر پھیلا ہوا ہے ایسے میں تیز سانس زیادہ نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے۔ دوسرے تیز سانسیں، دم اکھڑنے کی علامت ہوتی ہیں۔ تیسرے پوری کائنات میں جس طرح روز نئے نئے بزنس سامنے آرہے ہیں اور دن بہ دن خطرات بڑھ رہے ہیں ایسے میں انسانی زندگی بیش قیمت ہے اور اس کو سنبھال کو خرچ کرنا ہی عقلمندی کا ثبوت ہے۔

میرؔ کی شاعری میں Communication کے متعدد Shades ملتے ہیں۔ متعدد اشعار ایسے ہیں جہاں میرؔ ذکر تو خاموش رہنے کا کرتے ہیں لیکن اپنی بات کا مقصد حاصل کر لیتے ہیں۔ ایسے کمیونیکیشن کو Silent Communication کہتے ہیں۔ کہ ترسیل کا دعویٰ نہ کیا جائے اور ترسیل ہو بھی جائے مثلاً ان اشعار پر غور کریں۔

سرہانے میر کے کوئی نہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

ہم خاموشوں کا ذکر تھا، شب اس کی بزم میں
نکلا نہ حرفِ خیر کسو کی زبان سے

مری خلق محو کلام سب مجھے چھوڑتے ہیں خموش کب
مرا حرف رشکِ کتاب ہے، مری بات لکھنے کا باب ہے

اگرچہ عمر کے دس دن یہ لب رہے خاموش
سخن رہے گا سدا میری کم زبانی کا

ان سارے اشعار میں بظاہر خوشی کا ذکر ہے۔ کچھ بھی کہنے سے منع کیا جارہا ہے یا خاموشی کی منظر کشی ہے لیکن پھر ترسیل کا ایک زبردست ریلا ہے جو اپنے Target تک پہونچ ہی جاتا ہے۔

میر کے متعدد اشعار میں زبان، جدت اور فن کاری کے ذریعہ کہیں Communication کام لیا گیا ہے تو کہیں Communication Gape کو پُر کرنے کا کام کیا گیا ہے.... یہاں میر کی زبان پر دسترس اور فن کی پختگی نے ایک Communication Power کی شکل اختیار کرلی ہے.... اور متعدد ایسے اشعار ہیں جن کو پڑھنے کے بعد لگتا ہے کہ کسی ایک شخص، شاعر یا سماج کے فرد کی بات نہیں ہے بلکہ پورے معاشرے کی بات ہے۔ پوری کائنات کا غم ہے جس کی ترسیل کی جارہی ہے یہی نہیں ایسا بھی محسوس ہوتا ہے کہ بات تو ایک ہی شخص کی ہے لیکن اس کو اس سلیقے سے Communicate کیا گیا ہے کہ وہ پوری کائنات میں پھیل گئی ہے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

میر عمداً بھی کوئی مرتا ہے
جان ہے تو جہان ہے پیارے

فقیرانہ آئے صدا کر چلے
میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

دکھائی دیئے یوں کہ بے خود کیا
ہمیں آپ سے بھی جدا کر چلے

دیکھ تو دل کہ جاں سے اٹھتا ہے
یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے

یہ میر کی شاعری کا کمال ہی تو ہے کہ آج کے Communication کے زمانے میں بھی اتنے Dimensions گہرائی اور Productivity دکھتی ہے کہ ہر مقام پر ہمارا ساتھ نبھاتی ہے اور اس میں میر کی خلاقانہ طبیعت اپنے عہد کا المناک منظرنامہ فن پر دسترس اور سادگی میں پرکاری اور عام فہم لفظوں میں بڑی بات کہنے کا ہنر ہی ہے جو انھیں آج بھی خدائے سخن کے لقب کا اکیلا حقدار بناتا ہے۔ میر کا یہ شعر ان کی شخصیت کے لئے عین موزوں ہے۔

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں ○○

خرابہ دلی کا....

(صفحہ ۵۵ کا بقیہ)

اگر ہم یہ کہیں کہ یہ اشعار ہمیں اس لئے ازبر ہو گئے کہ یہ بہت اچھے ہیں تو فاروقی صاحب ناراض ہو جائیں گے کیونکہ ان کا کہنا ہے کہ کسی شعر کا ازبر ہو جانا اس کے اچھے ہونے کی دلیل نہیں ہوتا فاروقی صاحب سے اگر اختلاف کیا جائے تو وہ ناراض ہی نہیں برہم بھی ہو جاتے ہیں چنانچہ ہمیں خاموش ہو جانے میں ہی اپنی عافیت نظر آتی ہے۔

اس مضمون کی ابتدا میں ہم نے میر کے لکھنؤ آنے کا ذکر کیا تھا امجد اسلام امجد نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے:" میر صاحب کو تلاشِ معاش کے لئے دلی چھوڑ کر لکھنؤ جانا پڑا تو معاش میں بہتری کے باوجود وہ بلبلا کر پکار اٹھے۔

خرابہ دلی کا وہ چند بہتر لکھنؤ سے تھا
وہیں میں کاش مر جاتا سراسیمہ نہ آتا یاں" ○

ڈاکٹر ریشماں پروین
صدر شعبۂ اردو، لکھن لکھن جی پی جی گرلس کالج، لکھنؤ

میرؔ تنقید کے دو سو سال

اردو میں تنقید، تنقیدی بصیرت یا تنقیدی شعور جو بھی نام دیا جائے اس کی ابتدا تذکروں سے ہوتی ہے۔ تذکروں کی تنقید کو اہمیت دی جائے یا نہ دی جائے لیکن اس کی تاریخی اہمیت اور اپنے عہد میں ان کی مقبولیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اسی لئے جب کبھی تنقید کا ذکر آتا ہے تو بات تذکروں ہی سے شروع کی جاتی ہے۔ نقد میرؔ کا نقش اول بھی ہمیں اردو تذکروں میں ملتا ہے۔ اردو تذکروں میں میرؔ کے نکات الشعراء کو اولیت حاصل ہے جو ۱۱۶۵ھ مطابق ۱۷۵۲ء لکھا گیا۔ اردو شعراء سے متعلق فارسی اور اردو میں لکھے جانے والے تذکروں کی تعداد تقریباً ۸۰ ہے، میرؔ کی اہمیت کا اندازہ اسی سے لگایا جاسکتا ہے کہ چند کو چھوڑ کر ان تمام تذکروں میں میرؔ کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کیا گیا ہے۔

بعض تذکروں کے مؤلفین میرؔ سے ناخوش تھے خاص طور سے میرؔ کے ہم عصر فتح علی الحسینی گردیزی نے نکات الشعراء کے جواب میں اپنا تذکرہ "تذکرہ ریختہ گویاں" (۱۱۶۶ھ مطابق ۱۷۵۲ء) لکھا اور اس تذکرہ میں میرؔ کے تذکرہ کا حوالہ تک نہیں دیا لیکن میرؔ کی شاعرانہ حیثیت و مرتبے کو وہ نظرانداز نہ کرسکے اسی لئے وہ میرؔ کو "سخن سنج"، "معنی ایجاد" اور "تلاش معنی بیگانہ" جیسی اصطلاحات کے ذریعہ یاد کرتے ہیں۔ گردیزی کا میرؔ کے شاعرانہ مرتبے کا اعتراف اس بات کا ثبوت ہے کہ مخالفین بھی ان کے قدردان تھے۔ گردیزی کے علاوہ تذکرہ شورش کے مصنف میر غلام حسین شورش اور مسرت افزا کے مؤلف ابوالحسن نے میرؔ کے کلام سے زیادہ ذاتی پرخاش کو اہمیت دی۔

حیات میرؔ میں ان تین تذکرہ نگاروں کے علاوہ جن اہم تذکرہ نگاروں نے میرؔ کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے اپنے تاثرات قلم بند کئے ان میں لچھمی نرائن شفیق، قدرت اللہ شوق، مبتلا، ابراہیم، مصحفی، خوب چند ذکا، اعظم الدولہ سرور اور میر حسن نے کلام میرؔ کی ان اہم خصوصیات کی نشاندہی کی جن پر بعد میں ہمارے ناقدین نے نقد میرؔ کی بنیاد رکھی۔ ان تذکرہ نگاروں نے تقریباً دو سو سال قبل میرؔ کی زندگی میں میرؔ کے کلام میں نازک خیالی، معنی آفرینی، تہہ داری جیسی اہم خوبیوں کی طرف اشارے کئے ہیں اس کا مطلب تو یہی ہے کہ میرؔ اپنی زندگی ہی میں اتنے معروف و مقبول تھے کہ ذاتی تاثرات کے ساتھ ان کے کلام کا تنقیدی جائزہ بھی لیا جانے لگا تھا۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ میرؔ کی عظمت کا اعتراف ان کی زندگی ہی میں کیا گیا۔ زبان میرؔ میں روزمرہ اور محاورہ، تشبیہ اور استعارات، نازک خیالی و معنی آفرینی سب کا ذکر تذکرہ نگاروں نے کیا۔ اس طرح میرؔ کی تنقید کے سلسلے میں تذکروں کی اہمیت کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔

میرؔ کی وفات کے بعد لکھے گئے تذکروں میں بھی ان کی عظمت کے اعتراف کا سلسلہ قائم رہا ورنہ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ کسی کی صلاحیتوں کا اعتراف خود اس کے زمانۂ زندگی میں کم کیا گیا ہے انتقال کے بعد میرؔ کے متعلق جو کچھ لکھا گیا وہ ان کی زندگی میں لکھے گئے تذکروں سے زیادہ مفصل اور تنقیدی ہے۔ اعظم علی خاں یکتا میرؔ کے یہاں سحرکار سلطان اقلیم فصاحت، فرمان فرمائے کشور بلاغت، سخن قادر غزل و طرز گفتہ کہ بیچکس نمی تواند، محاوراں افتادان اور ممتنع جیسی صفت کا ذکر کرتے ہیں۔ گارساں دتاسی اور کریم الدین افصح الفصحا و ابلغ بلغاء اور اشعر شعراء قرار دیتے ہیں۔ احمد حسین سحر لکھنوی، ادائے معانی عاشقانہ مضمون اور کلام میں شور انگیزی کی نشاندہی کرتے ہیں احمد حسین اپنے تذکرے میں سب سے پہلے میرؔ کی حرماں نصیبی اور یاس انگیزی کا ذکر کرتے ہیں۔

ان تذکروں کے علاوہ تاریخی تذکروں کے ضمن میں "آب حیات"

"گلِ رعنا"، "اعجازِ سخن" اور "جواہرِ سخن" قابلِ ذکر ہیں۔ ان تذکرہ نگاروں نے شعراء کے بارے میں لکھتے وقت تاریخی ترتیب کو مدِ نظر رکھا ان تذکروں کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ یہ اردو کی ادبی تاریخ کی طرف پہلا قدم ہیں۔ ان تذکروں میں میر سے متعلق ظاہر کی گئیں آراء پہلے تذکروں سے زیادہ جامع ہیں۔ محمد حسین آزاد نے آبِ حیات (۱۸۸۰ء) میں میر کو وارداتِ قلبیہ کا شاعر قرار دیا۔ ان کی تخلیق کوتاہیوں کی طرف اکثر محققین نے نشاندہی کی ہے لیکن میر تنقید میں ان کی رائیں ایک زمانے تک سکہ رائج الوقت رہی ہیں۔ گلِ رعنا کے مصنف نے میر کے متعلق آزاد کے قائم کردہ مفروضات کو رد کرتے ہوئے میر کی حمایت میں قلم اٹھایا۔ البتہ ان کی شاعری پر عبدالحی کوئی تنقیدی رائے نہ دے سکے "اعجازِ سخن" میں شیر علی خاں نے میر کی شاعری میں تشبیہ و استعارے اور لب و لہجہ جیسی خصوصیات کی نشاندہی کی۔ مولوی محمد مبین چریاکوٹی نے میر کی خودداری، بے باکی اور نازک مزاجی کا ذکر کرتے ہوئے انھیں درد و تاثیر کا شاعر قرار دیا۔

تذکروں میں میر کے متعلق لکھی آراء کا مطالعہ اس امر کی وضاحت کرتا ہے کہ خواہ تذکرہ نگاروں نے اپنی بات لکھتے وقت تاثراتی انداز اختیار کیا مگر ان کو کہیں نہ کہیں شعر کی جمالیاتی اور فنی قدروں کا شعور ضرور تھا۔ خود میر نے نکات الشعراء میں جس طرح ریختے طرز کو انداز کا نام دیا اور "انداز" کی تشریح و تعبیر کی وہ ان کی ناقدانہ صلاحیت کی دلیل ہے۔ حالانکہ ہمارے بعض ناقدین (کلیم الدین احمد) نے تذکروں کی تنقید کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھا لیکن دوسرے اہم ناقدین نے اس کا اعتراف کیا کہ تذکروں کا ہر جملہ ہر لفظ اپنے اندر ایک جہانِ معنی سمیٹے ہوئے ہے اور جن میں تنقید و تحسین کے بہت سے پہلو پوشیدہ ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ آج جس بات کو ہمارے ناقدین تفصیل سے بیان کرتے ہیں تذکرہ نگار اسے اختصار کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ خود اگر ہم کلام میر کے متعلق لکھی مختصر آراء کا بغور جائزہ لیں تو اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ تذکرہ نگار نے ان مختصر الفاظ اور جملوں میں میر کی تمام خصوصیات کلام کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ تذکروں کی تنقیدی اہمیت سے اس لئے بھی انکار ممکن نہیں کہ ہمارے کلاسیکی شعراء کے متعلق معلومات کا ذخیرہ تذکروں ہی کے ذریعہ ہم تک پہونچا ہے۔

تذکروں کے بعد اردو تنقید کا جو دور شروع ہوا اس کی دو صورتیں ہیں اول مقدمہ شعر و شاعری اور دوسرے شعر العجم۔ مقدمہ اور شعر العجم میں گو کہ تقریباً ۲۰ سال کا فرق ہے لیکن یہ دونوں کتابیں اردو تنقید کے بنیادی رجحانات کی نمائندگی کرتی ہیں۔

لیکن نقدِ میر کے سلسلہ میں حالی اور شبلی کے عہد میں کوئی قابلِ ذکر کام نہیں ہوا۔ حالی کلامِ میر میں نیچرل شاعری اور دھیمے لہجہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ شبلی موازنہ انیس و دبیر میں ایسا الجھے کہ میر کی طرف توجہ دینے کا انھیں موقع ہی نہیں ملا۔ امداد امام اثر مولانا آزاد کے اثرات سے باہر نہیں نکل سکے وہ میر کو وارداتِ قلبیہ کا شاعر قرار دیتے ہیں اور بس۔

مولوی عبدالحق محمد حسین آزاد کے بعد نقدِ میر کے سلسلہ میں پہلا اہم نام ہے۔ مولوی عبدالحق نے میر کی یاد کو ایک بار پھر تازہ کر دیا اور ان کے بہتر نشتروں کی چبھن پھر محسوس ہونے لگی۔ عبدالحق بھی اپنے تنقیدی رویے کے سلسلہ میں محمد حسین آزاد سے قریب دکھائی دیتے ہیں انھیں میر کا ہر شعر درد دل کی تصویر نظر آتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "ذکرِ میر پڑھنے کے بعد اس بات کا یقین ہو جاتا ہے کہ میر کے کلام کا بہت سا حصہ آپ بیتی اور اپنے دل کی کیفیت ہے۔ ماموں کی زیادتی کے سبب چاند میں کسی شبیہہ کا نظر آنا، "مثنوی خوابِ خیال" قلبی واردات کی تصویر صرف شاعرانہ خیالات نہیں ہیں بلکہ یہ سب میر کے مایوس و حزیں دل پر گذرے ہوئے واقعات ہیں۔ مولوی عبدالحق میر کی شاعری اور شخصیت کے واردات کا ربط قائم کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ان کے کلام کو پڑھ کر ان کی سیرت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے ان کے خیال میں میر کے ایک ایک لفظ میں ان کے قلبی واردات و احساسات کا نقشہ موجود ہے وہ شعر میں اپنا دل نکال کر رکھ دیتے ہیں کہ کس طرح ان کی زندگی ہمیشہ غم و الم کی آماجگاہ بنی رہی۔ گویا وہ اور ان کا کلام ایک ہو گئے ہیں خود میر نے اپنی اس کیفیت کو اس طرح بخوبی بیان کیا ہے۔ ؎

یاد رہے یار لایا اپنی تو یوں ہی گذری

لیکن ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ مولوی عبدالحق میر کی یاسیت انگیزی کے ذکر کے ساتھ بعض ایسے اہم فنی و جمالیاتی نکات کی نشاندہی بھی کرتے ہیں جن کو کلام میر کی اہم خصوصیات قرار دیا جاسکتا ہے. انھوں نے لکھا ہے کہ میر کے کلام میں مشکل استعارات اور بعید از قیاس مبالغہ موجود نہیں. ان کا انداز بیان سادہ ہے اسے ہم سہل ممتنع کا نام دے سکتے ہیں مگر سہل ممتنع کی تعریف عبدالحق ناممکن قرار دیتے ہیں. اسی طرح انھوں نے لکھا ہے کہ میر کی شاعری بظاہر سمندر کی سطح کی طرح دیکھنے میں معمولی اور بے شور و شر نظر آتی ہے مگر اس کی تہہ میں زبردست جوش یا درد چھپا ہے. میر نے سادہ و سلیس الفاظ اور معمولی تراکیب میں بڑے بڑے معنی پوشیدہ کر رکھے ہیں.

عبدالحق نے اپنے دعوے کی دلیل میں میر کے اشعار کے انتخاب بھی دیا ہے ساتھ ہی وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ میر نے نکات الشعراء میں لکھا تھا: "اگر ترکیب فارسی موافق گفتگوئے ریختہ بود مضائقہ ندارد" خود میر نے فارسی تراکیب کا استعمال اسی نقطۂ نظر کے تحت کیا ہے.

مندرجہ بالا باتیں میر کے فن کی طرف اشارہ کرتی ہیں. اگر ان نکات کو ذہن میں رکھ کر میر کی شاعری کا مطالعہ کریں تو یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ چاہے تذکرے ہوں یا ان کے بعد کے مطالعات، میر کی شاعری کی فنی خصوصیات پر ناقدین نے تبصرہ ضرور کیا ہے. حالانکہ عبدالحق کو میر کا اہم نقاد قرار نہیں دیا جاسکتا. لیکن اس کے باوجود نقد میر کے سلسلہ میں ان کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں. مولوی عبدالحق کا مقدمہ انتخاب میر "آب حیات" کے بعد میر کی شعری خصوصیات پر لکھا گیا اہم ترین مقدمہ ہے جس میں انھوں نے میر کی شاعری کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے بعض اہم خصوصیات کی نشاندہی کی ہے اور میر کے فن پر اظہار خیال کرتے ہوئے ان کے یہاں فارسی تراکیب استعمال کی وضاحت کی.

رسالہ نیرنگ کا "میر نمبر" جولائی ۱۹۲۸ء میں شائع ہوا. اس میر نمبر کی اہمیت اس لئے بھی زیادہ ہے کہ اس کی اشاعت سے قبل میر پر نہ تو کوئی باقاعدہ کتاب لکھی گئی تھی اور نہ ہی کسی دوسرے رسالہ کا کوئی میر نمبر شائع ہوا تھا. اس رسالہ میں پہلی بار میر کی شاعری کے تمام پہلوؤں پر تفصیل سے اظہار کیا گیا. میر کی غزل، قصیدہ، مثنوی مرثیہ غرض کوئی ایسی صنف نہیں جس کا ذکر اس رسالے میں لکھنے والے مصنفین نے اپنے مضامین میں نہ کیا ہو. ایک اہم بات یہ ہوئی کہ اس رسالے کے مصنفین مولوی محمد حسین آزاد اور مولوی عبدالحق سے زیادہ مولانا الطاف حسین حالی کے تنقیدی خیالات سے متاثر نظر آتے ہیں چاہے وہ رسالہ کے ایڈیٹر عزیز اللہ خاں عزیز ہوں یا عزیز لکھنوی، سہا مجددی ہوں یا دوسرے مصنفین سب کی تحریروں پر حالی کا اثر غالب نظر آتا ہے.

عزیز اللہ خاں عزیز نے لکھا ہے کہ میر تقی میر حقیقی شاعر ہیں. صداقت، محاکات، سادگی، بیان کی صفائی، بلندئ خیال، باریکی، جوش، روانی و سلاست، ایجاز و اختصار اور جدت ادا جیسی تمام لفظی و معنوی خوبیوں سے میر کا کلام آراستہ و پیراستہ نظر آتا ہے. اسی رسالہ کے دوسرے مصنف عزیز لکھنوی میر کے "فارسی کلام" پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "ذکر میر دیکھنے سے اس بات کا پتہ چلا کہ اکثر اشعار ان کے حالات اور واقعات پر مبنی ہیں.

"رسالہ نیرنگ" میں لکھنے والوں میں سہا مجددی کا مضمون بھی خاصا اہم ہے وہ بھی "واقعیت، جوش اور سادگی کو شعر کی اہم خصوصیات قرار دیتے ہیں. ساتھ ہی تخیل اور محاکات کو شعر کے بنیادی اجزاء. جوش سے ان کی مراد انفعال یا تاثر ہے. یہ تمام خصوصیات میر کے یہاں موجود ہیں مگر ساتھ ہی وہ شعر کی امتیازی شان "اسلوب بیان" کو قرار دیتے ہیں. ان کا کہنا ہے کہ.

> "شاعر کے کمال کا اندازہ اس کے تخیل اور اسلوب بیان سے ہوتا ہے لہٰذا میر کی اہم خصوصیات انفعال اور اسلوب بیان کی سادگی ہے. میر صاحب کی انفعالیت اور تاثر، رنج والم، غم اور یاس کی کیفیت سے معمور ہے اس لئے اس میں ایک ہی قسم کی اثر انگیزی اور ایک ہی قسم کا رنگ پیدا ہوگیا ہے چنانچہ انفعال و تاثر کی افراط، سوز و گداز اور اسلوب بیان کی سادگی میر صاحب کے کلام کے عناصر ترکیبی ہیں." ۱۰

اس رسالہ میں شامل جعفر علی خاں اثر کے مضمون میں بھی کہیں کہیں حالی کے زیر اثر سماجی اثرات موجود ہیں مثلاً انھوں نے لکھا ہے کہ.

"میر جس پر آشوب زمانے میں تھے اور جو واقعات انھوں نے دیکھے یا سنے اور جن مصائب کا ان کو اپنی عمر کے ایک بڑے حصے تک سامنا ہوا ان سب کے نقوش ان کی شاعری میں ملتے ہیں۔" ۲۰

لیکن ساتھ ہی اثر میر کی شاعری کو تمام صوری و معنوی خوبیوں سے آراستہ قرار دیتے ہیں ان کے خیال میں میر کے کلام میں تخیل و محاکات کے بہترین نمونے ملتے ہیں۔ سلاست، صفائی، حسن بندش، لطف، تشبیہ و استعارہ ہر ایک درجۂ کمال پر موجود ہے پھر بھی میر نے حقیقت کو کبھی نظر انداز نہیں کیا۔ ان کے ہر شعر کی تہہ میں ایک عظیم الشان داستاں پنہاں ہے۔

اس رسالہ کے مصنفین میں شامل عشرت رحمانی اپنے مضمون "خیابان میر" میں لکھتے ہیں۔

میر کے تمام کلام میں بیجا تشبیہوں اور استعاروں، بھونڈے اور بعید از قیاس مبالغوں کا ذکر کہیں نہ کہیں ایہام ہے۔ نہ فارسی آمیز اغلاق و اشکال۔ خیالات میں پاکیزگی ہے جذبات میں رفعت ہے۔ واردات و کیفیات صحیحہ کو اس دلکش انداز اور موثر پیرائے میں ادا کیا ہے کہ بے ساختہ "آہ" نکل جاتی ہے نہایت سلیس فصیح اور شستہ ہے۔" ۲۱

عشرت رحمانی میر کی شاعری کی اہم خصوصیت "سادگی" قرار دیتے ہیں میر پر گذرنے والے واقعات کی دلکش ادائگی انھیں متاثر کرتی ہے۔ رسالہ "نیرنگ" کے مضامین میں حالی اور شبلی کے اثرات واضح طور سے موجود ہیں اور کہیں کہیں محمد حسین آزاد کا رنگ بھی نظر آتا ہے۔ ان مضامین میں تاثراتی، جمالیاتی اور سوانحی انداز نقد سے کام لیا گیا ہے۔ نیرنگ کے بعد شائع ہوئی میر پر پہلی باقاعدہ کتاب صفدر آہ کی "فلسفۂ میر" ہے نقد میر میں سماجی تنقید کے آثار بھی نمایاں ہونے لگتے ہیں۔ صفدر آہ صرف میر کی شاعری میں تاریخی عناصر ہی سے بحث نہیں کرتے بلکہ کلام میر پر سماجی اثرات کا جائزہ بھی لیتے ہیں۔

مولوی محمد حسین آزاد، حالی، شبلی، امداد امام اثر اور مولوی عبد الحق کے بعد ترقی پسند تحریک نے نقد میر پر بھرپور توجہ دی۔ یہ تحریک اردو ادب پر توانا تحریک تھی جس نے ادب اور تنقید پر بڑے دور رس اثرات مرتب کئے۔ ترقی پسند تحریک نے قدیم کلاسیکی روایات سے بغاوت کرتے ہوئے ادب کا رشتہ معاصر زندگی سے جوڑا۔ اس تحریک نے ذوق و وجدان سے پرے سماجی شعور اور ادب میں زندگی اور مقصدیت کا نظریہ پیش کیا۔ اس تحریک کے زیر اثر ادب کا تاریخی اور سماجی مطالعہ شروع ہوا اور جیسے جیسے ترقی پسند تحریک کو فروغ ہوتا گیا۔ میر کو سمجھنے پڑھنے اور ان کے مطالعہ کے انداز میں واضح تبدیلی نظر آنے لگی۔ آزاد اور عبد الحق کے اثر سے ناقدین باہر نکلے اور کلام میر پر از سر نو غور کرنا شروع کیا۔ ترقی پسند ناقدین نے میر کی شاعری میں یاسیت و قنوطیت اور واردات قلبیہ کے بجائے زندگی کے تمام رنگوں کی تلاش شروع کی۔ وہ رنگ خواہ تاریخی ہو یا سماجی یا سیاسی غرض ہر اعتبار سے کلام میر کا مطالعہ کیا گیا۔ ترقی پسند تحریک سے میر کی شاعری کی نئی تفہیم و تعبیر سامنے آئی۔ تذکروں سے لے کر عبد الحق اور نیرنگ کے میر نمبر تک میر تقی میر پر جو یاسیت و حزن والم کا لیبل لگا ہوا تھا وہ ہٹ گیا اور میر زندگی سے محبت کرنے والے حوصلہ مند شاعر کی حیثیت سے سامنے آئے۔ مجنوں گورکھپوری نے اپنے مضمون "میر اور ان کی شاعری" ۱۹۳۵ء میں واضح طور پر اس طرف اشارے کئے کہ اگر ہم کسی شاعر کی گذشتہ زندگی سے واقف ہوں تو اسکی نفسیاتی گرہوں اور مخفی واردات تک کامیابی سے پہونچ سکتے ہیں مجنوں گورکھپوری نے اپنے مضمون "میر اور ہم" کا عنوان ہی یہ سوچ کر رکھا کہ ادب اجتماعیت کا ترجمان ہے۔ اپنے مضمون میں انھوں نے کلام میر کی تفہیم و تشریح کے لئے تاریخی سیاق وسباق سے واقفیت اور تاریخ وفن پارے کے باہمی ربط کو ضروری قرار دیا۔ مجنوں گورکھپوری کے علاوہ علی سردار جعفری، احتشام حسین اور محمد حسن نے بھی میر کی شاعری سے ترقی پسند تحریک کے زیر اثر نئے نئے مفاہیم ومطالب اخذ کئے علی سردار جعفری نے لکھا میر نے غزل کو اپنے عہد کا آئینہ بنا دیا۔ جعفری نے اس طرف بھی اشارہ کیا کہ "میر نے اپنے عہد کے مظالم اور انسانی شخصیت کی شکست و ریخت کو علامتوں کے ذریعہ بیان کیا ہے۔ محمد حسن نے میر کے عہد کو آج کے زمانے کے مماثل قرار دیا۔ انھوں نے لکھا کہ جس طرح سے موجودہ صنعتی عہد میں فرد سب کے ساتھ ہو کر بھی تنہا ہے اور عہد حاضر کا انسان جس طرح شکستہ حال ہے۔ وہی حالت میر کے دور کے انسان

کی بھی تھی۔

غرض یہ کہ ترقی پسندوں نے کلام میر کو نئے مفہوم و معنی عطا کئے انھوں نے میر کی شاعری میں ان کے عہد کی تصویر ہی کی تلاش نہیں کی بلکہ میر کو ایک ایسا شاعر قرار دیا جو غموں، مصیبتوں اور پریشانیوں کا مردانہ وار مقابلہ کرتا ہے۔ میر غموں کے آگے ہتھیار نہیں ڈالتے بلکہ دل پر خوں کی اک گلابی سے لڑنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ یہ ایک نیا رخ تھا۔ جو بڑا توانا اور مضبوط رخ تھا جس نے بہت گہرا اثر میر کے مطالعہ پر ڈالا۔

ترقی پسند نقطۂ نظر کے بعد میر تنقید کا ایک بڑا دور ہے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۲ء تک میر شناسی کا ایک نیا باب کھل گیا۔ اس دور میں مطالعۂ میر کے تین واضح ابعاد نظر آتے ہیں۔ پہلا کلاسکی سوانحی اور فنی نقطۂ نظر رکھنے والا جس میں صفدر آہ، جعفر علی خاں اثر خواجہ احمد فاروقی سید عبداللہ اور فراق کے نام لئے جاسکتے ہیں۔ ان لوگوں نے میر کا مطالعہ بہت تفصیل سے کیا اور ان تمام اثرات کو تلاش کرنے کی کوشش کی جو میر کی شاعری مثلاً غزلوں مثنویوں اور دوسری اصناف میں مل سکتے تھے۔ صفدر آہ کو میر کے پہلے ایسے ناقد ہونے کا شرف حاصل ہے جس نے میر پر سب سے پہلی باقاعدہ کتاب لکھی ان کی اہم تصنیف فلسفۂ میر ۱۹۴۶ء میں شائع ہوئی جس میں انھوں نے میر کی زندگی کے اہم واقعات، ان کے کردار، عہد میر کی زبان، میر کی تصنیفات، میر کی شاعری اور خصوصیات شاعری پر تفصیل سے اظہار خیال کیا۔ انھوں نے لکھا کہ ”میر کی شاعری سادہ و سلیس ہے۔ تصنع کے ناپاک ہاتھ ان کی شاعری تک کبھی نہ پہونچ سکے۔“ ”صفدر آہ“ ”فلسفۂ میر“ میں کہیں کہیں میر کی شاعری کو ان کی زندگی سے بھی ہم آہنگ کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ ”میر کا کلام ان کی زندگی اور ان کے کردار کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ ان کی دوسری کتاب ”میر اور میریات“ ہے جو ۱۹۷۲ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کا پہلا حصہ سوانحی، تاریخی اور تہذیبی ہے اور دوسرے حصہ میں میر کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ کیا گیا ہے۔ صفدر آہ اپنی دونوں تصانیف میں ترقی پسند تحریک سے متاثر نظر آتے ہیں۔ ترقی پسند تنقید کے اثرات ان کی دونوں کتابوں میں موجود ہیں۔ ”میر اور میریات“ کے دیباچے کا یہ جملہ اس طرف بخوبی اشارہ کرتا ہے کہ میر جیسا بڑا شاعر ایک اہم پس منظر کے بغیر نہیں پیدا ہوتا۔“

صفدر آہ کی ”فلسفۂ میر“ کے بعد ۱۹۴۷ء میں جعفر علی خاں اثر کا انتخاب کلام میر ”مزامیر“ کے عنوان سے شائع ہوا۔ جعفر علی خاں اثر پہلے بھی میر پر بہت مضامین لکھ چکے تھے۔ ان کا مطالعہ جمالیاتی اور فنی نقطۂ نظر کا حامل ہے۔ فلسفۂ میر کے بعد لکھی گئی پہلی مبسوط کتاب خواجہ احمد فاروقی کی ”میر حیات اور شاعری“ ۱۹۵۴ء ہے یہ کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے جس میں میر کی حیات اور شاعری پر ان کے عہد کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے۔ خواجہ احمد فاروقی نے لکھا ہے۔

”۔۔۔۔۔ ان (میر) کی شاعری کی پشت پر اردو کے ارتقاء کی تاریخ ہے۔ اور اس میں برسہا برس کی روایات، تمدنی وراثت، تاریخی اور تہذیبی عوامل کی جلوہ گری ہے۔“ ص۴

خواجہ احمد فاروقی کی یہ رائے تنقید میر کے سلسلہ میں کئی بنیادی اشارے کرتی ہے مثلاً یہ کہ میر کی شاعری اردو کے ارتقاء کی تاریخ ہے اس میں شک نہیں کہ میر نے زبان کا جس طرح استعمال کیا ہے اور عام بول چال کے الفاظ سے جو فائدہ اٹھایا ہے وہ کسی دوسرے شاعر کے بس کی بات نظر نہیں آتی۔ اسی لئے خواجہ احمد فاروقی نے اسے اردو کے ارتقاء کی تاریخ قرار دیا ہے۔ ساتھ ہی ان کے یہاں میر کے تاریخی ماحول کے ان کے کلام پر اثرات کی نشاندہی بھی بخوبی کی گئی ہے۔ خواجہ احمد فاروقی نے لکھا ہے کہ میر نے شعر نہیں بلکہ دل اور دلی کے مرثیے لکھے ہیں۔

بقول خواجہ احمد فاروقی میر کی غزلوں میں سماجی شعور پایا جاتا ہے تاریخی سچائیاں جھلکتی ہیں۔ جہاں انھوں نے اپنے انفرادی جذبات کا اظہار کیا ہے وہاں بھی اجتماعی حقیقتیں الفاظ کے جھروکوں سے جھانکتی ہیں۔

خواجہ احمد فاروقی نے میر کو خوددار، ضبط کرنے والا اور زندگی کی پریشانیوں کا مقابلہ ہمت و حوصلے سے کرنے والا شاعر قرار دیا۔ اس طرح انھوں نے میر کو کئی انداز میں پرکھا۔ میر کی شاعرانہ خصوصیات داخلیت، خارجیت، تصور حسن و عشق، فلسفۂ غم، نشتریت، سہل ممتنع

اور خاص طور پر میر کے انتخاب الفاظ کی داد دیتے ہوئے خواجہ احمد فاروقی نے ان کے یہاں ہندی اور فارسی الفاظ کے امتزاج سے اردو زبان کو وسعت بخشنے کی بات کہی اس طرح خواجہ احمد فاروقی کے یہاں سوانحی سماجی جمالیاتی اور فنی عناصر ایک ساتھ یکجا ہو گئے ہیں۔

اثر لکھنوی کو تو میر کا پرستار کہا گیا ہے۔ انھوں نے میر کے خلاف بہت سی بدگمانیوں کا طلسم توڑا۔ ان کا انداز تنقید فنی، جمالیاتی و تشریحی ہے۔ مزامیر میں میر پر کئے گئے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے میر کے محاسن شعری پر گفتگو کی ہے:

"میر کی شاعری تمام ظاہری و معنوی خوبیوں سے آراستہ ہے تخیل اور محاکات کے بہترین نمونوں کے علاوہ دیگر محاسن مثلاً سلاست، صفائی، حسن بندش، لطف، تشبیہ و استعارہ اور ہر ایک درجۂ کمال پر موجود، پھر لطف یہ کہ باوجود اس ہمہ گیر تخیل اور قوت اختراع کی آخری حدوں پر پہونچنے کے میر نے "حقیقت" کو کبھی نظر انداز نہیں کیا زندگی کا شاید ہی کوئی ایسا پہلو ہو جس کی مصوری میر نے بہترین الفاظ اور موثر ترین پیرائے میں نہ کی ہو۔ ان کے اکثر اشعار سہل ممتنع ہیں اور صاف و سادہ الفاظ میں معانی کا ایک دریا موجزن ہے۔" ۵

اس ایک اقتباس ہی سے اثر لکھنوی کا فنی انداز تنقید نمایاں ہوتا ہے مگر ساتھ ہی یہ اقتباس اس طرف بھی اشارہ کرتا ہے کہ اثر لکھنوی کہیں نہ کہیں سماجی نقطۂ نظر بھی رکھتے تھے۔ بہرحال میر کا مطالعہ انھوں نے واضح طور سے جمالیاتی و فنی انداز میں کیا۔

صفدر آہ، جعفر علی خاں اثر، خواجہ احمد فاروقی، سید عبداللہ نثار احمد فاروقی یہ وہ ناقدین ہیں جنھوں نے میر کے مطالعہ میں میر کے یہاں پائی جانے والی جمالیاتی اور فنی خوبیوں کی بھی نشاندہی کی۔ میر کی زندگی اور حالات پر تفصیل سے گفتگو کی۔ شاعری پر سوانحی اثرات کا مطالعہ کیا اور ساتھ ہی میر کی زبان، الفاظ اور ان الفاظ کی معنویت کا مطالعہ کرکے میر کی عظمت کو نمایاں کرنے کی کوشش کی۔

فنی و جمالیاتی انداز تنقید سید عبداللہ کے یہاں بھی ملتا ہے مگر ان کا زیادہ زور میر کی شاعری میں سوانح پر رہے۔ وہ سوانح کے حوالے سے شاعری یا شاعری کے حوالے سے سوانح کے عناصر کو نشان زد کرتے ہیں جس کی وجہ سے میر کی نفسیات، سوانح اور شاعری سب آپس میں خلط ملط ہو جاتی ہیں کہیں کہیں وہ سماجی تنقید سے بھی متاثر نظر آتے ہیں اور میر کو زندگی کے زخموں پر پھاہا اور مرہم رکھنے والا شاعر بھی قرار دیتے ہیں۔

جعفر علی خاں اثر، خواجہ احمد فاروقی، سید عبداللہ، نثار احمد فاروقی اس عہد سے تعلق رکھتے ہیں جس نے ترقی پسند تحریک کا عروج دیکھا۔ یہ ناقدین براہ راست ترقی پسند تحریک سے وابستہ تو نہیں رہے لیکن ان پر تحریک کا اثر ضرور پڑا۔ جعفر علی خاں اثر، خواجہ احمد فاروقی یا نثار احمد فاروقی بنیادی طور پر جمالیاتی ناقد ہیں وہ ادبی تخلیق میں فنی محاسن، زبان کے نکات اور بدیع و بیان پر توجہ دیتے ہیں۔ مطالعہ میر کے سلسلہ میں سید محمد عبداللہ کے مضامین سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ میر کو بہتر طریقے سے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اثر لکھنوی کلام میر سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور اس لطافتِ کلام کو دوسروں تک پہونچانا چاہتے ہیں۔ انھوں نے جس خوبصورتی سے میر کے کلام کے محاسن کو واضح کیا ہے اس نے تفہیم میر میں آنے والی نسلوں کی مدد کی نثار احمد فاروقی ایک محقق اور اسکالر ہیں۔ انھوں نے "ذکر میر" کے ترجمے، دلی کالج میگزین کے "میر نمبر" کی ترتیب اور میر پر اپنے مضامین کے ذریعہ میر کی فنی اہمیت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی۔ وہ صرف سوانحی اور سماجی مطالعہ نہیں کرتے بلکہ میر کے محاسن خواہ وہ زبان سے تعلق رکھتے ہوں، اظہار بیان سے یا فکر سے۔ انھیں واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس طرح مطالعہ میر کے اس فنی و جمالیاتی نقطۂ نظر میں ان تمام ناقدین کی تاریخی اہمیت ہے۔

اردو تنقید میں یہ دور تنقیدی نظریات کے فروغ کا دور کہا جاسکتا ہے اس لئے کہ اس زمانے میں بیک وقت تنقید و تفہیم کے کئی رجحانات نظر آتے ہیں۔ جمالیات اور فنی تنقید اور ترقی پسند تنقید کے تحت میر تنقید میں جو اضافے ہوئے ان کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ کم و بیش اسی عہد میں نفسیاتی دبستان کو بھی فروغ ہوا۔ تنقید کا یہ رجحان بھی مغربی اثرات

کے تحت آیا. مشہور ماہر نفسیات فرائڈ کے نظریہ لاشعور یونگ کے نظریہ نسلی لاشعور Archytypal اور ایڈلر کے احساس Complexes کے نظریات کے تحت ادبی تخلیقات کا مطالعہ کرنے کی کوشش کی گئی یوں تو فرائڈ، ایڈلر اور یونگ نفسیات میں ایک دوسرے سے الگ دبستان کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن اردو تنقید میں جہاں کہیں کسی شاعر یا ادیب کی تخلیقات کا نفسیاتی مطالعہ کیا گیا ہے وہاں کبھی علاحدہ کسی نقطہ نظر کے تحت اور کبھی سب کو ملا کر شاعر کی تفہیم کی کوشش کی گئی.

میر تنقید کے ابعاد میں نفسیاتی تنقید کو بھی ایک رجحان کی حیثیت حاصل ہے اس لئے کہ بعض ناقدین نے میر کا مطالعہ ان کے نہاں خانوں میں جھانک کر ان کی شاعری میں پوشیدہ نفسیاتی محرکات کو تلاش کرنے کی کوشش کی. یہ مطالعہ نہ صرف یہ کہ میر کی شاعری کو ایک نئے انداز میں پیش کرتا ہے بلکہ خود میر کی زندگی سے پردہ اٹھانے کی کوشش کرتا ہے. خاص طور پر شبیہہ الحسن اور حسن عسکری کے مضامین میں مطالعہ میر کا یہ رخ دیکھا جاسکتا ہے.

تنقید میں جدیدیت Modernism کے تحت آنے والے رجحانات، لسانیاتی تنقید، اسلوبیاتی تنقید، ساختیاتی تنقید وغیرہ سے مابعد جدیدیت تک کئی رجحانات ہیں جن کے تحت جدید اور قدیم ادب کو سمجھنے کی کوشش کی گئی. یہ تمام رجحانات بنیادی طور پر جدیدیت کی شاخیں ہیں. ان نظریات کے تحت جن ناقدین نے میر پر قابل ذکر کام کیا ان میں شمس الرحمن فاروقی، گوپی چند نارنگ، وزیر آغا، وارث علوی، حامدی کاشمیری، قاضی افضال حسین اور محب عارفی وغیرہ کے نام لئے جا سکتے ہیں. جنھوں نے نو تنقید، ہیئتی، اسلوبیاتی تنقید یا کسی اور رجحان کے تحت میر کی تشریح و تعبیر کا کام انجام دیا.

قاضی افضال کی کتاب ,, میر کی شعری لسانیات ،، ۱۹۸۳ء میں میر کی شاعری کا مطالعہ ہیئتی نقطۂ نظر سے کیا گیا ہے. ہیئتی تنقید میں ان تمام شاعرانہ وسائل کا تنقیدی جائزہ لیا جاتا ہے جنھوں نے کسی شاعر کے کلام کو عظیم بنایا. یہ فنکارانہ وسائل دراصل عمل اظہار کو سطح پر نمایاں کر کے اسے ادب پارے کا پیش منظر بنا دیتے ہیں قاضی افضال حسین کی کتاب میر کی شعری لسانیات میں میر کی شاعری کی تحسین و تنقید کی بنیاد ہیئت و زبان کے بعض بنیادی معتقدات پر رکھی گئی ہے. انھوں نے میر کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے ان کے لسانی رویہ کو اپنی تنقید کا موضوع بنایا. ہیئت پسندوں کے نزدیک ادب ایک لسانی ساخت ہے مگر ادب میں برتی جانے والی روزمرہ کی زبان حادی محرک یا جمالیاتی وظیفے کے ہاتھوں منقلب ہو جاتی ہے یہی میر نے بھی کیا. ان کی زبان روزمرہ ہونے کے باوجود فنکارانہ وسائل کے ذریعہ شاعری کی زبان میں منقلب ہو گئی. قاضی افضال حسین نے ان تمام لسانیاتی رویوں کی نشاندہی کی ہے جنھوں نے میر کی زبان کو تبدیل کر دیا اس طرح قاضی افضال حسین نے ہیئتی نقطۂ نظر سے میر کا مطالعہ کیا اور ابعاد میر میں ایک نئی جہت کا اضافہ کیا.

تنقید کا اہم رجحان اسلوبیاتی تنقید بھی رہا ہے. گوپی چند نارنگ کی ,, اسلوبیات میر ،، ۱۹۸۵ء اسکی نمائندہ کتاب ہے. اسلوبیات کے پیش نظر ادبی تحریریں زبان کے وسیلہ سے مطالعہ کا ایک گوشہ ہیں اس نقطۂ نظر کے تحت ایک خیال کا اظہار مختلف طریقوں سے کیا جاسکتا ہے جس میں سے مصنف کسی ایک طریقے کو شعوری لاشعوری ذاتی پسند یا قاری کے مطالبات کے تحت مخصوص الفاظ یا تراکیب کے انتخاب کی شکل میں اختیار کرتا ہے. گراہم ہاگ کا کہنا ہے.

,, اسلوبیات دراصل زبان کا مطالعہ ہے ،، ؁۱

اسلوبیات عام طور پر زبان کے استعمال سے بحث کرتی ہے اور زبان کے استعمال کے بے شمار پہلو ہیں ان میں سے اسلوبیاتی مطالعہ کرنے والا نقاد کسی پہلو پر زیادہ زور دے سکتا ہے. گوپی چند نارنگ نے ,, اسلوبیات میر ،، میں کلام میر کا جائزہ لیتے وقت تخلیقی اظہار کے جملہ امکانات کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے جن کا استعمال میر نے کیا. گوپی چند نارنگ تمام لسانی امتیازات کو نشان زد کرتے ہیں جن کی وجہ سے میر کی شناخت ممکن ہو. ان امتیازات کو انھوں نے درج ذیل اقسام میں بیان کیا ہے.

۱. صوتیاتی : یعنی آوازوں کے نظام سے جو امتیازات قائم ہوتے ہیں. ردیف و قوافی کی خصوصیات یا معکوسیت، ہکاریت یا غنیت کے امتیازات، مصمتوں اور مصوتوں کا تناسب وغیرہ.

۲. لفظیاتی : خاص نوع کے الفاظ کا اضافی تواتر، اسماء، اسماء صفت افعال وغیرہ کا تواتر اور تناسب، تراکیب وغیرہ۔
۳. نحویاتی : کلمے کی اقسام میں سے کسی کا خصوصی استعمال، کلمے میں در و بست وغیرہ۔
۴. بدیعی : Rhetorical بدیع و بیان کی امتیازی شکلیں، تشبیہ، استعارہ، کنایہ، تمثیل، علامت، امیجری وغیرہ۔
۵. عروضی : امتیازات، اوزان، بحروں وغیرہ کا خصوصی استعمال اور امتیازات۔

گوپی چند نارنگ نے اپنے بیان کردہ ان تمام امتیازات کی تلاش میر کے کلام میں کی۔ انھوں نے اپنے مضمون میں لکھا ہے۔

"اسلوبیات میر" میں سارے ادبی مباحث، اپنی ذہنی غذا اسلوبیاتی تجزیہ سے حاصل کرتے ہیں اور یہ اسلوبیاتی تجزیہ نحوی بھی ہے، صرفی بھی اور صوتیاتی بھی۔" ۷

گوپی چند نارنگ نے میر کی شاعری کی اہم خصوصیت سہل ممتنع پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

"..... میر کے یہاں جس بڑے پیمانے پر زبان کی عام ساخت یعنی جملے کی ساخت برقرار رہتی ہے ان کی قدرت کا کھلا ہوا ثبوت ہے...... دو مصرعوں میں Nodes کا وقوع فطری ہے (اگر مصرعے نحوی طور پر مربوط ہوں یعنی ایک میں خبر ہو اور دوسرے میں مبتدا تو node ایک ہی ہوگا لیکن میر کے یہاں اکثر و بیشتر تین یا اس سے زیادہ Nodes ملتے ہیں یہ بالذات نحوی واحدے اور ان کی نظری ساخت سہل ممتنع کی وہ اسلوبیاتی بنیاد ہے جس کی وضاحت قدیم شعریات میں ناممکن تھی۔" ۸

گوپی چند نارنگ نے لکھا ہے کہ میر کی زبان میں آگرہ کی برج بھاشا اور دہلی کی کھڑی بولی کی تمام خصوصیات موجود ہیں۔ میر کو پوری اردو کا شاعر قرار دیتے ہیں۔

گوپی چند نارنگ نے جس خوبصورتی سے میر کی شاعری کا اسلوبیاتی تجزیہ کیا ہے وہ ان کی ناقدانہ بصیرت کا آئینہ دار ہے اور میر تنقید میں ایک نئے باب کا اضافہ ہے۔

نقد میر کی جدیدیت پر کسی طرح کی بھی گفتگو شمس الرحمن فاروقی کے حوالے کے بغیر نامکمل کہی جائے گی۔ اردو میں جدیدیت کا آغاز ۶۰-۱۹۵۵ء سے ہوا۔ جدیدیت نے دوسری اصناف کے ساتھ اردو تنقید پر بھی گہرے اثرات چھوڑے۔ تنقید میر پھر اس سے کیسے علاحدہ رہ سکتی تھی۔ حامدی کاشمیری، قاضی افضال حسین، گوپی چند نارنگ نے ہیئتی اور اسلوبیاتی نقطۂ نظر سے میر کی شاعری کا مطالعہ کیا۔ نقد میر کے اسی سلسلہ کو شمس الرحمن فاروقی نے نوتنقید New Criticism کے زیر اثر "شعر شور انگیز" (۹۰-۱۹۹۴) لکھ کر ایک نئی فکر کا اضافہ کیا۔ شعر شور انگیز میں ایک طرف انھوں نے کلاسیکی شعریات کی بازیافت کی تو دوسری طرف نوتنقید کے نقطۂ نظر کے زیر اثر "متن" کو اہمیت دی۔ اردو میں شمس الرحمن فاروقی نوتنقید کے بنیادگزاروں میں سے ہیں۔ ان کی تنقید پر اسلوبیاتی تنقید کے اثرات بھی صاف جھلکتے ہیں۔ بقول شارب ردولوی "مغربی نقادوں میں ڈاکٹر شمس الرحمن فاروقی سب سے زیادہ آئی اے رچرڈس سے متاثر ہیں۔ وہ نوتنقید کے اصولوں پر آئی اے رچرڈ کی طرح ہی زور دیتے ہیں۔ شمس الرحمن فاروقی کے خیال میں متن کے مطالعہ ہی سے ہم فن پارے کے بارے میں کوئی نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں۔ لکھتے ہیں۔

"اصل مسئلہ تو یہ ہے کہ ادب کیا ہے اور اس کو حل کرنے کی صورت یہ ہے کہ بجائے نظری اور عملی تنقید کی خشک کتابوں کی ورق گردانی کی جائے خود ادب ہی کو پڑھا جائے اور پرکھا جائے۔" ۹

اس اقتباس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ شمس الرحمن فاروقی ان تمام نظریات سے زیادہ جو مطالعۂ ادب یا ادب کی اقدار کے تعین کے سلسلہ میں رائج ہیں "متن" کو اہمیت دیتے ہیں۔ پروفیسر شارب ردولوی نے لکھا ہے۔

"شمس الرحمن فاروقی ادبی تخلیق کی Close Reading کے قائل ہیں وہ ادبی تخلیق کے سطحی معنوں تک محدود نہیں

رہتے بلکہ اس کی داخلی ہیئت میں پوشیدہ مفاہیم کو تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی نگاہ میں استعارے علامت، رعایت لفظی اور دوسری صنعتوں کی خاص اہمیت ہے جو شعر میں تہہ داری اور معنوی وسعت پیدا کرتی ہیں وہ ایک طرف زبان و بیان کی خوبیوں اور صنعتوں کے حسن کی نشاندہی کرتے ہیں تو دوسری طرف علامات اور شعری ساخت میں اشاراتی نظام کے مطالعہ پر زور دیتے ہیں۔"[۱۴]

شمس الرحمن فاروقی کی تفہیم غالب اور شعر شور انگیز اردو میں متن کے مطالعہ کی بہت کامیاب مثالیں ہیں خصوصاً میر پر لکھی گئی "شعر شور انگیز"۔ ان کے ادبی نقطۂ نظر کی واضح مثال ہے۔ اس کتاب کی چاروں جلدوں میں انھوں نے متن کی Close Reading کے ذریعہ محاسن کلام میر کی جس طرح تلاش کی ہے وہ اردو میں نو تنقید کی خوبصورت مثال ہے۔

شمس الرحمن فاروقی کو اردو تنقید میں ایک ناقد اور ایک شارح کی حیثیت سے منفرد مقام حاصل ہے۔ انھوں نے تفہیم میر کے سلسلہ میں ایک نئے تنقیدی نظریہ کو پیش کیا ہے یہ نظریہ نو تنقید کے مغربی رجحان سے شروع ضرور ہوا لیکن اس کی آبیاری فارسی بدیع اور سنسکرت کا دیہ شاستر سے ہوئی جس نے شعر فہمی کا بالکل نیا نظریہ پیش کیا اس نظریہ سے کسی کو کہیں پر جزوی اختلاف ہو سکتا ہے لیکن اس کی اہمیت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ جدیدیت اور مابعد جدیدیت یا کوئی بھی جدید تر رجحان جس کے تحت اردو ادبیات کو پرکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس نے میر تنقید کو کسی نہ کسی طرح ضرور متاثر کیا ہے۔

حواشی

۱. سہا مجددی۔ میر تقی میر اور ان کا کلام۔ ص ۳۲۔ مشمولہ رسالہ نیرنگ میر تقی میر نمبر۔ مطبع سیدی۔ ریاست رام پور۔ جولائی ۱۹۲۸ء

۲. جعفر علی خاں اثر۔ گلشن میر ص ۲۷۔ مشمولہ رسالہ نیرنگ میر تقی میر نمبر مطبع سیدی۔ ریاست رام پور۔ جولائی ۱۹۲۸ء

۳. عشر رحمانی۔ خیابان میر ص ۱۱۵۔ مشمولہ رسالہ نیرنگ۔ میر تقی میر نمبر مطبع سیدی۔ ریاست رام پور۔ جولائی ۱۹۲۸ء

۴. خواجہ احمد فاروقی۔ میر حیات اور شاعری۔ ص ۴۸۔ انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ۔ جولائی ۱۹۵۴ء

۵. جعفر علی خاں اثر۔ مزامیر۔ ص ۲۵۔ مقدمہ جلد اول کتابی دنیا لمیٹڈ دہلی ۱۹۳۴

۶. Style and stylisties and Graliam houg Plx

۷. گوپی چند نارنگ۔ اسلوب۔ اور اسلوبیات ص ۲۴۲۔ مشمولہ ترقی پسندی، جدیدیت مابعد جدیدیت۔ ندیم احمد، بھارت آفسیٹ دہلی ۲۰۰۴

۸. گوپی چند نارنگ اسلوبیات میر۔ صفحہ ۲۵-۲۵ ناز آفسیٹ ورکس دہلی۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۸۵ء

۹. گوپی چند نارنگ، اسلوبیات میر صفحہ ۲۶۔ ناز آفسیٹ ورکس دہلی ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۸۵ء

۱۰. شمس الرحمن فاروقی۔ لفظ و معنی ص ۱۱۔ شب خون کتاب گھر الہ آباد ۱۹۶۸

۱۱. شارب ردولوی، نو تنقید، شکاگو تنقید، رد تعمیر، قاری اساس تنقید، غیر مطبوعہ مضمون۔

۱۲. شمس الرحمن فاروقی۔ شعر شور انگیز جلد دوم ص ۴۔ ترقی اردو بیورو دہلی ۱۹۹۲ء

۱۳. علی سردار جعفری، ہم دونوں میر کے عاشق ہیں۔ ص ۸۱ مشمولہ رسالہ کتاب نما۔ نومبر ۱۹۹۴ء

۱۴. ڈاکٹر عقیل احمد صدیقی، تعبیر اور تنقید۔ مشمولہ علم شرح تعبیر اور تدریس متن۔ مرتبہ پروفیسر نعیم احمد ص ۹۱۔ شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۹۹۵ء



کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آگیا
یکسر وہ استخوان شکستوں سے چور تھا

کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر
میں بھی کبھو کسو کا سر پر غرور تھا

— میرؔ

رئیس الشاکری
علامہ شبلی لائبریری ندوۃ العلماء، لکھنؤ

میر کی غزلوں میں تصوّف

تصوّف دوسری صدی ہجری کی پیداوار ہے۔ اس سے عبادت و ریاضت کی زندگی کرنے والے لوگ "عابد اور زاہد" کے نام سے یاد کیے جاتے تھے۔ دوسری صدی ہجری کے بعد تصوف کی اصطلاحیں وجود میں آئیں اور دنیاداریوں کو تج دینے والے "صوفی" کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔

۴۳۰ ہجری میں "حلیۃ الاولیاء" کے نام سے دس جلدوں پر مشتمل حافظ ابونعیم الاصفہانی کی تصنیف میں خلفائے اربعہ اور بہت سے عابد و زاہد صحابہ اور تابعین کو صوفیاء اور اولیا کے گروہ میں شمار کیا گیا ہے۔

سب سے پہلے حارث بن اسد محاسبی نے تصوف کو علمی شکل میں پیش کیا۔ حارث بن اسد کی نشو و نما سخت ترین مجاہدات کے ماحول میں ہوئی وہ مال اور مالداروں کے سخت مخالف تھے اور اپنے ہر وعظ میں مال داروں کی انتہائی مذمت کرتے تھے۔ خوش حالی اور قابل ذکر فارغ البالی کے باوجود فقر و فاقہ ان کی زندگی تھی۔ اپنے والد کا متروکہ لینے سے انھوں نے صرف اس لئے انکار کر دیا کہ وہ تقدیر کے قائل نہیں تھے حارث بن اسد محاسبی حضرت جنید بغدادیؒ کے شیخ تھے، ۲۴۳ ہجری میں حارث بن اسد محاسبی کی وفات ہوئی۔

دوسری اور تیسری صدی ہجری میں کئی بزرگ بڑی شان والے گذرے ہیں جن کے ملفوظات آگے چل کر علم تصوف کے بنیادی مسائل قرار پائے۔

تصوف کی نشو و نما کو ایران کی سرزمین راس آئی۔ ایرانی شعر و ادب پر بھی تصوف نے گہرے اثرات ڈالے اور تصوف کے رنگ روپ پوری دل آویزی کے ساتھ نگاہوں میں آگئے۔ رومی، سنائی، عطار، سحابی کی شاعری تصوف کے اعلا خیالات اور تصوف کی پاکیزگی کا آئینہ خانہ ہے۔ یہ لوگ سچے اور حقیقی معنوں میں صوفی صافی تھے اور ان کی شاعری صوفیانہ شاعری تھی۔ سعدی حافظ کی شاعری صوفیانہ شاعری کی معتبر ترین مثال ہے۔ فارسی شاعری کا یہ خوبصورت اثر اردو شاعری نے نمایاں حد تک قبول کیا لیکن عجیب بات ہے کہ اردو شاعری نے کوئی بڑا صوفی شاعر نہیں پیدا کیا۔

خواجہ میر دردؔ کو صوفی شاعر کہا گیا ہے اور واقعہ بھی یہ ہے کہ خواجہ میر دردؔ اپنی پاکیزہ زندگی اور خاندانی وجاہتوں کے اعتبار سے صوفی صافی تھے۔ ان کی شاعری اعلیٰ درجے کی شاعری ہے لیکن ان کی شاعری صوفیانہ شاعری تھی۔ اس باب میں بالغ اہل نظر اختلاف رائے رکھتے ہیں۔ اگرچہ ترک دنیا، عبادت و ریاضت کے اثرات کے ساتھ ساتھ تصوف کی اصطلاحیں خواجہ میر دردؔ کی غزلوں کو وقار ضرور بخشتی ہیں لیکن ان کی شاعری کو صوفیانہ شاعری کہنا تحقیق و تدقیق کی منزل میں محل نظر ہے۔

صوفیانہ شاعری کو غزل کا مزاج راس بھی نہیں آتا۔ صوفیانہ شاعری کے فروغ میں مثنوی کی صنف کا بنیادی کردار ہے۔ تصوف کے بیکراں تصورات، اسکی عظیم الشان تہہ داریاں تصوف کے پاکیزہ اور انتہائی لطیف خیالات کی چمن بندی کے لئے غزل سے کہیں زیادہ مثنوی کی زمین زرخیز ثابت ہوئی ہے۔ فارسی کے صوفی شعراء کی غزلیں بھی صوفیانہ ابلاغ و تبلیغ کے جواہر پاروں سے چھلک رہی ہیں لیکن تصوف کے بنیادی مسائل اور تصوف کے مرکزی خیالات مثنویوں ہی کے حوالے سے روشنی میں آئے ہیں۔ در اصل مثنوی بیانیہ صنف سخن ہے۔ کتنے ہی گہرے اور پیچیدہ مضامین کیوں نہ ہوں۔ مثنوی کی یہ صفت ان کی تفصیلات کو دوسرے اجزا کی آمیزش کے بغیر

محفوظ کر لیتی ہے اور نمایاں بھی رکھتی ہے البتہ صنفِ غزل چوں کہ اشاروں، کنایوں اور استعاروں سے عبارت ہوتی ہے اور غزل کی زبان میں ایجاز و اختصار اور لفظی کفایت شعاری کی ایسی بلیغ زیریں لہریں ہوتی ہیں جو نازک سے نازک اور پیچیدہ سے پیچیدہ خیال کو جذب کر لینے کی صلاحیت تو رکھتی ہیں مگر باز آفرینی کی منزل پر تفصیلات کا ساتھ دینے سے معذور اور قاصر نظر آتی ہیں۔ اشاریت اور معنوی تہہ داریوں کا یہی رنگ غزل کی شاعری کا مرکزی حسن ہے اور اسی صفت نے غزل کو آبروئے سخن کا درجہ مرحمت کیا ہے۔

عاشقانہ جذبات کو انسانی زندگی میں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ محبوب حقیقی ہو یا مجازی عاشقانہ فکر و نظر کے دونوں ہی حاصل اور مقصود ہیں اس طرح صوفی ہو یا عاشق دونوں کی زبان اور دونوں کا وسیلۂ اظہار یکساں دکھائی دیتا ہے۔ فرقِ مراتب کا انکار ممکن نہیں لیکن جس طرح ''لفظ عاشق'' سے صوفی مراد ہرگز نہیں ہوتا اسی طرح ''لفظ صوفی'' کا اطلاق عاشق پر کبھی نہیں ہوگا جبکہ دونوں عاشقانہ لفظیات میں قدر مشترک رکھتے ہیں۔

غزل کی زبان عشق کی زبان ہوتی ہے۔ مبالغہ کا رنگ و روغن غزل کو اس طرح دلکش اور تہہ دار بنا دیتا ہے کہ غزل کسی بھی صنفِ سخن کو خاطر میں نہیں لاتی۔ شاید اسی لئے غزل کے شعر مجاز اور حقیقت دونوں کے لئے دلیل ہوتے ہیں۔ غزل کی یہ کافرانہ ادائیں صوفیانہ خیالات کو دلکشی تو دیتی ہیں لیکن ان کی قطعیت کو باقی رکھنے میں ساتھ نہیں دے پاتیں بلکہ غزل کے اشعار کی سمت طے کرنے میں انتہائی دشواریاں در آتی ہیں۔ غزل کے وہی شعر اگر ایک طرف مجاز کے خوبصورت جلوے بکھیرتے ہیں تو دوسری طرف حقیقت کی محکم دلیل بن جاتے ہیں۔

اردو شاعری میں فارسی کی صوفیانہ شاعری کی طرح بلندیاں تقریباً مفقود ہیں۔ آیئے! پہلے شمس الرحمٰن فاروقی کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمایئے۔

''صوفیانہ شاعری میں قال سے زیادہ حال کی اہمیت ہوتی ہے۔ صوفیانہ شاعری کا بنیادی پتھر اپنی ہستی کو کسی بلند تر ہستی میں ضم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کوشش کو ہم وصول الی اللہ کہہ سکتے ہیں اس میں عقل سے زیادہ جذبات یا دماغ سے زیادہ دل کی کارفرمائی ہوتی ہے۔

صوفیانہ شاعری کا ایک اہم پہلو روح کو مادے پر یا وجود کو عدم پر ترجیح دینا ہوتا ہے۔ اسے ہم سپردگی کی ایسی کیفیت کہہ سکتے ہیں جس کی ابتدا مذہبیت ہے اور انتہا روحانیت۔

صوفیانہ شاعری میں حزن و یاس اور خوف کا کوئی بنیادی عنصر نہیں ہوتا۔ فیض کی جو کیفیات کبھی کبھی صوفیانہ شاعری سے مل جاتی ہیں ان کی حیثیت ایک گزرتے ہوئے منظر کی ہے۔ صوفیوں کے یہاں روحِ الوہیت کے سفر کے آغاز میں اکثر کیفیات یاس و ہراس سے دوچار ہوتی ہیں۔ لیکن یہ منزلیں ابتدائی اور مختصر ہیں۔ وصول الی اللہ کی کوشش میں ناامیدی کا کوئی درجہ نہیں۔

''صوفی اپنے اور مقصود کے درمیان کسی مادے کو تسلیم نہیں کرتا۔''

مذکورہ بالا اقتباس کے مطابق واقعہ یہ ہے کہ اردو شاعری میں دور تک کوئی صوفی شاعر نظر نہیں آتا البتہ دلوں کو چھو لینے والی تصوف کی جھلکیاں ضرور جنت نگاہیوں کا سامان فراہم کرتی ہیں۔ اردو شاعری میں ہر شاعر کے یہاں تصوف کے نقوش پائے جاتے ہیں۔ کسی کے یہاں گہرے تو کسی کے یہاں ہلکے اور کسی کے یہاں ضرورتاً صرف منہ کا مزہ بدلنے کے لئے۔

تصوف اردو شاعری کو بھی خاصی توانائی کے ساتھ ساتھ سامان رنگ و روغن فراہم کرتا ہے اور شاعر کا سلیقہ اسکی صلاحیت اپنے اعتبار سے اس رنگ و روغن سے فائدہ اٹھاتی ہے۔ میر تقی میر اپنی سلیقہ مندی اور اپنے ہنر کو برتنے میں اپنی مثال آپ ہیں اس لئے ان کے ہاتھ لگتے ہی یہ رنگ جاذب نظر ہو دلوں کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے ''عشق کی ستم انگیزی، یاس و حرمان کی سوز زنی، دنیا کی بے ثباتی، فقر و قناعت کی تلقین یہی میر کی شاعری کے عناصر اربعہ ہیں۔ انھیں کا بیان مختلف طور پر بار بار ہوتا ہے'' کلیم الدین احمد کے مقصودِ قلم کی وضاحت مجھ جیسے کوتاہ قلم کے بس میں نہ سہی لیکن یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ یہ عناصر اگر اپنے پر کھول دیں

تو یقین ہے زمین ہی نہیں آسمان پر بھی چھا جائیں۔

میرؔ صوفی تو نہ تھے کہ حال و قال کے جلوے، فنا فی اللہ کی منزلیں، کثرت اور وحدت کے منظر، وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے دقیق مسائل اور ان کے رموز و نکات کی موشگافیاں، قبض و بسط کی شرحیں ان کے کلام کی آبرو بڑھاتے لیکن ان کی شاعرانہ عظمتیں، ان کی قد آور شخصیت میرؔ ملک سخن کی خدائی کے درجے نے اس میدان میں بھی انھیں انفرادیت سے سرفراز کیا ہے۔

میرؔ جب لب کشا ہوتے ہیں تو لفظیات باجگذاری کو ادب کے ساتھ سراپا انتظار نظر آتی ہیں۔ شرف باریابی جسے بھی مرحمت ہو جائے۔ تصوف کے مضامین (روایتی ہی سہی) پر بھی یہ بادشاہِ سخن جب نگاہ کرتا ہے تو اپنے لئے انفرادیت کی راہ نکال لیتا ہے۔

تصوف میں عشق ہی سب کچھ ہے۔ تصوف کا مزاج عشق حقیقی سے عبارت ہے۔ عشق حقیقی ہی سے تصوف کا خمیر اٹھا ہے قبض و بسط کی راہوں کو روشنی ملتی ہے۔ میرؔ کو ملاحظہ کیجئے۔

عشق ہی عشق ہے جہاں دیکھو — سارے عالم میں بھر رہا ہے عشق
عشق معشوق عشق عاشق ہے — یعنی اپنا ہی مبتلا ہے عشق
کون مقصد کو عشق بن پہونچا — آرزو عشق مدعا ہے عشق

تصوف کے مضامین کو شرح و بسط کے ساتھ بیان کرنے میں مثنوی کی صنف کا نمایاں کردار رہا ہے۔ مولانا روم کی مثنوی ہو یا مولانا اسمٰعیل شہید کی "سلک نور" اس دعوے کا بین ثبوت ہیں میرؔ نے بھی مثنوی کے حوالے سے عشق حقیقی کے موضوع پر اظہار خیال کیا ہے۔ اور اس کے روشن پہلوؤں کی بنیاد کو بھرپور نمایاں کرنے میں بڑھ چڑھ کے حصہ لیا ہے۔ ان کی مثنوی کے صرف دو تین شعر دیکھئے اور ان کے منفرد لہجہ کی داد دیجئے!

محبت نے ظلمت سے کاڑھا ہے نور — نہ ہوتی محبت نہ ہوتا ظہور
محبت مسبب محبت سبب — محبت سے آتے ہیں کارِ عجب
محبت ہی اس کارخانے میں ہے — محبت ہی سب کچھ زمانے میں ہے

نگاہِ عشق و محبت کی معراج کا دوسرا نام تصوف ہے۔ تصوف کی روح پرور وادیوں میں دوست اور دشمن کی تمیز بے نام ہو جاتی ہے۔ عرفی کے مطابق ؎

پروانہ چراغ حرم و دیر نداند

میرؔ کا خیال ہے اور کتنا سچا خیال ہے۔

راہ سب کو ہے خدا سے جان اگر پہونچا ہے تو
ہوں طریقے مختلف ہی کتنے منزل ایک ہے

فنا کی منزلوں کے اعتبار کو سر کرنے کا سہرا میرؔ کی زبان میں عشق ہی کے سر ہے۔

ہم راہ روان راہ وفا دیر رہ چکے
وقفہ بسانِ صبح کوئی دم بہت ہے یاں

روایتاً ہی سہی لیکن لاہوت کی فضاؤں میں کھوئے جانے کی سعادت کا تذکرہ میرؔ کی انفرادیت اور ان کے ہنر کے اعتراف پر مجبور کرتا ہے۔ بے خودی کی کار کردگی، پھر انتظار کی لذت آشنائیاں۔

بے خودی لے گئی کہاں ہم کو — دیر سے انتظار ہے اپنا
اسے ڈھونڈنے میرؔ کھوئے گئے — کوئی دیکھے اس جستجو کی طرف

صوفیوں کے نزدیک سچے ادراک کا محل دل ہے۔ سارے مکاشفات، تمام قلبی واردات اسی منزل روحانی سے علاقہ رکھتے ہیں۔ حدیثوں کی روشنی میں دل بن جائے تو سب کچھ بن جائے اور دل بگڑ جائے تو سب کچھ بگڑ جائے۔ تصوف میں شاید اور شاید کیا یقیناً دل پر کڑی نگاہ رکھتے ہیں۔ میرؔ کے دو شعر دیکھ لیجئے۔

دیر و حرم سے گذرے اب دل ہے گھر ہمارا
ہے ختم اس آبلے پر سیر و سفر ہمارا

طریق عشق میں ہے رہنما دل
پیمبر دل ہے، قبلہ دل، خدا دل

خواجہ فریدالدین عطار کے مطابق دنیا کی ہر شے میں معشوقِ حقیقی کا حسن کارفرما ہے۔ وہ قد میں جلوہ، زلف میں خمی، ابرو میں وسمہ، یاقوت میں آب اور مشک میں خوشبو ہے۔ گویا وحدت الوجود کا مسئلہ تصوف کی جان ہے۔ اب میرؔ کو دیکھئے۔

غلط تھا آپ سے غافل گزرنا — نہ سمجھے ہم کہ اس قالب میں تو تھا

(بقیہ صفحہ ۸۴ پر)

ڈاکٹر نعیم السحر صدیقی
۱۳۹ ایف/۱، ایف/۷، خورشید کالونی نیر ڈگری ماڈل اسکول غوث نگر
کریلی۔ الہ آباد

اشعارِ میر میں فرح ناکی اور خوش آہند فضا

انسانی ذہن مسلسل ایک نئی دنیا کا تعاقب کرتا رہتا ہے اور جب بات کسی شاعر کی ہو اور وہ بھی میر تقی میر جیسے شاعر کی تو اس تخیل کی پرواز کو شاید ہی تفہیم کے کوزے میں بند کیا جا سکے لیکن تفہیم کی کاوش مسلسل تو موجود ہیں اسی کاوش مسلسل کی آبیاری کرتے ہوئے اس مقالے میں میر کی ان فرح ناکیوں کی تلاش کی گئی ہے جنھیں اکثر نظر انداز کر کے انھیں محض غم کا شاعر کہہ دیا جاتا ہے اور بات اس سے آگے نہیں بڑھتی یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس مضمون میں کوئی نئی بات کہی جا رہی ہے کیونکہ یہ فرحت بخش عناصر تو میر کی شاعری میں ہمیشہ سے موجود تھے اور جناب شمس الرحمٰن فاروقی نے اٹھائیس سو صفحات پر لکھی گئی اپنی چار جلدوں پر مشتمل کتاب "شعر شور انگیز" میں میر کی شاعری میں موجود ہر رنگ کی نشاندہی بھی کی ہے لیکن محض اس بات کو استوار کرنے کے لئے کہ میر کی شاعری غموں کا مرکب نہیں بلکہ اس میں ان کی فرح ناکیوں کا رمزیہ، پر کیف اور ایک سنجیدہ انداز مضمر ہے۔ مثلاً:

امید وارِ وعدۂ دیدار مر چلے
آتے ہی آتے یارو قیامت کو کیا ہوا

چمن میں گل نے جو کل دعویٔ جمال کیا
جمالِ یار نے منہ اس کا خوب لال کیا

لگتے تھے دستِ بلبل و دامانِ گل بہم
صحنِ چمن نمونۂ یوم الحساب تھا

وصل و ہجراں سے جو دو منزل ہیں راہِ عشق کی
دل غریب ان میں خدا جانے کہاں مارا گیا

بلبل غزل سرائی آگے ہمارے مت کر
ہم سب سے سیکھتے ہیں انداز گفتگو کا

شرکت شیخ و برہمن سے میر — کعبہ و دیر سے بھی جائیے گا
اپنی ڈیڑھ اینٹ کی جدی مسجد — کسی ویرانے میں بنائیے گا

خوش رہا جب تک رہا جیتا
میر معلوم ہے قلندر تھا

کرتا ہے کام وہ دل جو عقل میں نہ آوے
گھر کا مشیر اپنا نادان ہے ہمارا

خدا کو کام تو سونپے ہیں میں نے سب لیکن
رہے ہے خوف مجھے واں کی بے نیازی کا

وصیت میر نے مجھ کو یہی کی
کہ سب کچھ ہونا تو عاشق نہ ہونا

دکھا نہ ادھر ورنہ آتا نہ نظر پھر میں
جی مفت مرا جاتا، اس شوخ کا کیا جاتا

مکے گیا، مدینے گیا، کربلا گیا
جیسا گیا تھا ویسا ہی چل پھر کے آگیا
دیکھا ہو کچھ اس آمد و شد میں تو میں کہوں
خود گم ہوا ہوں بات کی تہ اب جو پا گیا

یہ باتیں میر کی شاعری میں طنز کے پردے میں بھی چھپی رہتی ہیں۔ لیکن میر تقی میر کے غمزدہ ہونے کا جو ایک عام خیال اشعار میر کے حوالے سے رائج ہوگیا ہے اس کی جانب اشارے جا بجا میر ہی نے کئے ہیں لیکن یہ محض جذبات کی ایک رَو اور رسم پرستی ہے جو اپنے ہونے پر اصرار کرتی ہے پھر یہ بھی کہ چونکہ غزل کی روایت اور غزل کا خمیر بھی کچھ غم انگیزی اور غم کوشی کی تاثیر رکھتا ہے۔ اس مناسبت سے بھی ہو سکتا ہے کہ میر نے غم کو واضح انداز میں برتا ہو۔ مثلاً :

حالت تو یہ ہے دل کو غموں سے نہیں فراغ
دل سوزشِ درونی سے جلتا ہے جوں چراغ

پڑھیں گے لوگ رو رو شعر میرے
رہے گا دیر تک ماتم ہمارا

اس ایک عام خیال سے قطع نظر میر کی شاعری میں خاصی فرحناکیاں اور خوشگوار فضا ہے جنھیں غزلوں کے علاوہ ان کی مثنویوں اور شکارناموں میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ ایسی باتیں ان کی شاعری میں فضا کو خوشگوار بنانے کے لئے موقع بہ موقع ظاہر ہوتی رہتی ہیں۔ مثلاً ان کی غزلوں سے یہ چند اشعار اور دیکھیں :

چلنا ہے تو چمن کو چلئے، سنتے ہیں کہ بہاراں ہے
پات ہرے ہیں، پھول کھلے ہیں، کم کم باد و باراں ہے
لکھتے رقعہ لکھے گئے دفتر شوق نے بات کیا بڑھائی ہے
باغ و بہار ہے وہ، میں کشتِ زعفراں ہوں
جو لطف اک ادھر ہے، تو یاں بھی اک سماں ہے

کبھی کبھی میر اپنے اشعار میں اپنا مذاق بھی اڑاتے ہیں اور اس پر خود بھی خوش ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی ہنساتے ہیں۔ ایسے اشعار ان کی مثنوی ''ہجو در خانۂ خود'' میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

بیشتر ایسے مواقع آئے ہیں جب ہمیں حالات کی مناسبت سے یا تو شعر خود بخود یاد آگئے ہیں یا ہم نے انھیں یاد کرنے کی کوشش کی ہو ایسا کیوں ہے ؟ کیا یہ غزل کی اشاریت، رمزیت تہہ داری کی دلیل نہیں کہ صرف ایک شعر سے مقصد اور مفہوم کا حق ادا ہو جاتا ہے اور صدیوں سے چلی آرہی غزل کی معنویت مسلّم ہو جاتی ہے اور میر، غالب اور اقبال کی شاعری اپنی قدر و قیمت کا اعتراف کراتی ہوئی نظر آتی ہے ان رموز و نکات سے شمس الرحمٰن فاروقی جیسے نقاد کی تحریریں قارئین کو واضح طور پر متعارف کرا چکی ہیں لیکن قارئین کی ذہنی سطح بھی ہمیشہ سے ایک پیمانے کا کام کرتی رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر شخص اپنی تفہیم کے مطابق اشعار سے متاثر ہوتا ہے اور معنی و مفاہیم کی نئی تعبیریں پیش کرتا ہے لیکن اس کے بعد بھی دو مصرعوں کا ایک شعر معنی کے جہان اپنے اندر چھپائے رکھتا ہے مثلاً میر کا یہ شعر :

شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے
دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

جو ہزاروں بار ہمارے ذہن و دل سے ہو کر گزرا ہے۔ فکر و شعور کی گہرائی اور سنجیدگی کے ساتھ عالم انسانیت پر نظر انداز ہونے والی مختلف کیفیات کی عکاسی کرتا ہے اس میں شام کی پراسراریت سے انسانی ذہن و دل کو ہم آہنگ کیا گیا ہے۔ اپنی ذات کے امکانات کی تلاش ہے۔ پھر وسائل کی کمی سے پیدا ہونے والی مایوسی بھی ہے۔ اس کے بعد ایک رنگ انتظار، وعدوں کی ناپائداری اور بے اعتباری کا ہے پھر ایک پہلو غربت کی عکاسی کا ہے۔ قدروں کے زوال اور بے ثباتی کا بھی ایک رنگ ہے لیکن ان سبھی کا تعلق شام کی ایک خاص پراسراریت سے ہے جو اکثر ذہن پر اداسی یا غور و فکر کی کیفیت طاری کر دیتی ہے لیکن غور کرنے کی بات یہ ہے کہ شام اور صبح میں بُعد ہے۔ شاعر نے ایسا نہیں کہا کہ اس کا دل ''ہر وقت بجھا سا رہتا ہے۔ اس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ صبح کی کیفیت شاعر کے لئے باعث لطف اور شادمانی ہے اور چونکہ زندگی میں کبھی بھی کسی ایک ہی جذبے یا کیفیت کو دوام حاصل نہیں رہا اس لئے شاعر بھی کسی ایک ہی کیفیت کا پابند نہیں۔ وہ صبح کی دلکشی سے بھی متاثر ہوتا ہے

لطف اگر یہ ہے بتاں صندل پیشانی کا
حسن کیا صبح کے پھر چہرۂ نورانی کا

میر تقی میر بیشتر انسانی زندگی کو فطرت سے ہم آہنگ کر کے اسکی تعبیریں پیش کرتے ہیں اور بہت آسان پیرائے میں بڑی سی بڑی

بات کہہ جاتے ہیں مثلاً جب وہ کہتے ہیں۔

ہستی اپنی حباب کی سی ہے
یہ نمائش سراب کی سی ہے

تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بظاہر سیدھے سادے انداز میں ایک بات کہہ دی ہے جس میں عربی فارسی کی تراکیب کا دخل نہیں لیکن پڑھنے والا بہ خوبی جانتا ہے کہ یہ سیدھا سادا انداز ہر کسی کے استطاعت کی بات نہیں اس لئے وہ نظر مفقود ہے جو مصنوعات کو پردے کو درکنار کرکے زندگی کی حقیقت، بے ثباتی اور ناپائداری کو دیکھ لیتی ہے اور اس کا واضح طور پر اظہار بھی کرتی ہے۔ زندگی کی وہ عکاسی جس میں ایک ناپائدار سرخوشی، کشمکش، ہیجان اور تصادم ہے جس میں انسان آسودگیٔ نفس کے لئے سرگرداں ہے لیکن غم کی پائداری مسلسل اس کے تعاقب میں ہے جس کے نتیجہ میں اکثر زندگی کو غموں کا مرکب سمجھ لیا گیا۔ یہ انسانی زندگی کا ایک المیہ ہے کہ دن کی جگہ رات لے لیتی ہے اور خوشی کی جگہ غم لیکن جس طرح رات کو دوام نہیں اسی طرح غم کو بھی نہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے تعاقب میں ہیں لیکن قائم اور دائم نہیں لہٰذا میر بھی غم کو ابر سے تعبیر کرتے ہیں جو ظاہر ہے کہ چھٹ جانے والا ہے۔

روتا ہوں یوں کہ برسے ہے شدت سے جیسے مینھ
جوں ابر میرے دل پہ غم عشق چھا گیا

اس طرح جب زندگی کا استعارہ اپنے تمام معنی و مفاہیم کے ساتھ غم اور سرخوشی دونوں ہی کے ناپائدار ہونے کی خبر دیتا ہے تو ایسے میں میر کی شاعرانہ تفہیم کی ایک ہی جہت کیوں؟ چونکہ غم بھی ایک قوی جذبہ ہے اور اس کا اثر تادیر قائم رہتا ہے لہٰذا ایک جذبہ کے تحت اسے شاعری میں برتا گیا لیکن اس کی وجہ سے خوشی کے راستے مسدود نہیں ہو جاتے؟ انسان اپنی زندگی میں وقفے وقفے سے طربناکی اور فرح ناکی کے حصار میں ہوتا ہے۔ ستم یہ ہے کہ ان باتوں پر غور نہ کرتے ہوئے میر کے یہاں محض غم کے عناصر پر زور دیا گیا پھر چراغ سے چراغ روشن ہوئے اور اس بات کو مزید استحکام ملا جبکہ درحقیقت ایسا نہیں ہے۔ میر نے سرخوشی کی باتیں بھی اسی کثرت سے کی ہیں جیسے کہ غم کی بلکہ ایک تسلسل اور کیفیت کے تحت ان کی غزلوں کی پوری فضا اس سے متاثر ہوتی ہے یعنی ان کی اکثر غزلیں ان کے دل پر اثر انداز ہونے والی کیفیت کا مسلسل آئینہ ہوتی ہیں۔ ان کو پڑھ کر بخوبی محسوس کیا جا سکتا ہے کہ شاعر کی موجودہ ذہنی کیفیت کیا ہے وہ کس جذبے سے متاثر ہے مثال کے طور پر ان کی ایک پوری غزل دیکھ لیجئے۔

قدر رکھتی نہ تھی متاع دل — سارے عالم کو میں دکھا لایا
دل کہ اک قطرۂ خوں نہیں ہے بیش — ایک عالم کے سر بلا لایا
سب پہ جس بار نے گرانی کی — اس کو یہ ناتواں اٹھا لایا
دل مجھے اس گلی میں لے جاکر — اور بھی خاک میں ملا لایا
ابتدا ہی میں مر گئے سب یار — عشق کی کون انتہا لایا

اب تو جاتے ہیں بتکدے سے میرؔ
پھر ملیں گے اگر خدا لایا

ادب ایک ایسا کارزار ہے جہاں اختراعی ذہن مسلسل حیران و سرگرداں ہے، ایک نئی منزل کا متلاشی ہے۔ نقش حیات بٹ مٹ کے ابھرتا ہے لیکن اسے مٹاتا کون ہے؟ کون ہے جو زندگی کی فرح ناکیوں سے برسرپیکار ہے؟ شاید وہ وقت ہے جو بے ثبات ہے اسی تغیر اور بے ثباتی کے تحت میر نے اپنی زندگی میں ایک رنگ کو دوسرے رنگ کی جگہ لیتے ہوئے دیکھا اور اس کی عکاسی کرتے رہے دہلی اور لکھنؤ کی نیرنگیاں انھیں متاثر کرتی رہیں۔ ایسے میں ایک حساس دل میں قوت برداشت اور جدوجہد کی صلاحیت تو پیدا ہونی ہی تھی اور پھر اگر وہ شاعر ہے تو اس کا شاعرانہ اظہار بھی ہونا تھا۔ اس طرح اگر میر کے غم کو وقتی تاثر سمجھ کر نظر انداز کر دیں تو ایک فنکارانہ ذہن کی رنگا رنگی ان کے کلام میں نظر آئے گی۔ مثلاً میر خود کہتے ہیں:

دل سے شوق رخ نکو نہ گیا
تاکنا، جھانکنا کبھو نہ گیا

غور کرنے کا امکان ہے کہ اگر وہ غموں سے نڈھال تھے تو یہ شوق کیسا تھا؟ یوں کو تاکنا جھانکنا بظاہر بہت عامیانہ سی بات ہے لیکن شاعر کا مفہوم اس شعر میں بہت سارے جہات رکھتا ہے یہاں شاعر کی مراد دنیا کو بیدار ذہن اور شوخی نظر سے دیکھنا بھی ہے یہ شوق شاعر کی طبیعت کی رنگینی اور مختلف الجہتی کا ترجمان ہے۔

یعنی وہ خوب سے خوب تر نظارے کی تلاش میں ہے۔ اس کی نظروں کو ابھی سیرابی نہیں ہوئی اس بات کا تقاضا ان کے درج ذیل شعر میں بھی مضمر ہے۔

سرسری ہم جہان سے گذرے
ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا

اس طرح اگر دیکھا جائے تو میرؔ غم کے شاعر معلوم نہیں ہوتے بلکہ زندگی کے ہر رنگ کی عکاسی کرنے والے شاعر نظر آتے ہیں۔ ان کے کلام کا اگر براہ راست مطالعہ کیا جائے تو ممکن ہے کہ یہ بات واضح ہو کر منظر عام پر آئے۔ قوانین بے ثباتی کے تحت زندگی کے تاثرات و محسوسات بدلتے ضرور رہتے ہیں لیکن یکسر فنا نہیں ہوتے اس لئے مسرت اور غم کے آنے جانے کا سلسلہ تو یوں ہی جاری رہے گا۔ میر تقی میرؔ جو زندگی پر ایک حکیمانہ اور فلسفیانہ نگاہ رکھتے تھے۔ شاید غم کی کیفیات سے زیادہ متاثر ہوئے۔ اس لئے اس نوع کے اشعار ان کے یہاں قدرے زیادہ آب دار ہیں لیکن یہ محض رسم پرستی بھی ہو سکتی ہے کیونکہ اردو غزل کا ایک مزاج ایسا بھی رہا ہے اس بنا پر اسے ان کا خاص رنگ سمجھ لینا غور و فکر کی کوتاہی کی طرف اشارے کرتا ہے کیونکہ میرؔ کی شاعری میں ایسی بہت سی خوش آئند باتیں ہیں جو انسانی زندگی کو صحت مند شعور عطا کرتی ہیں۔ میرؔ کی فرح ناکی یہ ہے کہ وہ اپنے ہر عمل کے ساتھ مخلص ہیں یعنی اگر روتے بھی ہیں تو بے اختیار روتے ہیں۔

مانندِ شمع مجلس شبِ اشکبار پایا
البتہ میرؔ کو ہم بے اختیار پایا

یا مثلاً یہ شعر

میں گریۂ خونی کو روکے ہی رہا ورنہ
یک دم میں زمانے کا یاں رنگ بدل جاتا

جیسے غالبؔ نے یوں بھی کہا۔

ہم رونے پہ آجائیں تو دریا ہی بہا ئیں
شبنم کی طرح سے ہمیں رونا نہیں آتا

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ میرؔ کے یہاں کسی گھٹن کا احساس نہیں پایا جاتا۔ اپنی ہر بات وہ بے اختیار کہتے نظر آتے ہیں جو تخلیقی اور فنی پیرائے کی شکل میں ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ ان کی شاعری میں ایک بہاؤ ہے جو مختلف واقعات، جذبات و احساسات سے روبرو کراتا جاتا ہے ''میں گریۂ خونی کو روکے ہی رہا ورنہ'' اس مصرعے اور اس مکمل شعر کو میرؔ کا یہ اعتراف بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ میں نے غم و گریہ کی شاعری تو کی ہی نہیں اگر ایسا ہوا ہوتا تو شاید منظر نامہ دیگر ہوتا۔ زمانے کو برداشت کی وہ قوت نہ ملی ہوتی جو میرے اشعار کی تاثیر ہے۔ اس طرح سے میرؔ کی شاعری، زندگی کی الناکیوں کو قابل برداشت بنا کر پیش کرتی ہے۔ وہ اپنے سلیقے سے ناکامیوں کو بھی کارآمد بنانے کا ہنر جانتے ہیں۔ ناکامیوں کا ماتم نہ کرکے وہ محض اتنا کہہ دیتے ہیں کہ ''تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا'' مانو ناکامیاں ان کی غلام تھیں ان کی مرضی کی مطیع تھیں۔ محبت کا رشتہ استوار رکھنے اور اسے نبھانے کے لئے وہ کسی بھی ترکیب سے کام لینا جانتے تھے۔ ان معنوں میں اگر تصور کیا جائے تو یہ شعر بھی فرح ناکی کا مضبوط پہلو رکھتا ہے اور پھر یہ شعر:

اگرچہ گوشہ گزیں ہوں میں شاعروں میں میرؔ
پہ میرے شعر نے روئے زمیں تمام لیا

اپنے کلام کی اثر انگیزی کا فرحت بخش اعلان ہے۔

آج اگر تنقید کے معیار پر نظر کی جائے تو محسوس ہوگا کہ ادب کو سیاسی، سماجی، مذہبی، فلسفیانہ اور متعدد قسم کے معیاروں کے مقام پر رکھتے ہوئے آج ایک ایسا وقت آگیا ہے جب ادب میں ادبیت کی باتیں کہیں گم سی ہو گئی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ غور و فکر کے یہ شعبے بھی اپنے مسائل اور اپنی اہمیت رکھتے ہیں اور غزل کو ہر دور کے مسائل سے ہم آہنگ کرتے رہے ہیں لیکن ادب کی ادبیت بھی لازمی شرط ہے۔ آج یہ صفت اکثر کم یاب ہوتی جا رہی ہے آج ہم صنائع، بدائع اور کسی شعر کے وجود میں آنے کی لازمی شرطوں کو جاننے سمجھنے میں وقت برباد کرنا ضروری نہیں خیال کرتے۔ ایسے حالات میں کلاسیکی شعرا کے کلام کو پڑھنے کی ضرورت ہے جس سے ان کی صفات اکیسویں صدی کے معیار و مذاق کی آبیاری کر سکیں۔ میر تقی میرؔ کے کلام میں سیاسی، سماجی، مذہبی اور فلسفیانہ مسائل کثرت سے

ملتے ہیں لیکن ساتھ ہی ادبیت کا جو ہنر ان کی شاعری میں کارفرما ہے وہ ہمارے لئے سبق لینے کی چیز ہے مثلاً میر کی شاعری اپنی تمام فرح ناکیوں کے ساتھ ہمیں بتاتی ہے کہ مذہبی وسیع النظری کیا چیز ہے۔ اس سلسلہ میں ان کا یہ شعر بہت مشہور ہے۔

میر کے دین و مذہب کو کیا پوچھتے ہو اُن نے تو
قشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا

یہ خصوصیت آج کی دنیا میں ظاہری نمائش کے طور پر بہت زیادہ نظر آتی ہے لیکن جب بات ہم کسی شاعر کی کرتے ہیں تو اس کی وسیع القلبی جذبات اور فنی بصیرت انسان دوستی سے ہم آہنگ ہوجاتی ہے۔ ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ میر تقی میر انسانی نفسیات کی عکاسی بھی کرتے ہیں۔

دنیا میں حسن و خوبی میر اک عجیب شے ہے
رنداں دیار سا یاں جس پر رکھیں نظر سب

اک دن کہا تھا یہ کہ خموشی میں ہے وقار
سو مجھ سے ہی سخن نہیں میں جو بتائی بات

یاروں کی آہ و زاری ہووے قبول کیوں کر
ان کی زباں میں کچھ ہے، دل میں کچھ، دعا کچھ

اپنے بھی جی ہے آخر انصاف کر کہ کب تک
تو یہ ستم کرے گا، ہم درگذر کریں گے

غفلت ہے یہ غرور تجھے، ورنہ ہے بھی کچھ
یاں وہ سماں ہے جیسے کہ دیکھے ہے کوئی خواب

اور پھر معشوق کی فطرت اور نفسیات کی بھی عکاسی کرتے ہیں۔ مثلاً

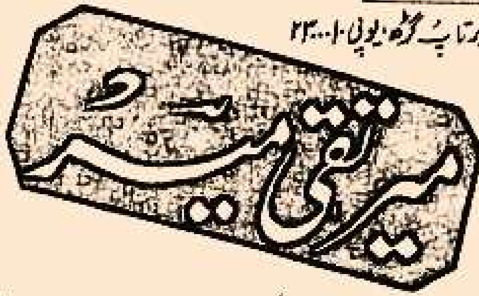
کیا کیا فتنے سر پر اس کے لاتا ہے معشوق اپنا
جس بے دل، بے تاب و تواں کو عشق کا مارا جانے ہے

عشق کا یہ لفظ جو شعر و شاعری کا محرک ہوا اپنے اندر ایک معنوی وسعت اور مختلف جہات رکھتا ہے۔ ان پر خواہ جس بھی مقصد سے انسان گامزن ہوا۔ راہوں کے خارزار ہونے کا خدشہ بنا رہا لہٰذا ایسے مختلف پہلوؤں اور کیفیات کی عکاسی ہمیں میر کی شاعری میں بھی ملتی ہے جو عشق و محبت کی محرومی کے سبب انسانی زندگی میں آئی پیچیدگیوں کو سمجھنے میں معاون ہوتی ہے۔ میر کے اس نظریۂ حیات اور فن میں ایک معیاری سنجیدگی اور ندرت ہے۔ ان کے اشعار ہمیں وجد کرنے پر کم اور اپنی داخلیت کی تفہیم پر زیادہ مائل کرتے ہیں۔ ان کی باتیں اکثر زخمی دلوں پر مرہم رکھتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی غمگسار، کوئی چارہ ساز ہم سے باتیں کر رہا ہے۔ بلاشبہ یہ تاثرات، تجربات اور احساسات میر تقی میر کی ذاتی زندگی سے متعلق تھے جنھوں نے تخلیقی اور فنی پیرایہ اختیار کیا لیکن اپنی معنوی تہہ داری کی وجہ سے ان کے اشعار ہر دور کے انسان کو اپنی زندگی سے قریب بلکہ اپنے مسائل کی عکاسی معلوم ہوئے۔ اپنی فرح ناکی کے باعث ایسی بہت سی باتیں انھوں نے اپنی شاعری میں کہیں جن کے باعث ایک خوش مزاج انسان سے واقفیت ہوتی ہے۔ شاعری کا منبع اگرچہ بیشتر تاثراتی ہوتا ہے لیکن یہ تاثرات فکر و نظر اور علم و حکمت کا عطیہ ہوتے ہیں ان کی جڑیں جتنی زیادہ گہرائی میں پیوست ہوتی ہیں اشعار کے آبدار ہونے کا امکان اتنا ہی زیادہ ہوتا ہے اور میر کو پڑھتے وقت اکثر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ان کی باتیں ہی تجربات ہیں اور تجربات اپنی فنی اور فکری بصیرت کے ساتھ شاعری کے پیرائے میں ڈھل گئے ہیں ایسے میں ان کی اکثر باتیں قولِ محال بن جاتی ہیں اور ذہن کو بصیرت بخشتی ہیں اس طرح اگر دیکھا جائے تو میر ایک طباع شخص اور شاعر تھے جس کی جانب وہ اپنے ایک شعر میں اشارہ بھی کر گئے۔

صناعِ طرفہ ہیں ہم عالم میں ریختے کے
جو میر جی لگے گا تو سب ہنر کریں گے

برسوں لگی رہی ہیں جب مہر و مہ کی نظریں
تب جا کے کوئی صاحب، صاحب نظر بنے ہیں
—میر

عارف حسین جونپوری
ابوالکلام آزاد انٹر کالج پرتاپ گڑھ، یوپی ۲۳۰۰۰۱



دل اور دلّی کا شاعر

میر تقی میر یوں تو اکبر آباد (آگرہ) کے تھے مگر گھریلو حالات کی تلخیوں کے باعث اپنے سوتیلے ماموں خان آرزو کے پاس اوائل عمر ہی میں دلی چلے گئے تھے۔ شاہ عالم جس کی بادشاہت کے لئے مشہور تھا از دلی تا پالم کے عہد میں میر صاحب لکھنؤ پہونچے اسی روز ایک مشاعرہ میں شرکت کی غرض سے جانا ہوا حاضرین نے ان کی وضع قطع دیکھ کر مذاق اڑایا۔ میر صاحب نے فی البدیع یہ اشعار سنائے۔

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اس کو فلک نے لوٹ کر ویران کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

میر صاحب کو دلی اور دلی کی زبان پر بہت فخر تھا۔ میر صاحب جب دلی سے چلے تو اپنے ہم سفر سے بات چیت بھی کرنے کو روادار نہیں ہوئے کہ "آپ کا شغل ہے میری زبان خراب ہوتی ہے۔"

اسی طرح صاحب آب حیات محمد حسین آزاد نے ایک واقعہ اور نقل کیا ہے کہ "لکھنؤ کے چند عمائد اور اراکین جمع ہو کر ایک دن آئے کہ میر صاحب سے ملاقات کریں اور اشعار سنیں۔ میر صاحب سے بعد مزاج پرسی فرمائش اشعار کی۔ میر صاحب نے اولاً کچھ ٹالا۔ پھر صاف جواب دیا کہ صاحب قبلہ میرے اشعار آپ کی سمجھ میں نہیں آنے کے۔ ادھر سے انکار ادھر سے اصرار۔ آخر ان لوگوں نے گراں خاطر ہو کر کہا کہ حضرت! انوری وخاقانی کا کلام سمجھتے ہیں آپ کا ارشاد کیوں نہ سمجھیں گے۔ میر صاحب نے کہا کہ یہ درست ہے مگر ان کی شرحیں مصطلحات اور فرہنگیں موجود ہیں اور میرے کلام کے لئے فقط محاورۂ اہل اردو ہے یا جامع مسجد کی سیڑھیاں اور اس سے آپ محروم۔

آب حیات میں اور واقعہ اس طرح نقل کیا گیا ہے کہ میر قمرالدین منت دلّی میں ایک شاعر گذرے ہیں کہ علوم رسمی کی قابلیت سے عمائد دربار شاہی میں تھے۔ وہ میر صاحب کے زمانہ میں مبتدی تھے۔ شعر کا شوق بہت تھا۔ اصلاح کے لئے اردو کی غزل لے کر گئے۔ میر صاحب نے وطن پوچھا۔ انھوں نے سونی پت علاقہ پانی پت بتایا۔ آپ نے فرمایا۔ سید صاحب اردوئے معلّٰی خاص دلی کی زبان ہے آپ اس میں تکلیف نہ کیجئے اپنی فارسی وارسی کہہ لیجئے۔

اس سلسلہ کا ایک اور واقعہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ نیز دلّی سے میر صاحب کی محبت اور عقیدت کا اظہار بھی ہے۔ سعادت یار خاں رنگین نواب طہماسپ قلعدار شاہی کے بیٹے تھے۔ ۱۴، ۱۵ برس کی عمر تھی بڑی شان و شوکت سے گئے اور غزل اصلاح کے لئے پیش کی سن کر کہا کہ صاحبزادے آپ خود امیر ہیں اور امیر زادے ہیں۔ نیزہ بازی اور تیر اندازی کی کثرت کیجئے۔ شہسواری کی مشق فرمائیے شاعری دل خراشی اور جگر سوزی کا کام ہے آپ اس کے درپے نہ ہوں؟

اس قسم کے اکثر واقعات ہیں جن سے میر صاحب کی دلی اور دلی کی زبان سے محبت ظاہر ہوتی ہے۔ اس قسم کے واقعات سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ میر بلا کے تنگ مزاج، خود دار اور دنیاداری سے بے نیاز انسان تھے۔ دلی کے وہ دلدادہ تھے مگر اجڑی اور لٹی پٹی دلی میں ان پر عرصۂ حیات تنگ تھا۔ اودھ علم و ہنر کا قدر دان بنا ہوا تھا۔ اس لئے وہ نواب آصف الدولہ کی دعوت پر لکھنؤ آ گئے۔ آصف الدولہ سے لے کر سعادت علی خاں تک نے انھیں

حسب مرتبہ اعزاز و اکرام سے نوازا اور دل جوئی کی مگر میر صاحب اپنی تنک مزاجی اور خودداری کو وضعداری سمجھتے رہے۔ میر کو لکھنؤ اور شاہان اودھ نے سر آنکھوں بٹھایا اور ان کی ہر طرح ناز برداری کی پھر بھی وہ صرف دربار کے ہو کر نہیں رہے اور نہ انھوں نے شاہان وقت کی مصاحبت کی۔ اس قسم کے کئی واقعات تذکروں میں موجود ہیں جنھیں نقل کرنا مضمون کی طوالت کا سبب ہوگا۔

دلی سے ان کی محبت ظاہر ہو چکی اور اب دل کا حال دیکھئے میر صاحب کے دیوان میں دل کا لفظ کثرت سے آیا ہے۔

دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے
یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

دیدنی ہے شکستگی دل کی
کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے

دل پر خوں کی اک گلابی سے
عمر بھر ہم رہے شرابی سے

مصائب اور تھے پر دل کا جانا
عجب اک سانحہ سا ہو گیا ہے

دیکھ تو دل کہ جاں سے اٹھتا ہے
یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے

دل سے رخصت ہوئی کوئی خواہش
گریہ کچھ بے سبب نہیں آتا

میر کے یہ زباں زد اشعار اس بات کے شاہد ہیں کہ میر دل کا شاعر ہے۔ دل جو کارزار عشق کا محور ہے۔ میر کے یہ اشعار حزن و یاس کی ایک لطیف فضا لئے ہوئے ہیں۔ میر کا مسلک عاشقی وہی ہے جسے عمومی طور پر عشق مجازی کہا جاتا ہے یعنی میر کا محبوب ماورائی نہیں اسی دنیا کا گوشت پوست کا فرد ہے اگرچہ میر کے والد نے اوائل عمر ہی میں میر کو یہ ترغیب دی تھی۔

"اے بیٹے عشق اختیار کرو کہ (دنیا کے) اس کارخانے میں اس کا تصرف ہے اگر عشق نہ ہو تو نظم کل کی صورت نہیں پیدا ہو سکتی عشق کے بغیر زندگی وبال ہے۔ دل باختہ عشق ہونا کمال کی علامت ہے سوز و ساز دونوں عشق سے ہیں۔ عالم میں جو کچھ ہے وہ عشق کا ہی ظہور ہے۔"

میر کے والد علی متقی درویش صفت انسان تھے۔ میر کو عشق کی یہ تعلیم تصوف کی راہ سے دی گئی تھی۔ اولاً میر نے عشق کے اسی معنی ہی کو اختیار کیا کیونکہ تصوف اس زمانہ کے شعراء کا ایک خاص مزاج تھا۔

عشق ہی عشق ہے جہاں دیکھو
سارے عالم میں بھر رہا ہے عشق

اسی حوالے سے میر کا یہ شعر ازحد معنی خیز ہے۔

ہم نہ کہتے تھے کہیں زلف کہیں رخ نہ دکھا
اختلاف آیا نہ ہندو مسلمان کے بیچ

تصوف کی راہ پر میر زیادہ دور تک نہ چل سکے اور پھر واقعی عشق حقیقی (جسے لوگ مجازی کہتے ہیں) کی وادیوں کی طرف چل پڑے اور پہلے ہی مرحلہ پر آواز دی۔

سخت کافر تھا جس نے پہلے میر
مذہب عشق اختیار کیا

میر کی زندگی واردات قلب اور عشقیہ جذبات کو درد و غم کی فضا میں بیان کرتے ہوئے گذری۔

بے خودی لے گئی کہاں ہم کو   دیر سے انتظار ہے اپنا

میر کا عشق کمال کی منزلوں کو چھوتا نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے میر کی شاعرانہ روش کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو۔

"صوفیانہ تصورات اس کے یہاں (میر) آئے ضرور لیکن محض علمی، رسمی اور طالب علمانہ سطح پر! ان میں جذب و کیف کا رنگ مدغم اور انہاک و تجربے کی کیفیت ناپید ہے۔ پھر صوفیانہ تصورات کے

پیش رو یعنی تیاگ اور نفی کے رجحانات بھی تو اس کے ہاں زیادہ قوی نہیں. بظاہر یہ بات عجیب سی نظر آئی ہے..... لیکن ان اشعار میں تیاگ کے بجائے زیاں کا احساس ابھرا ہے. احساس زیاں اس وقت جنم لیتا ہے. جب انسان کے دل میں خواہشوں کا کہرام برپا ہو اور اسے اپنی ان خواہشات کی تکمیل کا کوئی ذریعہ میسر نہ آسکے. میر یہاں ایک پوری طرح زندہ تنکے کے ساتھ چلتے ہوئے ایک روتے بسورتے انسان کے نقوش ابھرے ہیں. اگر اس نے کہیں بے ثباتی کا نقشہ دکھایا ہے یا دل کے اجڑنے کا منظر پیش کیا ہے تو اس کے پس پشت بھی ایک شدید کسک بالکل برہنہ دکھائی دیتی ہے اور اسی کسک نے میر کی شاعری کو عظمت کے مدارج تک پہونچایا ہے"

(اردو شاعری کا مزاج. صفحہ ۲۵۱-۲۵۵)

میر عمداً بھی کوئی مرتا ہے
جان ہے تو جہان ہے پیارے

سر اٹھاتے ہی ہو گئے پامال   سبزۂ نو دمیدہ کے مانند

ہائے جوانی کیا کیا کہتے شور سروں میں رکھتے تھے
اب کیا ہے وہ عہد گیا وہ موسم وہ ہنگام گیا

میر کے یہ اشعار وزیر آغا کے اس قول کی تائید کرتے ہیں کہ میر کو کس قدر احساس زیاں ہے ان کے دل میں خواہشوں کا کیسا کہرام برپا ہے اور جس کی تکمیل کا کوئی ذریعہ ان کے پاس نہیں ہے.

نامرادانہ زیست کرتا تھا
میر کا طور یاد ہے ہم کو

دراصل میر کا عشق جیسا کہ ڈاکٹر وزیر آغا کا خیال ہے تصوف سے آفریدہ نہیں ہے بلکہ وہ اسی دنیا کی جیتی جاگتی کوئی حسین مخلوق ہے جو ان کی جان کا آزار بن بیٹھی ہے.

اس کے ایفائے عہد تک نہ جئے
عمر نے ہم سے بے وفائی کی

معروف صحافی خوشونت سنگھ نے اپنے ناول دلی میں میر تقی میر کی حیات معاشقہ کی مصوری اپنے منفرد اور خوبصورت انداز میں کی ہے یہ بالکل صحیح نہیں ہو سکتی اس کا شبہ ہے مگر کچھ نہ کچھ راز درون میخانہ ہے جسے خشونت سنگھ نے پر لطف انداز میں کہانی کی شکل دے دی ہے لیکن ان سب سے ایک بات بہر حال صاف ہے کہ میر حسن پرست تھے عشق میں چوٹ کھائے ہوئے تھے اور اپنے اس جذبہ کو اس صداقت کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ وہ دل پر نشتر کا کام کر جاتے ہیں. ذکر میر میں اپنے معاملات حسن و عشق سے متعلق خود لکھتے ہیں دہلی کی بربادی کے بعد.

"وہ اس محلہ میں جا نکلا جہاں رہتا تھا جلسے کرتا تھا. شعر پڑھتا تھا، عاشقانہ زندگی گزارتا تھا. راتوں کو روتا تھا. خوش قدوں سے عشق لڑاتا. ان کے حسن کی تعریف کرتا اور لمبی لمبی زلفوں والوں کے ساتھ رہتا. حسینوں کی پرستش کرتا"

اس طرح یہ بات ثابت ہے کہ میر غم روزگار کے اسیر تو تھے ہی غم یار نے ان کا دامن کبھی نہیں چھوڑا. وہ اپنی تمام زندگی وصل و ہجر کی لذتوں کے بیچ گذارتے ہیں.

گرمیِ عشق مانع نشو و نما ہوئی
میں وہ نہال تھا کہ اگا اور جل گیا

میر نے محبوب کی سراپا نگاری بھی خوب کی ہے کہ اس کا جواب آج تک نہ ہو سکا ان کے ذہن و دل پر عکس رخ محبوب اس طرح ثبت ہو گیا تھا کہ وہ زندگی اسی کے خمار میں گذار رہے تھے.

دل پر خوں کی اک گلابی سے
عمر بھر ہم رہے شرابی سے

موسم ابر ہو سبو بھی ہو   گل ہو گلشن بھی ہو اور تو بھی ہو

ساعد سیمیں دونوں اس کے ہاتھ میں لاکر چھوڑ دیئے
بھولے اس کے قول و قسم پر ہائے کیسا قرار کیا

الغرض میر کی شاعری دل اور دلی کی داستان ہے. وہ کوچۂ عشق کے شاعر ہیں. حسن کی سحر کارانہ اداؤں سے لطف اندوز بھی ہوتے ہیں اور دنیا کے الم سے رنجیدہ بھی مگر عمومی تاثر غم و اندوہ کی فضا میں دل کے خوشگوار لمحات کا اظہار ہے. میر کی شخصیت اور شاعری کے متعلق پروفیسر احتشام حسین کا یہ تجزیہ حقیقت آئینہ حسن کاری سے مزین ہے.

میرؔ نے اپنی زندگی تکلیف اور بدحالی میں گذاری تھی اس لئے انھیں اجڑی ہوئی دل کی علامت کہنا غلط نہ ہوگا۔ صوفی منش باپ نے انھیں سکھایا تھا کہ دنیا میں محبت کے علاوہ کچھ نہیں یہی زندگی ہے..... اور انھیں نے ان کی شاعری میں زندگی کی آگ پیدا کر دی تھی جب مصائب نے انھیں چاروں طرف سے گھیر لیا تو میرؔ کی شخصیت میں ایک حیرت انگیز بانکپن اور حسن پیدا ہوگیا اس ذہن کے ساتھ نگاہ محبت کا زخم بھی لگا جس نے شاعری کو آتش نوائی میں تبدیل کر دیا اور آپ بیتی بنی نوع انسان کے دکھ درد کی ترجمانی کرنے لگی۔

میرؔ آج تک غزل کے سب سے بڑے شاعر مانے جاتے ہیں ان کے شعر تیر کی طرح دل میں اتر جاتے ہیں۔ سیدھی سادی بول چال کی زبان میں اتنا مزہ اور اتنی مٹھاس، اتنا زہر، اتنی تلخی، جذبات کی اتنی نازک مصوری اور جذبات کا اتنا طوفانی جوش تخلیق شعر کا ایک معجزہ معلوم ہوتا ہے۔

(اردو ادب کی تنقیدی تاریخ۔ صفحہ ۷۰)

دل وہ نگر نہیں کہ پھر آباد ہو سکے
پچھتاؤ گے سنو ہو یہ بستی اجاڑ کے

میرؔ کے اکثر اشعار زبان زد ہیں اور مواقع اور محل پر آج بھی زبان پر رواں ہو جاتے ہیں۔ میرؔ کی زبان بھی شعراء کے لئے اختیار کرنے کی سعی باعث افتخار رہی ہے۔ بقول علی سردار جعفری۔

سنوارے غزل اپنی بیانِ غالب سے
زبانِ میرؔ میں بھی ہاں کبھو کبھو کہئے

میرؔ کی غزلوں میں تصوف

..... (صفحہ ۷۱ کا بقیہ)

تھا مستعار حسن سے اس کے جو نور تھا
خورشید میں بھی اس ہی کا ذرہ ظہور تھا

ارباب عرفان پر جب محبت غلبہ پاتی ہے تو انھیں صانع کل کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔

عام ہے یار کی تجلّی میرؔ
خاص موسیٰ و کوہ طور نہیں

لیکن شراب معرفت کی سرشاریوں کے بعد یہ پردہ اٹھتا ہوسے قربان پیالۂ مے ناب جس سے کہ ترا حجاب نکلا

جو اپنے آپ کو پہچان لیتا ہے وہی حقیقت کی خبر رکھتا ہے۔ مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ میرؔ بھی اس حقیقت سے آشنا ہیں۔

اپنی ہی سیر کرنے کو ہم جلوہ گر ہوئے تھے
اس رمز کو ولیکن معدود جانتے ہیں

فنا اور بقا تصوف کے جہاں فروز مسئلے ہیں کہا جاتا ہے کہ فنا دراصل بقا کا دیباچہ ہے۔ اس لئے رنگینی تصوف کی دنیا میں عین مقصود اور آرزوؤں کی انتہا ہے اور موت کی منزل ترقی کی ایک دلنواز منزل ہے۔

لذت سے نہیں خالی جانوں کا کھپا جانا
کب خضر و مسیحا نے مرنے کا مزہ جانا

عرض کر چکا ہوں کہ میرؔ صاحب حال نہیں تھے لیکن اپنی غزلوں میں صاحبانِ حال کی صحبتوں سے فیض یافتہ نظر آتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں اثرات نمایاں طور پر محسوس ہوتے ہیں۔ میرؔ صوفی نہیں تو نہ سہی لیکن جب اپنی فنکارانہ صلاحیتوں سے کام فرماتے ہیں تو معارف کے وہ دریا بہاتے ہیں کہ ایمان ویقین کے جویا سیرابیوں سے ہمکنار ہو کر شادابیوں کے جلوے بکھیرتے نظر آتے ہیں اور میرؔ فضاؤں میں گونج اٹھتے ہیں سے

آنکھوں ہی میں رہے ہو دل سے نہیں گئے ہو
حیران ہوں یہ شوخی آئی تمہیں کہاں سے

عرش تک تو خیال پہونچا میرؔ
وہم پھر ہے کہیں قیاس نہیں

تصوف اور تغزل، مجاز اور حقیقت کی سرحدوں کو یکجا کرکے میرؔ نے اردو شاعری کو جس طرح مالامال کر دیا ہے وہ میرؔ ہی کا حصہ ہے۔

٥٥

ڈاکٹر شکیل احمد
قاسمی منزل، ڈومن پورہ مئوناتھ بھنجن یوپی

میر کا استفہامیہ لہجہ

سوالیہ انداز میں بات کرنا، گفتگو کو آگے بڑھانا روزمرہ کی زندگی میں عام سی بات ہے۔ شاعری کے میدان میں سوالیہ الفاظ کی مدد سے شعر کہنا یا کلام میں استفہامیہ انداز پیدا کرنا بھی کوئی نہیں بات نہیں اور نہ ہی استفہامیہ انداز کلام کی بنیاد پر کسی کلام کی تنقید کی اساس رکھی جانی چاہئے لیکن اگر استفہامیہ انداز کلام قاری کو متاثر کرتا ہے، شعر کے حسن اور شاعر کی قادر الکلامی کی گواہی دیتا ہے تو اس پر غور کیا جانا اور اس کی ستائش کرنا ضروری ہے۔ اظہار کے بہت سے پیرایوں میں استفہامیہ انداز بھی شامل ہے۔

میر کے کلام کا جائزہ لیا جائے تو متعدد ایسے اشعار جو استفہامیہ پیرائے کے نمائندہ ہیں وہ ان کے بہترین اشعار بھی ہیں۔ متعدد ایسے اشعار بھی ہیں جو دو صدی سے ضرب المثل کی حیثیت اختیار کئے ہوئے ہیں۔ میر کے اشعار کی مدد سے ہم ان کی شاعری کے ذرا مختلف پہلو سے بھی لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ عام بیانیہ انداز سے ہٹ کر سوالیہ انداز گفتگو اگر شاعری میں اختیار کیا جائے تو قاری کو کس حد تک متاثر یا متوجہ کر سکتا ہے اس نظریہ کو ذہن میں رکھ کر میر کے کچھ اشعار زیر بحث ہیں۔

اکبر آباد سے دہلی کا رخ کرنا میر کی ابتدائی زندگی کا واقعہ تھا لیکن اکسٹھ سال کی عمر میں دلی سے دل برداشتہ، پژمردہ اور نڈھال میر کی لکھنؤ تشریف آوری، ان کی زندگی بہت اہم موڑ ثابت ہوئی۔ وہ میر جن پر انا پسند ہونے کا ہم عصروں نے الزام دھرا تھا بہ حال خستہ لکھنؤ وارد ہونے کے بعد ان کی انا پسندی کو ٹھیس تو یقیناً لگی ہوگی اور دل و ذہن جس کرب سے گذرے ہوں گے ان کو سمجھ لینا بھی کوئی مشکل نہیں ہے۔ اپنے ان محسوسات کو قطعہ کی شکل دے کر انھوں نے اپنے دل کے پھپھولے بھی پھوڑے اور عوام تک اپنے کرب کو بھی برملا پہونچا دیا ہے سوالیہ لفظ کیا سے پہلا مصرع شروع ہوتا ہے۔

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو!
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

میر نے اپنے اشعار میں کیا، کہاں، کیوں، کس کا، کیسا، کون اور کب جیسے الفاظ استعمال کر کے استفہامیہ انداز پیدا کیا ہے۔ اس قطعہ میں بیانیہ کو استفہامیہ لہجہ دے کر بات شروع کی ہے اور تاثیر پیدا کرنے کے لئے ''پورب کے ساکنو''، ''غریب جان کے'' اور ''اجڑے دیار'' جیسے لفظوں کو استعمال کیا ہے، ''پورب کے ساکنو'' میں انا کی اینٹھن مروڑے رہی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ غریب الدیار ہونے کے بعد بھی دل کی برتری سے دست کش ہونے کو تیار نہیں ہیں اور بود و باش پوچھنے والوں کو ''عالم میں انتخاب'' شہر کے حوالے سے خاموش کرنا چاہتے ہیں۔

میر کی شاعری غم ذات، غم جاناں، غم جہاں اور حسن و عشق کی ترجمان شاعری ہے۔ تمام مروجہ مضامین شاعری جو ان کے کلام میں موجود ہیں ان میں آہ و فغاں، حسن و جمال، دل و دماغ، درد و داغ اور لطف و فراغ سبھی شامل ہیں۔ غم ذات اور آپ بیتی کے رنگ کے استفہامیہ اشعار کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ وہ اپنی بات اور اپنے محسوسات کو زیادہ پر اثر رنگ دینے کے لئے استفہامیہ لہجہ اختیار کرتے تھے۔

اگر انھوں نے ارادتاً ایسا نہ کیا ہو تب بھی ذیل کے اشعار پر کشش ضرور ہیں۔

دیکھئے کیا ہو سانجھ تلک احوال ہمارا ابتر ہے
دل اپنا تو بجھا سا دیا ہے۔ جان چراغ مضطر ہے

کیسا چمن کہ ہم سے اسیروں کو منع ہے
چاکِ قفس سے باغ کی دیوار دیکھنا

میں کون ہوں؟ اے ہم نفساں سوختہ جاں ہوں
اک آگ مرے دل میں ہے۔ جو شعلہ فشاں ہوں

عشقیہ مضامین کو میرؔ نے اپنے خاص مزاج کے مطابق اشعار میں نظم کیا ہے۔ خاص معیار کے ساتھ معاملات عشق کو استفہامیہ لہجہ عطا کیا ہے۔ اس میں ان کی اپنی ذات کا پرتو بھی ہے اور حسین محبوب کی دل فریب جھلک بھی۔

نظر بھر دیکھتا کوئی تو تم آنکھیں چھپا لیتے
سماں اب یاد ہوگا کب؟ تمہیں وہ خورد سالی کا

کس سے جدا ہوئے ہیں کہ ایسے ہیں دردمند
منہ میرؔ جی کا آج نہایت ہی زرد ہے

میرؔ سے پوچھا جو میں عاشق ہو تم؟ ہو کے کچھ چپکے سے شرمائے بہت
دور پھرنے کا ہم سے وقت ہے کیا؟ پوچھ کچھ حال بیٹھ کر نزدیک

میرؔ نے دہلی کے خاص رنگ میں غزل کے اشعار کو بلندی فکر و نظر کے ساتھ پیش کیا ہے یہ اشعار نہ صرف ان کی غزلیہ شاعری کی شناخت ہیں بلکہ اردو غزل کے دو سو سالہ سرمایہ میں گرانقدر تسلیم کئے جاتے ہیں۔ وضعداری اور اعلیٰ ظرفی کے ساتھ مضامین عشق کو یوں پیش کرتے ہیں:

مرگِ مجنوں پہ عقل گم ہے میرؔ کیا دوانے نے موت پائی ہے
دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

لیتے ہی نام اس کا سوتے سے چونک اٹھے ہو
ہے خیر میرؔ صاحب کچھ تم نے خواب دیکھا

کن نیندوں اب تو سوتی ہے اے چشم گریہ ناک؟
مژگاں تو کھول شہر کو سیلاب لے گیا

کیا جانوں چشم تر سے ادھر دل پہ کیا ہوا
کس کو خبر ہے میرؔ سمندر کے پار کی

دیکھ تو دل کہ جاں سے اٹھتا ہے
یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے؟

خبر نہ تھی تجھے کیا میرے دل کی طاقت کی
نگاہِ خشم ادھر تو نے کیا قیامت کی

درج بالا اشعار میں جو کشش اور تاثیر موجود ہے اس میں میرؔ کے استفہامیہ لہجے کا بھی دخل ہے خاص طور پر "دیکھ تو دل کہ جاں سے اٹھتا ہے" میں جو استعجاب اور استفہام ہے اس میں سادگی شوخی اور التجا بھی شامل ہے۔ "کچھ تم نے خواب دیکھا" میں جو لطیف استفہامیہ انداز پنہاں ہے وہ اس برجستگی کا ثبوت ہے جو صرف میرؔ کا حصّہ ہے مذکورہ تمام اشعار دبستان دہلی کے نمائندہ اور اکیسویں صدی کے اندر قاری کے لئے پسندیدہ اور دلکش ہیں۔ ان اشعار میں فطرتِ انسانی کی ترجمانی بھی ہے اور انسانی جذبات کی سچی تصویر کشی بھی۔

شاعرانہ تعلی کے اشعار میرؔ کے یہاں بھی موجود ہیں لیکن یہاں بھی استفہامیہ انداز نے کلام میں ندرت پیدا کر دی ہے۔ وہ عام رویوں سے مختلف انداز میں اپنے شاعرانہ کمالات کا دعوا پیش کرتے ہیں۔ کچھ یہی انداز معاملات دنیا اور راہِ عشق کے متعلق بھی اختیار کرتے ہیں۔ ذیل کے اشعار سے اس رویہ کی وضاحت ہو جائے گی۔

سہل ہے میرؔ کا سمجھنا کیا
ہر سخن اس کا اِک مقام سے ہے

کیا جانوں دل کو کھینچے ہیں کیوں شعر میرؔ کے
کچھ طرز ایسی بھی نہیں، ایہام بھی نہیں

مرحلۂ عشق کی بلندی اس شعر سے عیاں ہے۔

ہوگا کسی دیوار کے سائے کے تلے میرؔ
کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو

یا بے ثباتیِ دنیا کی تشریح کے لئے یہ شعر ملاحظہ ہو۔

کہا میں نے کتنا ہے گل کو ثبات
کلی نے یہ سُن کر تبسم کیا

(بقیہ صـ۵۳ پر)

ڈاکٹر فاضل احسن ہاشمی
شعبۂ اردو، الٰہ آباد یونیورسٹی الٰہ آباد

میر ماورائے دیر و حرم

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے میر صاحب کے مندرجہ ذیل اشعار میں وہ روح بول رہی ہے جو کسی بھی شخصیت کو انسانوں کے درمیان بنی ہوئی مصنوعی دیوار کو گرا کر انسانیت کے لئے راہ ہموار کرتی ہے۔

مت رنجہ کر کسی کو کہ اپنے تو اعتقاد
دل ڈھائے کر جو کعبہ بنایا تو کیا ہوا

ہم نہ کہتے تھے کہ مت دیر و حرم کی راہ چل
اب یہ جھگڑا حشر تک شیخ و برہمن میں رہا

ہم نہ کہتے تھے کہیں زلف کہیں رخ نہ دکھا
اک خلاف آیا نہ ہندو مسلماں کے بیچ

اس کے فروغ حسن سے جھمکے ہے سب میں نور
شمع حرم ہو یا کہ دیا سوم ناتھ کا

تصوف اور بھکتی تحریک کے زیر اثر یہ ممکن تھا کہ شمع حرم روشن ہو تو سوم ناتھ میں اجالا پھیل جائے اور ادھر اذان دی جائے تو ادھر صدائے ناقوس سے اللہ اکبر سنائی دے کیوں؟ اس لئے کہ حقیقت ایک ہے میر صاحب نے اس حد تک اہتمام کیا ہے کہ لکھا۔

"ہر ذی حیات کا ہے سبب جو حیات کا
نکلے ہے جی ہی اس کے لئے کائنات کا

اب یہاں لفظ "ہر" پر غور کر لیجئے۔ یہ وہی "ہر" ہے جو سب "ہری ادم" کہلاتا ہے اور یہ وہی "ہر" ہے جس کی تکرار بھگوان شیو کو مہا دیو کہہ کر پکارتی ہے اس لئے کہ میر صاحب کا یہ عقیدہ ہے کہ حقیقت مطلق ایک ہے اور وہی واحد حقیقت کائنات میں جاری و ساری ہے۔

اس طرح کے اعتقادات انسان کو معنی خیز تصورات کی دولت عطا کرتے ہیں یہ تصورات ہوتے ہیں باہمی احترام کے، وسیع المشربی کے، انسان دوستی کے۔ یہ ہر طرح کی نفرت کی دیواریں گرا دیتے ہیں اب انسان انسان کی سطح پر آ کر ایک دوسرے سے صرف محبت کی باتیں سوچتا ہے۔ محبت میر صاحب کا محبوب موضوع ہے اس محبت کی کئی جہتیں ہیں۔ یہاں ان کی صرف انسان دوستی کا تذکرہ ہے اور یہ وہی انسان دوستی ہے جو دور حاضر کی اصطلاح میں سیکولرازم کہلاتی ہے۔ حالانکہ یہ اصطلاح سیاسی بھی جاتی ہے لیکن پیچ پوچھئے تو اس اصطلاح کا سیاست سے رشتہ جوڑنے والا علاء الدین خلجی تھا۔ اس نے قاضی مغیث الدین سے کہا جس کا مفہوم یہ تھا کہ ملکی معاملات میں مذہبی دخل اندازی مناسب نہیں ہے۔ حالانکہ خلجی سے بہت پہلے اسلام نے قرآن حکیم کے ذریعہ دنیا کو یہ دو پیغام بھی دے دئے تھے۔

۱. لَا اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ
۲. لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنُ

یعنی دین میں کوئی جبر نہیں ہے۔ تمہارا دین تمہارے ساتھ میرا دین میرے ساتھ یعنی مذہب ایک شخصی چیز ہے۔ میرے ذاتی عقیدے سے میرے ذاتی اعمال سے کسی کو کیا سروکار؟

میں کیا کھاتا ہوں۔ میں کس پانی سے نہاتا ہوں۔ اصل پر غور کرو تو زمزم میں گنگا کی لہریں نظر آئیں گی اور دجلہ و فرات میں جمنا اور کاویری جھلکیں گی۔ کیا کسی کو گنگا کے پانی سے اس لئے احتراز ہوگا کہ وہ ہندوستان کے ملک کا دریا ہے اور یہ بھول جائے گا کہ ہمارے آباؤ اجداد نے اسی پانی سے وضو کر کے نمازیں ادا کی ہیں۔ اس لئے یہ سارے اختلافات دراصل وہ حجابات کے پردے ہیں جو انسانوں نے خود تخلیق کئے

ہیں۔ میر صاحب ان حجابات کے قائل نہیں۔ وہ حسن کو بے حجاب دیکھنا چاہتے ہیں اس لئے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ مسلک کے اعتبار سے وہ مسلمان نہ تھے انھیں کا شعر ہے۔

ترے بندے ہم ہیں خدا جانتا ہے
خدا جانے تو ہم کو کیا جانتا ہے

کہتے ہیں۔

مرتے ہیں ہم تو اس صنم خود نما کے ساتھ
جیتے ہیں وہ ہی لوگ جو کچھ ہیں خدا کے ساتھ

میر صاحب کے حمد کے اشعار تو ہیں ہی۔ کلیات میر میں نعت و منقبت کا ایک سیل رواں ہے جو بے دینی کو بہالے جاتا ہے اب صرف ایک بند ملاحظہ کیجئے۔

روؤں ہوں شرم گنہ سے زار زار   بے غایت کچھ نہیں اسلوب کار
دل کو جب ہوتا ہے آکر اضطرار   زیر لب کہتا ہوں میں یہ بار بار

رحمت اللعالمینی یا رسول
ہم شفیع المذنبینی یا رسول

اور یہ اس شخص کے اشعار ہیں جس کے یہ اشعار بار بار پڑھے جاتے ہیں اور لوگ پریشان ہوتے ہیں کہ میر نے واقعی ترک اسلام کیا تھا؟

سارے رندو باش جہاں کے تجھ سے سجود میں رہتے ہیں
بانکے ٹیڑھے ترچھے تیکھے سب کا تجھ کو امام کیا
کس کا کعبہ کیسا قبلہ کون حرم ہے کیا احرام
کوچے کے اس کے باشندوں نے سب کو یہیں سے سلام کیا

میر کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو اُن نے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

ان اشعار سے قبل حمد و نعت کا جو بند لکھ چکا ہوں تو اب یہ بھی سنئے کہ۔ حضرت علیؓ مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی مدح میں ایک قصیدہ۔

جب سے خورشید ہوا ہے چمن افروز حمیل

سوداکی چوٹ پر لکھا ہے سودا کا قصیدہ ہے۔

اٹھ گیا بہمن و دَے کا چمنستاں سے عمل

بحیثیت شعر کے اس قصیدہ میں کوئی سبب نہیں ہے کہ انھیں سودا سے کم تر قرار دیا جائے خود اس میں ایسے شعر بھی لکھے ہیں۔

دور از بسکہ کھینچا عرش سے رتبہ ترا
حرف تیرا ہے ترے شیعوں کو وحی منزل

نعت کے بعد ایک مخمس حضرت امام حسین کی مدح میں ہے بقیہ سارے مخمس و مسدس حضرت علی کی مدح میں ہیں کچھ اشعار درج کئے جاتے ہیں۔

یا علی یا ایلیا یا ابوالحسن یا ابو تراب
حلّ مشکل سرورِ دیں شافع یوم الحساب
ہم علی کو خدا نہیں جانا
پر خدا سے جدا نہیں جانا
یا علی کیست کہ شرمندۂ احساں تو نیست
بر سر خوان کرم کیست کہ مہمان تو نیست ا
حیدری ہوں حیدری، ہوں حیدری
یا علی یا علی کہا کر تو
یا علی جو تجھے کہتے ہیں بجا کہتے ہیں۔

(کلیات میر صد ۱۲ تا صد ۲۶۵)

دیوان ششم کے بعد فردیات، رباعیات، قطعات وغیرہ اور ترکیب بند کے نعت و منقبت کے عنوان کے تحت میر صاحب کے سلسلہ میں وہ اشعار بھی درج کئے گئے ہیں جس سے کہیں ان کی مذہبیت ابھرتی ہے تو کہیں وہ مسلمان ہی نہیں نظر آتے ہیں۔ اب یہ شعر دیکھئے۔

تجھ کو مسجد پسند مجھ کو ہے خانہ
واعظا اپنی اپنی قسمت ہے

وہ اپنی بت پرستی کا کیا خوبصورت جواز پیش کرتے ہیں

اپنی نیاز تم سے اب تک بتاں وہی ہے
تم ہو خدائے باطل ہم بندے ہیں تمہارے

اگر غور کیجئے تو صوفیہ کے لا الٰہ کی اس سے بہتر تشریح نہیں ہوسکتی ہے۔ جو کچھ ہے خدا کی طرف سے ہے۔

جو آدیں بتاں جذب سے یاں تو یہ
خدا کے طرف ہی کی تائید ہے

ان کا عقیدہ یہ ہے کہ

میر اس بتکدہ سے کعبہ گیا　　کیا کرے جو خدا خراب کرے

وہ بتکدہ میں صورتیں دیکھتے ہیں میکدہ میں سارے امتیازات مٹتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ دراصل بتکدہ ہو یا میکدہ وہ مذہب میں ریاکاری کے خلاف ہیں۔ مذہب کے خلاف نہیں۔ دیکھئے۔

گر کوئی پیر مغاں مجھ کو کرے تو دیکھئے پھر
میکدہ سارے کا سارا صرف ہے اللہ کا

میر کے تصورات میں صحیح معنوں میں وہ نظریہ ہے جسے آج سیکولرازم کہا جاتا ہے اور جو عہد قدیم میں اہل طریقت کا تصور تھا یعنی مذہب ایک شخصی اور ذاتی شے ہے۔ عقیدہ کسی کا کچھ ہو سارے انسان ایک ہیں۔

جو ہے سو میر اس کو میرا خدا کہے ہے
کیا خاک نسبت اس سے ہر فرد کو جدا ہے

بیان الٰہیات کے سلسلہ میں یہ وضاحت کی گئی کہ ہر فرد کو یہ حق ہے کہ وہ اپنے طور پر معبود کی عبادت کرے۔ ظاہر ہے انسان مختلف ہو سکتے ہیں۔ عبادت گاہیں مختلف ہو سکتی ہیں لیکن اصل حقیقت تو ایک ہے ایک ہی رہے گی اور جب خالق ایک ہے سب اس کے بندے ہیں تو ان میں فرق کیسا؟ اسی سے لو لگایئے۔ اسی کے ہو جایئے۔ کہتے ہیں۔

تو نہ ہووے تو نظم کل اٹھ جائے　　سچے ہیں شاعراں خدا ہے عشق

اس طرح میر اپنی وسیع النظری کے ساتھ ایسے انسانوں کا تصور رکھتے ہیں جو نفرت تعصب اور انسانوں کے درمیان تفریق کی دیواریں نہیں رکھتے۔ جب خالق ایک تو دنیا کے تمام انسان بھی ایک۔ ان کے پیش نظر وہ تصور ہے جو کسی کے پاس نہیں ہے۔ کہتے ہیں۔

جائے ہے جی نجات کے غم میں　　ایسی جنت گئی جہنم میں

جنت و نجات کا تصور اگر کسی لالچ کی بنیاد پر ہے یا اس کے پس منظر میں خوف ہے تو پھر ایسی جنت کو کوئی کیا کرے گا۔ غالب نے بھی بڑی خوبصورتی سے میر کے چراغ سے اپنا چراغ روشن کر دیا۔ کہہ دیا۔

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

لیکن غالب کی ذہانت نے پہلے مصرعہ میں بات کا رخ لالچ کی طرف موڑ دیا کہ اطاعت رب شہد و شراب کے لالچ میں نہ کرو۔ میر صاحب نے بہت پہلے ایسی جنت کو جہنم میں ڈال دیا تھا جو نجات کے ڈر سے حاصل ہوئی ان کے خیال میں اس کے معنی یہ تھے کہ ہم نے اپنے گناہ زیادہ سمجھے اور کریم کی رحمت کو کم سمجھا۔

بے شک ہم گنہ گار ہیں لیکن وہ بھی کریم ہے ہم اس کے قہار ہونے کا ذکر نہیں کرتے غفار ہونے کی بات کرتے ہیں۔ وہ رسوم و روایات سے ماورا ہے یہ شعر دیکھئے۔

ہم مذہبوں میں صرف کرم سے ہے گفتگو
مذکور و ذکر یاں نہیں صوم و صلوٰۃ کا

میر کے یہاں بتکدہ، صنم، میکدہ، شمع حرم، سوم ناقہ کا دیا، قشقہ صوم و صلوٰۃ، مسجد، مدرسہ، خانقاہ، بغچہ، شیخ حرم، دستار، فقیر ان سب کا تذکرہ خود اپنی جگہ پر استعارات کی طرفگی کی بنا پر خود ایک موضوع کی حیثیت رکھتا ہے وہ علی کو ولی بھی کہتے ہیں۔ احد کو احمد سے الگ نہیں جانتے۔ ترک اسلام بھی کرتے ہیں یہ صرف ایک ہی بات بتاتے ہیں کہ انسان وہی ہے جو وسعت قلب کے ساتھ جئے۔ یہ وسعت قلب کیا ہے۔ وسیع النظری کیا ہے۔ آزاد مشربی کیا ہے یہ مباحث ایسے ہیں جن پر مستقل تصانیف کی ضرورت ہے۔

البتہ ایک سوال ضرور ہے کہ جب وہ دیر و حرم کے آئین و رسوم کے پابند نہیں تو پھر آخر ان کا مسلک کیا ہے کیا وہ صوفی محض ہے تو کس سلسلہ سے بیعت تھے آخر کوئی دین و مذہب تھا۔

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے تمام مذاہب کا احترام اور اس مسلک کی پابندی جسے انسانیت کہا جاتا ہے میر صاحب سے استفادہ کرتے ہوئے غالب نے دیر و حرم کو "آئینہ تکرار تمنا" کہا تھا میر صاحب اس پورے تصور ہی کے خلاف تھے۔ وہ صرف انسانیت کے پرستار تھے۔ انھوں نے اس انسانیت کو دیکھا تھا جہاں احد اور احمد میں صرف م کا فرق ہے۔ اور جہاں علی کو خدا نہیں جانا پر خدا سے جدا نہیں جانا۔

اب تو جاتے ہیں بتکدے سے میر
پھر ملیں گے اگر خدا لایا

۵۵

ظفر اللہ انصاری
۳۱۔ پیریار ہاسٹل جواہر لال نہرو یونیورسٹی نئی دہلی ۱۱۰۰۶۷

میر کا احساس برتری

ہر شاعر اور ادیب اپنے عہد کا عکاس ہوتا ہے۔ وہ اپنے عہد کی معاشرتی کشمکش، ذہنی اور فکری تذبذب، حادثات و واقعات، خیالات و میلانات، رسوم و رواج، حالات و کوائف، حسیات و تخیلات اور سیاسی زیر و بم وغیرہ کی عکاسی کرتا ہے اور اسی وجہ سے اسے اس دور سے منسلک اور وابستہ مان لیا جاتا ہے اور اس کو اس کے عہد کا نقیب تصور کیا جاتا ہے لیکن کچھ شاعر اور ادیب ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنے دور کی تصویر کشی تو کرتے ہی ہیں ساتھ ہی ایسے ادب کی تخلیق بھی کرتے ہیں جو ہر دور میں خضر و الیاس جیسا کارنمایاں انجام دیتا ہے۔ ایسے شاعر اور ادیب کا ادب Evergeen کی حیثیت رکھتا ہے جس کی وجہ سے ہر دور کے لوگ انھیں اپنا نمایندہ تصور کرتے ہیں۔ ایسے شاعر و ادیب ماضی کے حادثات و واقعات، حال کے منصوبے اور مستقبل کے روشن اور تابناک خواب سے ماخوذ نتائج و تجربات کو صفحۂ قرطاس پر مرتسم کرتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے ادب میں حیات انگیزی آجاتی ہے لیکن یہ خصوصیات کم ہی شاعروں اور ادیبوں میں پائی جاتی ہیں مذکورہ بالا خصوصیات کی بنا پر میر صرف اپنے ہی دور کے نہیں بلکہ ہر دور کے بڑے شاعر ہیں۔ ناسخ، غالب، مومن، ذوق، شیفتہ داغ، حسرت، امیر جیسے متغزلین عصر اور نابغۂ زمانہ فنکاروں نے میر کی استادی و قادر الکلامی، لب و لہجہ کی ندرت، زبان و بیان کی شستگی، فکر کی بلندی اور احساس کی شدت کا اعتراف کیا ہے۔ اردو کا کون ایسا شاعر ہوگا جس نے کلام میر سے استفادہ نہ کیا ہو لیکن بعض کوتاہ فہم اور دیدۂ کور ناقدین کا یہ کہنا ہے کہ یہ اعتراف نذرانۂ عقیدت کے مصداق ہے۔ چونکہ میر اردو کے پہلے مشہور و مقبول بڑے شاعر ہیں اس لئے بطور عقیدت ان کی زبان قلم سے میر کی شان و عظمت کے اعتراف و اقبال میں مدحیہ اشعار ٹپک پڑے ہیں اور حقیقت سے اس کا کچھ بھی واسطہ نہیں ہے۔ مگر کلیات و دواوین میر کا عمیق مطالعہ کرنے پر مطلع صاف ہو جاتا ہے؟ اور یہ حقیقت سورج کی طرح روشن ہو جاتی ہے کہ بلاشبہ وہ عظیم شاعر تھے اور ان کی شاعری ہر دور اور ہر زمانے میں Relivent رہنے والی ہے۔ گرد و غبار زمانہ ان کی شاعری کے حسن کو کم نہیں کر سکتا کیونکہ ان کے ہر شعر میں معنی و مفہوم کا گلشن کشمیر سرسبز و شاداب ہے جس کے شام آگیں اور رنگ برنگے گل بوٹے اہل خرد کے دل و دماغ کو تر و تازگی اور راحت و مسرت عطا کرتے ہیں۔

میر کے بعض ناقدین نے میر کو صرف غم کا شاعر تسلیم کر کے ان کی شاعری کے اور دوسرے روشن اور تابناک پہلوؤں کو پوشیدہ اور بعید از نگاہ رکھا ہے۔ یہ ادب اور بالخصوص میر کے ساتھ ناانصافی کا ارتکاب ہے۔ میر نے غم و الم کے علاوہ دیگر موضوعات کو بھی مطمح نگاہ بنایا ہے اور ان پر غور و فکر کر کے اپنے نتائج کو صفحۂ قرطاس پر بکھیرا ہے لیکن ان کی سہل پسندی اور تن آسانی کا یہ عالم ہے کہ انھوں نے ان پہلوؤں پر غور و فکر کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ میر کی شاعری کے بہت سے پہلو آج بھی طاق نسیاں کا گلدستہ بنے ہوئے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ غم اور غم کے مبادیات سے لغایت موضوع ان کا نشان امتیاز ہے لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ دیگر موضوعات کو حذف ریزہ سمجھ لیا جائے۔ حالانکہ وہ جواہر پارے ہیں۔

میر کا دور نہایت ہی کرب و انحطاط کا دور تھا۔ ان کے دور

میں بڑے بڑے سیاسی انقلابات وقوع پذیر ہوئے۔ ان کی شاعری میں ان سیاسی انقلابات کا عکس بڑے صاف طور سے دکھائی دیتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی میر کے خانگی حالات بھی نہایت ہی ناگفتہ بہ تھے ان کی زندگی بھی مفلسی کے عالم میں گذری۔ اس پر مستزاد یہ کہ عنفوان شباب میں انھیں ایک خوبصورت بلا سے بھی عشق ہو گیا اور وہ اسے حاصل نہ کر سکے اور تمام عمر اس کی یادوں میں کڑھتے رہے۔ میر کی شاعری میں ان سارے حالات و واقعات کے نقوش بکھرے پڑے ہیں۔ میر کا غم داخلی بھی تھا اور خارجی بھی۔ وہ غم ذات بھی رکھتے تھے اور غم کائنات بھی۔ اس کے باوجود میر نے زندگی سے فرار اختیار نہیں کیا۔ میر ایک ایسے شاعر ہیں جو ہجوم غم میں بھی صبر و شکر کے ساتھ زندگی گذارنے کے لئے ایک نیا ولولہ، ایک نئی امنگ ایک نیا حوصلہ اور ایک نئی تحریک عطا کرتے ہیں۔ کون ایسا جگر گردے والا ہوگا جو یاس کے عالم میں صبر کا دامن تھامے زندگی کے کڑھے کیسلے دن کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہوئے اور اپنی عزت و ناموس کا لحاظ رکھتے ہوئے اپنے حالات سے اپنے سایہ کو بھی خبر نہ ہونے دیتا ہو۔ یہ خوبی میر ہی میں تھی۔

پاس ناموس عشق تھا ورنہ
کتنے آنسو پلک تک آئے تھے

میر خواب امید کے شاعر ہیں۔ انھوں نے زندگی کے کڑوے کیسلے دن اس امید پر گذارے تھے کہ شام غریباں ایک دن صبح بہاراں کی صورت اختیار کرے گی۔ غم کی بدلی چھٹے گی اور آفتاب مسرت اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ فرما ہوگا۔ ایک دن گوشے گوشے میں ان کے نام کی شہرت ہوگی۔ جب ان کی غزلیں محفلوں میں پڑھی جائیں گی تو لوگ اپنا کلیجہ پیٹ پیٹ کر ان کو خراج عقیدت پیش کریں گے۔ ان کے مرنے کے بعد بھی ان کے کلام میں وہی تاثیر ہوگی جو کہ ان کی زندگی میں تھی۔ بلکہ اس کی اثر انگیزی میں اور اضافہ ہی ہوگا۔ یعنی کہ اس کرب و انحطاط کے دور میں بھی میر احساس کمتری میں مبتلا نہیں تھے بلکہ اس میں احساس برتری کا مادہ تھا چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

پڑھتے پھریں گے گلیوں میں ان ریختوں کو لوگ
مدت رہیں گی یاد یہ باتیں ہماریاں

اگرچہ گوشہ نشیں ہوں میں شاعروں میں میر
پہ میرے شعر نے روئے زمیں تمام کیا

دور تک رسوا ہوا ہوں شہروں ملک ملک
کس اودی آبادی میں یہ حرف و سخن مشہور نہیں

میر کو اپنی قابلیت اور استادی کا پورا پورا احساس تھا انھیں اپنی خداداد صلاحیت پر مکمل اعتماد تھا اپنی انفرادیت کا اظہار انھوں نے اپنی شاعری میں متعدد جگہوں پر کیا ہے۔

کسو کی بات نے آگے مرے نہ پایا رنگ
دلوں میں نقش ہے میری سخن طرازی کا

ہم سے خوش زمزمہ کہاں، یوں تو
لب و لہجہ ہزار رکھتے ہیں

نہیں ملتا سخن اپنا کسو سے ہماری گفتگو کا ڈھب جدا ہے

بات بنانا مشکل سا ہے شعر یہاں سب کہتے ہیں
فکر بلند سے یاروں کو اک ایسی غزل کہلانے دو

شور اب چمن میں میری غزل خوانی کا ہے میر
اک عندلیب کیا ہے کہوں میں ہزار ہیں

ان کی استادی کا شہرہ صرف دہلی تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ دکن تک پھیلا ہوا تھا۔ میر نے اس کا ذکر اپنی شاعری میں کئی جگہوں پر کیا ہے۔ نمونتاً ایک شعر پیش خدمت ہے۔

کچھ دلی میں ہی لوگ نہیں میر جیب چاک
ہے میرے ریختوں کا دوانہ دکن تمام

میر نے اپنی شاعری میں خیالات کو موتیوں کے ہار سا پرو دیا

(بقیہ صفحہ ۱۳۸ پر)

طفیل انصاری

مفتی محلہ، جون پور - ۲۲۲۰۰۱

رنگِ میر اور حفیظ جونپوری

میر تقی میر اردو زبان کے عظیم شاعر ہیں۔ انھیں "شہ شاعراں" اور "خدائے سخن" کہا گیا ہے۔ ان کے کلام کا حسن اور آفاقیت ہمیشہ باقی رہے گی۔ کلام میر کی اہمیت ہر دور میں مسلم رہی ہے۔ ان کے اشعار کو لوگ بطور سوغات اپنے اپنے شہروں کو لے جاتے تھے۔ یہ عزت اردو کے کسی اور شاعر کو نصیب نہیں ہوئی۔ اردو کے سبھی شعراء میر کی استادی کے قائل تھے۔ ناسخ، ذوق اور غالب جیسے شعراء نے میر کی عظمت کا اعتراف کیا ہے ؎

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں

میر صاحب اپنے مرتبے سے خود بھی واقف تھے جس کا اظہار بھی ان کے اشعار میں ہوا ہے۔

جانے کا نہیں شور سخن کا مرے ہرگز
تا حشر جہاں میں مرا دیوان رہے گا

سارے عالم پہ ہوں میں چھایا ہوا
مستند ہے میرا فرمایا ہوا

ان کے کلام میں فصاحت، سادگی، رنگینی، شیرینی، درد و یاس اور تاثیر کی شان بدرجۂ اتم ہیں۔ ان کا کلام آپ بیتی ہے۔ اشعار درد دل کی تصویریں ہیں۔ میر کی داخلی شاعری سراسر عشق و محبت کی پیداوار ہے۔ میر غم عشق اور غم روزگار کے مارے ہوئے تھے۔ اس لئے ان کی شراب دو آتشہ سے سہ آتشہ ہو گئی ہے۔ میر نے واردات قلبی کو شعری پیکر عطا کیا ہے۔

مجھ کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب میں نے درد و غم کتنے کئے جمع تو دیوان کیا

میر کی شاعری کی خود ان کے زمانے میں بے انتہا قدر ہوئی اور اب تک لوگ ان کی شاعری کا لوہا مانتے ہیں لیکن متاخرین کی غزلوں میں ان کے طرز بیان کا اثر بہت کم پایا جاتا ہے۔ میر مجروح اور مولانا حالی کے کلام میں میر کا رنگ کہیں کہیں نظر آتا ہے۔ حالی نے مقدمہ شاعری میں اس پر روشنی ڈالی ہے۔

میر کے اثرات یوں تو جدید اردو شاعری کے بہت بڑے حصہ پر اور تقریباً تمام اصناف پر پڑے ہیں۔ بطور خاص زبان اور لفظیات کے اعتبار سے۔ لب و لہجے اور لَے کے تعین میں میر سے بہت سے شعراء نے فیض پایا ہے۔ ہند و پاک کے ممتاز شعراء میں فراق، باقر مہدی، خلیل الرحمن اعظمی، پرویز شاہدی، ابن انشاء، ناصر کاظمی، قیوم نظر وغیرہ کی شاعری میں میر کے اثرات موجود ہیں۔

دبستان لکھنؤ کے مشہور شاعر وسیم اور امیر مینائی کے شاگرد حفیظ جونپوری نے بھی میر کی تقلید کی ہے۔ اساتذہ میں انھیں میر کا رنگ بہت پسند تھا۔

میر کے انداز پہ کس نے غزل لکھی حفیظ
مجھ کو زیبا ہے اگر اس بات کا دعویٰ کروں

حفیظ کا یہ صرف دعویٰ نہیں تھا بلکہ اسے انھوں نے ثابت کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ میر کا سوز و گداز، گداختگی، درد و یاس، حرماں نصیبی اور تاثیر وغیرہ ان کے کلام میں جا بجا نظر آتی ہیں۔

بیٹھے بیٹھے راستہ قاصد کا دن بھر دیکھنا
تارے گن گن رات کو یا جانب در دیکھنا

سنا کسی نے کہ آنکھوں سے گر پڑے آنسو
کہاں کا درد بھرا ہے مرے فسانے میں

مجھو تو یہ انتہائے غم ہے — آنسو کا اب آنکھ میں نہ رہنا

کی غم نے حفیظ ایسی تغیر تری صورت
اس وقت تجھے ہم نے آواز سے پہچانا

قفس کیا نشیمن سے کچھ دور تھا
مگر رہ گئے بال و پر دیکھ کر

داخلی شاعری میں جذبات و تاثرات کا بیان شاعر کے دل کی گہرائیوں سے ناکامی و نامرادی کی صورت میں ہوک بن کر اٹھتے ہیں اور پلکوں تک آتے آتے آنسو بن جاتے ہیں۔

میر کے رنگ کو حفیظ نے بھی اس حسن و خوبی سے بیان کیا ہے کہ آپ بیتی میں جگ بیتی کا مزہ آتا ہے۔ ان کا کلام جراحت دل کی آہ و فغاں ہے جس میں اصلیت کے ساتھ سوز و گداز ہے جو دل پر خاص اثر کرتا ہے۔

تو جو کہتا تو بڑا فخر تھا اس کا مجھکو
لوگ کہتے ہیں ترا چاہنے والا مجھکو

خاک میں ہم کو ملا دو مگر اتنا کرنا
پھر نہ اس طرح کسی کو کبھی رسوا کرنا

تم ہی نہیں تو ساری خدائی سے کیا غرض
دنیا سے احتیاط، زمانے سے احتیاط

جو کھا چکے ہیں محبت کی چوٹ دل پہ حفیظ
انھیں کو قدر ہمارے کلام کی ہوگی

حفیظ کی غزلوں میں اصلیت کا رنگ بہت نمایاں ہے۔ میر کی طرح یہ بھی غم روزگار اور غم عشق کے مارے ہوئے تھے واردات عشق کا پر لطف واقعاتی اور حقیقی بیان درد و اثر اور حسن بیان کی خوبیاں انھیں میر کے قریب کر دیتی ہیں۔ حفیظ نے میر کے رنگ میں شعر کہنے کی کوشش کی ہے اس کا اعتراف بھی ان کے اشعار میں ہے۔

حفیظ اس طرز نو کی شاعری اچھی تو ہے لیکن
غزل میں میر ہی کا رنگ تا امکان پیدا کر

دیوان حفیظ حصہ اول "غم گسار" (۱۹۰۲ء) کے دیباچہ میں مشہور صحافی خیر در بھنگوی رقم طراز ہیں۔

"یہ دیوان درد و یاس کا مجموعہ ہے۔ اس کو پڑھنے سے خدائے سخن میر کی شاعری کا مزہ آتا ہے"

میر کا کلام زبان و بیان کی گھلاوٹ کا بہترین نمونہ ہے ان کے بہت سے اشعار سہل ممتنع کی بہترین مثال ہیں۔ سلاست و روانی کلام حفیظ میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ اس ضمن میں چند اشعار پیش ہیں۔

نامہ بر نامہ جب دیا تو نے — کچھ زبانی بھی اس نے پوچھا تھا
آپ وعدہ یوں ہی کیے جائیں — ہم کوئی اعتبار کرتے ہیں
کاش اک دن وہ بھول کر آتا — یاد جس کی کبھی نہیں جاتی
یہ باتیں اور مجھ سا کہنے والا — فسانہ اور پھر میرا فسانہ

میر اپنے محبوب کا یوں تعارف کراتے ہیں۔

گل ہو، مہتاب ہو، آئینہ ہو، خورشید ہو میر
اپنا محبوب وہی ہے جو ادا رکھتا ہو

لیکن حفیظ کے محبوب میں شوخی و شرارت کا عنصر بھی ہے۔

جس میں شوخی نہ شرارت نہ کرشمہ نہ ادا
ایسے معشوق سے مٹی کی ہے مورت اچھی

فی الحقیقت اس میدان میں میر کے ساتھ جس نے دوڑنے کی کوشش کی ہے ان شعراء میں حفیظ جونپوری کا نام لیا جا سکتا ہے۔ یوں تو انھوں نے میر کی تقلید کی ہے لیکن وہ کھلے دل سے یہ اعتراف بھی کرتے ہیں۔

میر کا رنگ برتنا نہیں آسان حفیظ
اپنے دیواں سے ملا دیکھئے دیواں ان کا

مجنوں گورکھپوری حفیظ کے زبان و بیان پر تحریر فرماتے ہیں۔

"عبدالسلام ندوی نے شعر الہند میں ایک جگہ لکھا ہے کہ تلامذۂ امیر میں جو شخص داغ کا اصلی حریف خیال

(بقیہ صفحہ ۹۳ پر)

ارشاد امروہوی
ہاؤس نمبر بی ہائی لین ۲ بی اشٹر روڈ لکھنؤ

سلاستِ کلامِ میر میں بلند تخیّل کی جلوہ گری

فضائے شعر وادب میں تخلیقات ہوں۔ تقاریر ہوں یا پھر عام گفتگو کا ماحول ہو ان میں مجموعی اعتبار سے فصاحت و بلاغت، فکری گہرائی و گیرائی اور پرواز تخیل جیسے صفات جوہر تصور کیے جاتے ہیں بلکہ یہی صفات عالیہ ادبا، شعراء اور مفکرین کو دائمی مقام عطا کرتے ہیں۔ البتہ اسی کے ساتھ نثر و نظم دونوں اصناف سخن میں سلاست بیان کو بھی ایک خاص اہمیت دی جاتی ہے یعنی سلاست کے ساتھ ساتھ بلند تخیل کی جلوہ گری ان حضرات کو عوام و خواص کے درمیان حد درجہ مشہور و مقبول بنا دیتی ہے۔ اسی وصف خصوصی کی بنا پر دیگر شعراء مثلاً مرزا مظہر جان جاناں۔ حاتم، خواجہ میر درد، مرزا محمد رفیع سودا، غلام حسن حسن۔ سید انشاء اللہ خاں انشاء، مرزا اسد اللہ خاں غالب، حکیم مومن خاں مومن، شیخ ابراہیم ذوق، بہادر شاہ ظفر، شیخ امام بخش ناسخ، خواجہ حیدر علی آتش، نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ، میر انیس، امیر مینائی خواجہ الطاف حسین حالی اور داغ دہلوی جیسے اساتذہ کے درمیان میر تقی میر میر کارواں کی حیثیت سے نظر آتے ہیں۔ بلکہ ایک شعر میں میر خود فرماتے ہیں۔

شعر میرے ہیں سب خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

پھر اسی وصف خصوصی کے زیر اثر ایک دوسرے شعر میں کہتے ہیں وہ بھی دعوے کی شکل میں۔

جانے کا نہیں شور سخن کا مرے ہرگز
تا حشر جہاں میں مرا دیوان رہے گا

اس طرح میر تقی میر نے جملہ اصناف سخن پر نہایت فکر انگیز طبع آزمائی کی ہے یعنی انھوں نے قصے بھی کہے، رباعیاں بھی، مسدس بھی، قصائد بھی اور مثنویاں بھی جن میں موضوعات سے مربوط، حد درجہ وسیع اور مفہوم خیز اشعار باصرہ نواز ہوتے ہیں جن کے مطالعہ کے درمیان ان کی سادگیٔ بیان کے ساتھ بلند تخیل کی جلوہ گری جگہ جگہ دعوت فکر و تدبیر دیتی ہے ساتھ ہی ان کے کلام کا رنگ و آہنگ، الفاظ کے تصرف کی تراکیب، لفظوں کی ذو معنویت، مقامی مروجہ زبان کی رنگا رنگی اور برمحل محاوروں کی نگینہ کاری جیسے صفات ان کے بنیادی مزاج یعنی غزل گوئی کو واضح کرتے ہیں جس کی اصل وجہ ان کی زندگی کی شکستہ حالی کے پیدا کردہ درد و کرب، عشق و محبت اور واردات قلب و جگر کی کار فرمائیاں ان کے کلام کے جوہر بن گئے۔ اس طرح اگر ان کے کلام کی فضا کا بغور جائزہ لیا جائے تو محسوس ہوگا کہ میر نہ صرف اردو زبان کے ایک اہم ترین محض شاعر نہیں بلکہ وہ پہلے اردو زبان کے شاعر ہیں جن کی شاعرانہ عظمت و حیثیت کو ان کے اپنے عہد میں ہی تسلیم کر لیا گیا تھا اور آج تین سو سال گذر جانے کے بعد بھی ان کا کلام اسی آب و تاب کے ساتھ ان کو ممتاز مقام عطا کئے ہوئے ہے اور بقول انھیں کے حشر تک کئے رہے گا۔ کیونکہ آج کی ادبی نسل بھی اپنے ادبی سرمائے اور شخصیتوں پر اپنی فکری بصیرت و بیداری کے ساتھ ان پر مزید تحقیق و تلاش کی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہے جس کے نتیجہ میں ان کے مضامین اور مقالات منظر عام پر آ رہے ہیں یعنی نئی نسل کے ناقدین میر کے محاسن شعری پر مختلف انداز سے روشنی ڈال رہے ہیں۔ عہد وسطیٰ میں بھی دراز قامت ناقدین مثلاً مجنوں گورکھپوری، آل احمد سرور، احتشام حسین، اعجاز حسین، علی سردار جعفری، عبادت بریلوی، پروفیسر اکبر حیدری، پروفیسر گوپی چند نارنگ شمس الرحمٰن فاروقی، ظ انصاری، شارب ردولوی وغیرہ نے جیسے

تلاش میر کے لئے خود کو وقف کر دیا ہو ادھر تازہ ترین ڈاکٹر ریشماں پروین کا تحقیقی مقالہ - میر تنقید تذکروں سے عصر حاضر تک ۔ کتابی شکل میں منظر عام پر آیا ہے جس میں میر کی ہمہ جہت شخصیت اور شاعر کا مکمل تجزیاتی و تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے. ساتھ ہی ماضی سے عہد حاضر تک کے کل ناقدین کے افکار و نظریات اس میں تفصیل اور مکمل حوالوں کے ساتھ قلم بند کئے گئے ہیں جس کی بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ ہر تخلیق نو جوہ ادبی قارئین اور مزید کام کرنے والوں کے لئے ایک دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے.

جہاں تک میر کے سلاست کلام اور بلند تخیل کا تعلق ہے ان کا یہ امتیاز خصوصی ہمہ گیر طور پر تسلیم کیا گیا ہے جس کے زیر اثر ہند و پاک کے مفکرین شعر و ادب نے اتنا معلوماتی سرمایہ مہیا کیا ہے جس کا احاطہ کرنا اس تاثراتی مضمون میں ممکن نہیں ہے. یہی سبب ہے کہ میر کی شعری فضا نے عوام و خواص کو مجموعی طور پر متاثر و متحیر کیا ہے یہاں تک کہ مرزا غالب جیسے عظیم شاعر تک کہہ اٹھے ہیں.

ریختہ کے تم ہی استاد نہیں ہو غالب
سنتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

میر کی دراقاتی اور عظمت شعری سے متعلق مشہور و معروف محقق پروفیسر اکبر حیدری ماہنامہ نقوش لاہور کے میر تقی میر نمبر کے مقدمہ میں ایک مقام پر تحریر کرتے ہیں.

,, میر کی شخصیت اور ان کے فن پر مختلف پہلوؤں کو سامنے رکھ کر اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ ان کے متعلق کوئی نئی بات کہنی دشوار ہے سوائے اس کے کہ چبائے ہوئے نوالے پھر چبائے جائیں اور جو کچھ سوچ و وچار مختلف ناقدین ادب نے اب تک تحریر کیا ہو اس کے نتائج الفاظ بدل کر اپنے اسلوب میں پیش کر دئے جائیں ان الفاظ کا اظہار پروفیسر اکبر حیدری کی محققانہ دیانت داری کو واضح کرتا ہے اگر بہ نظر تحقیق و تلاش اور حصول معلومات کے نظریہ کے طور پر غور کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اردو کے جن معماروں کی فہرست ملتی ہے اس میں میر سر فہرست نظر آتے ہیں اس لئے نہیں کہ میر نے زبان کی تشکیل و ترقی کے سلسلہ میں ان کی خدمات اپنے ہم عصروں میں نمایاں ہیں بلکہ اس لئے کہ انھوں نے اپنی شاعری کے لئے جو لہجہ اور اسلوب اختیار کیا اس نے انھیں دنیائے شعر و ادب کے بڑے بڑے فنکاروں کی صف اول میں شامل کر دیا اور ان کی تخلیقات اردو شاعری کی آبرو تصور کی گئیں. اب ہم متذکرہ نظریات و افکار کے پس منظر کے ساتھ میر کے سلاست کلام میں بلند تخیل کی جلوہ گری سے متعلق اظہار خیال کرنے کی جسارت ان کے کچھ کلام کی روشنی میں کر رہے ہیں جس کو ہر مکتبۂ فکر کے افراد نے دل سے تسلیم کیا ہے.

دراصل کسی بھی شاعر ادیب اور فنکار کے احساس کی شخصیت پر اسکی اپنی زندگی اور گرد و پیش کے کردار و واقعات نیز ماحول کا گہرا اثر پڑتا ہے جو بالعموم اسکی تخلیقات میں رونما ہوتا رہتا ہے. دوسرے لفظوں میں شاعر و ادیب کے احساس درد دیگراں کے ساتھ اس کا اپنا درد و کرب اور نظریاتی سرگرمیاں بھی اس کے اشعار سے ابھرتی رہتی ہیں. یہی وجہ ہے کہ میر کی زندگی کے نشیب و فراز، تلخی حیات زبوں حالی، احساسات کی شکستگی، جذبات کی جراحت، عشق و محبت کی ناکامی، زمانے کی بے دردیاں، لوگوں کے نازیبا سلوک اور مقربین کی سرد مہریاں میر کے کلام میں اترتی گئیں بلکہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ میر اپنے کلام میں درد و کرب کے تجربے کراں بنے نظر آتے ہیں اور جگہ جگہ تلخی زیست اجاگر ہوتی ہے. اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انسان اظہار غم جہات میں کسی اہتمام اور مرصع الفاظ کا سہارا نہیں لیتا بلکہ جو کچھ اس پر گزرتی ہے سادہ الفاظ میں بیان کرتا ہے البتہ لب و لہجہ ضرور کرب زدہ ہوتا ہے بقول فیض احمد فیض.

ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گذرتی ہے رقم کرتے رہیں گے

فیض کے اسی تخیل کی گونج میر کے اپنے کلام میں دلی کیفیات کی بھرپور عکاسی کے ساتھ نظر آتی ہے جس کو وہ بھی روزمرہ کی زبان میں پیش کرتے ہیں البتہ ان کے کلام میں سلاست کے وصف خصوصی کے ساتھ تخیل کی بلند پرواز، فکری گہرائی و گیرائی، عمیق مشاہدات کی عکاسی اور عصری مسائل کی نشاندہی وغیرہ نے ان کے کلام کو زبردست وقعت عطا کی ہے. کلام کی پاکیزگی اور شرافت نفسی

ان کے اپنے بزرگوں سے ورثے میں ملی تھی۔ میرؔ کے والد کے انتقال کے
بعد ان کے صاحب بزرگ سید امان اللہ کی نگرانی میں ان کی پرورش
ہوئی۔ جو ان کے والد کے مرید تھے اور جنھیں میرؔ صاحب نے اپنی
کتاب ذکر میرؔ میں جگہ جگہ عم بزرگوار لکھا ہے۔ میرؔ صاحب کی یہ فطرت
کی بلندی تھی کہ پیہم ناسازگار حالات کے باوجود انھوں نے زندگی سے
بیزاری اور دنیا سے بغاوت کے جذبات کو پنپنے نہیں دیا اور نہ ہی
کبھی فرار اختیار کرنے کی سعی کی جبکہ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ بدبختی اور
حالات کی شکستگی کی بنا پر پختہ سے پختہ فکر اور مضبوط کردار رکھنے والے
حضرات دل برداشتہ ہو کر بھڑک اٹھتے ہیں اور معاشرہ سے انتقام
لینے پر آمادہ ہو جاتے ہیں مگر میرؔ صاحب کسی قسم کے قصاص کے
بجائے اپنے کلام کی وادیوں میں اظہار جذبات و احساسات کرتے ملتے
ہیں۔ انھیں حالات کے زیر اثر انھوں نے زمانۂ طفلی ہی میں اشعار
کہنا شروع کر دیئے تھے جیسا کہ وہ خود رقم طراز ہیں۔

"میری جعفر نامی ایک شخص سے اتفاقاً ملاقات ہوئی اور انھوں
نے بڑی عنایت سوزی سے مجھے پڑھانا شروع کیا۔ اچانک ایک روز
ان کے وطن عظیم آباد سے خط آیا اور وہ ادھر چلے گئے۔ کچھ دن بعد
سعادت علی جو امروہہ کے سید تھے ان سے ملاقات ہو گئی انھوں
نے مجھے ریختہ میں شعر موزوں کرنے کی ترغیب دی میں نے جان
توڑ کر محنت کی اور ایسی مشق بہم پہونچائی کہ میں شہر کے موزوں لوگوں
میں مستند سمجھا جانے لگا اور میرے شعر شہر میں مشہور ہونے لگے اور
چھوٹے بڑے شوق سے پڑھتے تھے۔ اس طرح متذکرہ مجموعی قسم
کے حالات کی واضح تصاویر ان کے کلام میں پیوست ہیں جن کو ان کے
اشعار کی سلاست و نفاست عام ذہنوں کو بحسن و خوبی متاثر کرتی
ہے۔ چند مختلف غزلوں کے اشعار بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں۔

دیکھ تو دل کہ جاں سے اٹھتا ہے
یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے
سدھ لے گھر کی بھی شعلہ آواز
دود کچھ آشیاں سے اٹھتا ہے

متذکرہ بالا اشعار میں سادگی بیان کے ساتھ ناکامیِ عشق کے
پروردہ درد و کرب کا اظہار کس اثر انگیزی کے ساتھ سادہ زبان میں
ملتا ہے جس کے ایک لفظ کے بھی معنی تلاش کرنے کی قاری کو ضرورت
محسوس نہیں ہو سکتی۔ ایک دوسری غزل کے اشعار میں بھی وہی
سادہ اسلوب اور رنگ و آہنگ نظر آتا ہے ملاحظہ ہو۔

شورشِ دل سے مفت میں جلتے ہیں
داغ جیسے چراغ جلتے ہیں
اس طرح دل گیا کہ اب تک ہم
بیٹھے روتے ہیں ہاتھ ملتے ہیں
بھری آتی ہیں آج یوں آنکھیں
جیسے دریا کہیں ابلتے ہیں

مذکورہ بالا غزل بھی ایک عاشق جاں سوز کی کیفیات کی بھرپور
ترجمان ہے۔ وہ سادہ اور سلیس زبان میں نہایت اثر انگیزی لئے
ہوئے ہے جس سے ایک عام انسان بھی واردات قلب و جگر کو بخوبی
محسوس کرتے ہوئے لطف اندوز ہو سکتا ہے ایک اور غزل میں
نئے رنگ و آہنگ کی گونج سنائی دیتی ہے جس میں بطور خاص ایک
عاشق نامراد کی مجبوریاں اور محرومیاں سنائی دیتی ہیں۔

دکھ اب فراق کا ہم سے سہا نہیں جاتا
اور اس پہ ظلم یہ ہے کہ کچھ کہا نہیں جاتا
ہوتی ہے اتنی تری عکس زلف حیراں
کہ موج بحر سے مطلق بہا نہیں جاتا
ستم کچھ آج گئی ہیں تری نہیں مجھ پر
کب آئے خوں اس جاں میں کہا نہیں جاتا
نہیں گزرتی گھڑی مجھ خراب پر آہ
کہ جس میں غم سے ترے جی ڈہا نہیں جاتا
خراب ہم کو کیا اضطرابِ دل نے میرؔ
کہ ٹک اس لئے اس بن اب رہا نہیں جاتا

اسی طرح سلیس زبان و بیان سے مرصع، بلند تخیل کی عکاس
ایک اور غزل میں ملاحظہ ہو جس میں زندگی کی بے ثباتی بالخصوص

عہد جوانی کے رنگین تصورات ؟ اور مختصر وقفہ نیز نالہ ہائے عاشق کو نہایت اثر انگیز سادہ الفاظ میں پیش کیا ہے۔

دل و دماغ اب کس کو زندگانی کا
جو کوئی دم ہے سو افسوس ہے جوانی کا
اگرچہ عمر کے دس دن یہ لب رہے خاموش
سخن رہے گا سدا میری کم زبانی کا
ہزار جان سے قربان بے پری کے ہیں
خیال بھی کبھو گزرا نہ پرفشانی کا
پھرے ہے کھینچے ہی تلوار مجھ پہ ہر دم
شہید ہوں میں تری دشمنیٔ جانی کا

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ میر کے کلام میں بالعموم اسی سلاست زبان و بیان کے ساتھ پختہ فکر و نظریات اور بلند تخیل کی جلوہ گری ہے ہر غزل مرصع نظر آتی ہے جس کے پڑھنے کے بعد قاری پر ایک وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے بلکہ غزل کی غنائیت اور کشش الفاظ اس کے دل میں دائمی نقش قائم کر دیتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ میر کی بیشتر غزلوں کے اشعار عوام و خواص کے زبانوں پر رواں رہتے ہیں بالخصوص محبت کرنے والے نوجوان ان کے اشعار کو اظہار عشق کا وسیلہ بناتے ہیں جن کو سن کر ان کی محبوبائیں نہ صرف چاہنے والے کے احساسات کا یقین کرتی ہیں بلکہ ان اشعار کے دلکش مفہوم میں غوطے لگانے لگتی ہیں۔ انھیں بیان کردہ صفات عالیہ سے متاثر ہو کر مسعود حسن رضوی نے ایک مقام پر کہا ہے۔

"میر کی شاعری کو بخوبی سمجھنا ہو تو میر کو سمجھئے اور میر کو سمجھنا ہو تو ذکر میر اور فیض میر کو سمجھئے"۔ اسی طرح آل احمد سرور ایک مقام پر یہ لکھتے ہیں۔

"میر کی شاعری اس لئے بھی ہماری بہت بڑی دولت ہے کہ ان کے یہاں ہمارے تینوں تہذیبی ادارے بازار خانقاہ اور دربار اسی طرح ملے جلے نظر آتے ہیں کہ اس دور کی تمام سماجی حقیقتیں اس نگار خانے میں جلوہ ہو جاتی ہیں"۔

ظ انصاری تو ایک ہی جملے میں اپنی دلی کیفیات اور تاثر حقیقی کو یوں پیش کرتے ہیں۔

"بس میر وہ فنکار ہے جو صدیوں اور نسلوں کے اس ہمارے سرمائے کا امانت دار ہے۔ میر ایک شخص یا شاعر نہیں پورا ایک کلچر نظر آتا ہے"۔

کچھ اسی انداز سے اثر لکھنوی بھی میر کی شعری فضا سے اس درجہ متاثر ہوئے تھے کہ انھیں کے مکمل رنگ و آہنگ میں اشعار کہتے رہے بلکہ کلام میر کی آئینہ سازی کا مکمل رخ اختیار کرتے رہے خود میر بھی اپنے ایک شعر میں اپنی شعری دائمی حیات کا دعویٰ کرتے نظر آتے ہیں۔

جانے کا نہیں شور سخن کا مرے ہرگز : تا حشر جہاں میں مرا دیوان رہے گا ●

رنگ میر اور حفیظ جونپوری (صفحہ ۸۹ کا بقیہ)

کیا جاتا ہے وہ حضرت ریاض خیرآبادی ہیں۔ یہ خیال صحیح ہے مگر صرف ایک حد تک۔ امیر کے جس شاگرد کے کلام میں داغ کا اصلی رنگ آپ سے آپ جھلک اٹھتا ہے وہ حفیظ جونپوری ہیں"۔

(نکات مجنوں ص ۱۷۲)

اس ضمن میں مولانا عبدالسلام ندوی کا یہ حقیقی بیان ملاحظہ فرمائیں۔

"ان (حفیظ) کا کلام گلہائے رنگا رنگ کا عجیب و غریب گلدستہ ہے"۔ (شعرالہند ص ۳۵۱)

اس بیان کی تائید خود حفیظ کے اس شعر سے ہو جاتی ہے۔

شعر ہر رنگ میں کہتا ہے ترا کام حفیظ
آج ہم مان گئے، مان گئے، مان گئے

حفیظ کی غزل گوئی پر ڈاکٹر فضل امام رضوی تحریر کرتے ہیں۔

"حفیظ کی شاعری کی روح غزل میں مضمر ہے اور یہی ان کی حیات کی ضامن ہے"۔

(ماہنامہ آجکل، نئی دہلی اکتوبر ۱۹۷۱ ص ۴۰)

اس لئے حفیظ کا یہ دعویٰ بھی بجا ہے۔

جو ناشناس سخن ہیں کچھ ان سے کام نہیں
غزل حفیظ کی تحفہ ہے قدرداں کے لئے

◇

ڈاکٹر ریحان حسن
۲۸/۲۲۷ بنجاری ٹولہ، وکٹوریہ اسٹریٹ، لکھنؤ۔۳

میر اور انسان دوستی

انسانوں کی فلاح وبقا کے لئے آدمی میں انسانیت کا عنصر ناگزیر ہے جس شاعری میں جتنی زیادہ انسانیت پائی جائے گی اس کی شاعری میں اسی قدر کیفیت ہوگی۔ گویا آفاقی شاعری کے لئے انسانیت جزو لاینفک ہے کیونکہ انسانیت ہی کے بدولت انسان میں ہمدردی رواداری، اخوت اور بھائی چارگی، اتحاد و یگانگت اور بقائے باہم کا جذبہ بیدار ہوتا ہے اور انسانیت کے تئیں ہی جذبات ہمیں میر تقی میر کی شاعری میں بدرجۂ اتم نظر آتے ہیں۔ انھیں مخلوق خدا سے والہانہ شیفتگی و محبت تھی۔ اسی لئے انھوں نے اپنی شاعری کے حوالے سے انسانیت کے جذبات بیدار کرنے کی حتی الامکان کوشش کی۔

حالانکہ میر تقی میر ایک ایسے زمانے میں شاعری کر رہے تھے جب رواداری اور یگانگت ہماری ملی جلی تہذیب کے نمائندہ عناصر تھے۔ اس وقت آج کی طرح فرقہ پروری اور مذہبی منافرت معاشرے میں موجود نہیں تھی سارے مذاہب اور مسلکوں کا یکساں احترام کیا جاتا تھا چنانچہ اس عہد میں قومی یک جہتی اور انسانیت دوستی کے فروغ یا تبلیغ کی ضرورت نہیں تھی۔ اپنے مفادات کے حصول کے لئے ارباب سیاست کے ذریعہ پھیلائی ہوئی قومی اور مذہبی منافرت نے آج ہمیں مجبور کیا ہے کہ ہم ایسے ادب کی بھی بالارادہ تخلیق کریں جو ہمیں یگانگت، انسان دوستی اور یک جہتی کی تعلیم دے کیونکہ فی زمانہ آج اس کی اشد ضرورت ہے لیکن میر کے عہد میں ہم آہنگی اور یگانگت کے جذبے فطری طور پر ہماری شاعری میں موجود تھے چنانچہ میر کے یہاں ہمیں ایسے اشعار ملتے ہیں جو ہندوستان میں بسنے والی دو بڑی قوموں کے ذہنی قرب کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اس طرح وہ ہمیں انسانیت کی بھرپور تعلیم دیتے ہوئے نظر آتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ میر تقی میر نے سید امان اللہ اور بایزید جیسے درویشوں کی صحبتوں سے فیض اٹھایا اور ان کی سیرت اور شخصیت سے اس قدر متاثر ہوئے کہ ان کی طبیعت تصوف کی جانب مائل ہوگئی اور ظاہر ہے کہ تصوف ایک ایسا جذبہ ہے جو ملک و ملت، رنگ و نسل اور مذہبی قیود سے بلند ہوتا ہے چنانچہ انھیں انسانیت سے بے پناہ لگاؤ تھا اسی لئے ان کی شاعری میں جابجا تصوف کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ اور ایسا کیوں کر نہ ہوتا اس لئے کہ میر جس خاندان سے تعلق رکھتے تھے اس خاندانی عظمت و وجاہت کا بھی یہی تقاضہ تھا۔ ظاہر ہے صوفیائے کرام کی تبلیغ کا سب سے اہم مقصد اقوام کے درمیان سے تعصب و تنگ نظری کا خاتمہ اور لوگوں کے درمیان اتحاد واتفاق پیدا کرنا تھا جو انسان دوستی کا ناگزیر عنصر ہے چنانچہ جب میر تقی میر بایزید جیسے درویش صفت شخصیت کے پاس پہونچے تو انھوں نے بھی میر تقی میر کو یہی تلقین کی، "زنہار کہ دل شکنی کسے نہ کنی و سنگ ستم بر شیشہ نہ زنی۔ دل را کہ عرش می گویند ازیں راہ است کہ منزل خاص آں ماہ است" (میر تقی میر حیات اور شاعری، ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی صفحہ ۶۵، اشاعت اول جولائی ۱۹۵۴ء و مطبوعہ۔ انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ)

یعنی ہرگز کسی کی دل شکنی نہ کرو اور ظلم کا پتھر کسی آئینہ پر نہ مارو۔ (ناحق کسی کے دل کو نہ دکھاؤ) دل جس کو عرش بھی کہتے ہیں کہ یہی معشوق کی خاص منزل ہے (اسی سے لوگوں کے سر جھکتے ہیں)

بایزید کے اس جملے کا میر تقی میر کی زندگی پر اس قدر گہرا اثر مرتب ہوا کہ انھوں نے تاحیات اس بات کی سعی کی کہ ان سے کسی ذات کو نقصان نہ پہونچے اور کسی کی دل آزاری و دل شکنی نہ ہو۔ چنانچہ جب ہم میر کے کلام کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ میر تقی میر

ان شعراء میں ہیں جنھوں نے مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان اتحاد و اتفاق اور بقائے باہم انسان دوستی اور قومی یک جہتی کی ضرورت پر زور دیا ہے اور لوگوں کو یہ نصیحت کی ہے کہ انسان کو دیر و حرم کی قیدسے آزاد ہو کر لوگوں کے قلوب میں راہ پیدا کرنے کی کوشش کرنا چاہئے کیونکہ یہی وہ عمل ہے جو خدا کے نزدیک بھی سب سے زیادہ مستحسن ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

کعبہ پہونچا تو کیا ہوا اے شیخ
سعی کر ٹک پہونچ کسی دل تک

میر کعبہ میں ظاہر داری اور تنگ نظری کے ساتھ جانے سے یہ بہتر سمجھتے ہیں کہ کسی کے دل میں جگہ بنائی جائے۔

کعبہ جانے سے نہیں کچھ مجھ کو اتنا شوق ہے
چال وہ بتلا کہ میں دل میں کسو کہ جا کروں

یعنی میر کے نزدیک مذہب کی ظاہری عبادت ناکافی ہے کیونکہ مذہب کی روح حق آگاہی ہے اور حق آگاہی کے لئے دل کو ٹٹولنے کے ساتھ دوسروں کے قلوب کی تکالیف کا مداوا بھی ضروری ہے خواہ وہ کسی مذہب و مسلک سے تعلق رکھنے والے ہوں۔ مسلک و مذہب سے پرے ہو کر دلوں کے درد کو سمجھنا اس لئے ضروری ہے کہ اصل عبادت مخلوق کے دلوں کے زخموں پر مرہم رکھنا ہے۔ کیونکہ مذہب کی اصل روح رحم ہے جیسا کہ میر نے کہا ہے۔

دل بے رحم گیا شیخ لئے زیر زمیں
مر گیا میر یہ کہن گبر مسلماں نہ ہوا

میر تقی میر کا یہ شعر ایسا آفاقی ہے جس میں اس دور کے حالات کی بھی عکاسی نظر آ رہی ہے اور جس کا نمونہ دنیا میں پھیلی ہوئی دہشت گردی ہے۔ آج مذہب کے نام پر بے گناہ انسانوں کا خون بہایا جا رہا ہے اور اسے جہاد کا نام دے کر اپنے کو سچا مذہبی گردانا جا رہا ہے جبکہ ظاہر داری کا پیرو کتنا ہی بڑا اپنے کو دیندار سمجھے وہ ہرگز دیندار نہیں قرار دیا جا سکتا۔

میر دراصل ظاہری مذہب پرستی کے کٹر مخالف تھے اسی لئے انھوں نے یہ کہا ہے۔

ہم نہ کہتے تھے کہ مت دیر و حرم کی راہ چل
اب یہ دعویٰ حشر تک شیخ و برہمن میں رہا

اگر میر کی بتائی ہوئی راہ پر انسان گامزن رہتا تو آج شیخ و برہمن یعنی ظاہر داروں میں جو کبھی نہ ختم ہونے والا بحث کا سلسلہ قائم ہو گیا ہے وہ کبھی کا ختم ہو جاتا۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دراصل شیخ و برہمن ہی نے مذہب کی شکل اس قدر بگاڑ رکھی ہے کہ کفر اور دین دونوں ہی سے انسان گمراہ ہو رہا ہے میر نے سچ کہا ہے۔

شرکت شیخ و برہمن سے میر
کعبۂ و دیر سے بھی جائیے گا

میر شیخ و برہمن سے بالکل مایوس بھی نہیں البتہ ان کی بے عملی اور بے فکری سے مضطرب ضرور ہیں کیونکہ انھوں نے متحد ہو کر کام کرنے کے بجائے عصبیت کی ایسی مضبوط دیواریں کھڑی کر لی ہیں کہ جن کا منہدم ہونا مشکل ہے لہٰذا فی الوقت ضرورت اس بات کی ہے کہ باہم رواداری اور اتحاد و اتفاق سے کام لیا جائے کیونکہ اسلام کی اصل روح دلوں کو جوڑنا ہے توڑنا نہیں اور اگر کسی شخص کے دل کو توڑ کر انسان خواہ کعبہ ہی بنا ڈالے تو اس شخص کو اسلام کا سچا اور حقیقی پیرو نہیں کہا جا سکتا اور یہی میر کا بھی خیال ہے۔

مت رنجہ کر کسی کو کہ اپنے تو اعتقاد
دل ڈھائے کر جو کعبہ بنایا تو کیا ہوا

دراصل میر ان لوگوں میں سے تھے جو قشقہ لگانے والے کو بھی اتنا ہی عزیز رکھتے تھے کہ جتنا اہل اسلام کو چنانچہ انھوں نے کہا بھی ہے۔

اس برہمن پسر کے قشقے پہ مرتے ہیں ہم
ٹک دے گا رو تو گویا جی ہم کو دان دے گا

میر تقی میر کی نظر میں سچا مذہبی وہی ہے جس میں انسانیت ہے کیونکہ مذہب نے انسانیت کے اصولوں کی بقا و تحفظ پر سب سے زیادہ زور دیا ہے۔ اسی لئے ان کی شاعری میں بھی دیر و حرم سے زیادہ ہمیں میکدہ کا استعارہ نظر آتا ہے کیونکہ میکدہ ایسی جگہ ہے کہ جہاں مذہب کی بنیاد پر انسان اور انسان میں تفریق نہیں ہوتی شعر ملاحظہ کیجئے۔

میر کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو ان نے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

میر کے نزدیک محبت کرنے کے لئے مذہب و ملت کی کوئی قید نہیں ہے کیونکہ مذہب عشق وہ ہے جس میں کفر اور دین میں امتیاز ختم ہو جاتا ہے۔

سخت کافر تھا جن نے پہلے میر
مذہب عشق اختیار کیا

یعنی اصل چیز انسانیت ہے جس کی جانب کفر اور دین دونوں اشارہ کرتے ہیں لیکن ظاہر پرستوں کی نظر میں ان کے اصول کے خلاف چلنے والا بے دین قرار دیا جاتا ہے چنانچہ میر کا یہ کہنا ہے کہ مذہب عشق اختیار کرنے والا بے دین نہیں کیونکہ مذہب عشق وہ مذہب ہے کہ جس میں کفر اور دین دونوں میں امتیاز نہیں ہے۔

اسی لئے میر نے ظاہری مذہب کی تبلیغ کرنے والوں کو قطعاً ناپسند کیا اور انھوں نے واشگاف لفظوں میں اپنا مطمح نظر بیان کر دیا کہ اگر ظاہری مذہب کی تبلیغ کی جائے تو اس سے وہ مذہب زیادہ بہتر ہے کہ جو تیری نظر میں کفر قرار دیا جاتا ہے۔

مجھے زنہار خوش آتا نہیں کعبے کا ہمسایہ
صنم خانہ ہی یاں اے شیخ تو نے کیوں نہ بنوایا

کیونکہ ایک برہمن اگر حق آشنا ہے تو بت میں بھی حق کا جلوہ دیکھ سکتا ہے اور اگر شیخ کا تصور صرف مذہب کی ظاہرداری تک ہے تو وہ کعبہ نشین ہونے کے بعد بھی حق آگاہ نہیں ہو سکتا۔

اللہ کے محرم ہونے کے لئے کفر اور دین کی قید ضروری نہیں ہے اور یہ خیال ہمیں میر کے اکثر اشعار میں نظر آتا ہے۔

ہر گام سد رہ تھی بت خانے کی محبت
کعبے تلک تو پہونچے لیکن خدا خدا کر

میر نے مذاہب کی یک جہتی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ تمام مذاہب کی روح ایک ہی ہے چنانچہ اسلام اور کفر میں بھی اتنی قربت ہے کہ ظاہری اسلام قبول کرنے کے لئے ظاہری کفر کو چھوڑنا آسان نہیں ہوتا۔ دراصل کفر اور دین اردو شاعری کے بڑے Symbol ہیں چنانچہ میر نے اپنے بیشتر اشعار میں کعبہ اور بت خانہ کو بطور Symbol استعمال کیا ہے۔ وہ ایک جگہ پر کچھ اس طرح گویا ہیں۔

ہیں دیر و کعبے سے کیا گفتگو ہے
چلی جاتی ہیں یہ سیانے کی باتیں

بلا شبہ عام انسان مذہبی مناقشوں میں نہیں پڑنا چاہتا دراصل اس جھگڑے میں ایسے لوگ دلچسپی لیتے ہیں جن کا تعلق سیاست سے ہے کیونکہ ارباب سیاست مذاہب کے جھگڑوں کے ذریعہ اپنے ذاتی مقاصد کو حاصل کرنا چاہتے ہیں جبکہ اسلام اور کفر میں اس قدر گہرا تعلق ہے کہ ان کو ایک دوسرے کے سامنے رکھے بغیر سمجھا نہیں جا سکتا اور یہی خیال میر کا بھی تھا چنانچہ انھوں نے برملا کہا۔

ایسی گلی اک شہر میں اسلام نہیں رکھتا
جس کوچے میں وہ بت صد بدنام نہیں رکھتا

صداقت تو یہ ہے کہ اگر مذہبوں میں اتفاق ہو تو ایک مذہب دوسرے مذہب کے لئے رونق کا باعث ہوتا ہے جیسا کہ میر نے کہا ہے۔

کفر کچھ چاہئے اسلام کی رونق کے لئے
حسن زنار ہے تسبیح سلیمانی کا

میر تقی میر نے تسبیح کے تاگے کو زنار کہہ کر گویا تسبیح اور زنار میں جو یک جہتی ہے وہ بتائی ہے جبکہ زنار ہندوؤں کا سمبل ہے اور تسبیح مسلمانوں کا۔ لیکن دونوں اس طرح ملے ہیں کہ ان کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔

میر کے خیال میں اسلام کے کوچے میں ہر ہر قدم پر بت ملیں گے اور یہ بت پتھر کے نہیں بلکہ خیالات کے ہیں اور میر تو ایسے لوگوں میں تھے جو بتکدے میں بھی جانے سے گریز نہ کرتے تھے کیوں کہ ان کو بتوں میں بھی حق کا جلوہ نظر آتا تھا جیسا کہ انھوں نے کہا بھی ہے۔

اب تو جاتے ہیں بت کدے سے میر
پھر ملیں گے اگر خدا لایا

اس شعر میں "اگر خدا لایا" کلیدی جملہ ہے جس کے ذریعہ میر نے محبت و اخوت اور انسانیت کا ایسا جذبہ پیش کیا ہے جو

رہتی دنیا تک بنی نوع انسان کے لئے پیغام کی شکل میں باقی رہے گا۔

میر نے ہندوستان میں بسنے والی قوموں کے مابین اختلافات سے گریز کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے یہ تلقین کی کہ وطن سے محبت کرو کیونکہ جب وطن پرستی کا جذبہ بیدار ہوجائے گا تو اختلافات مذاہب خود بخود معدوم ہوجائیں گے۔

کس کو کہتے ہیں نہیں میں جانتا اسلام و کفر
دیر ہو یا کعبہ مطلب مجھ کو تیرے در سے ہے

میر کے اس شعر سے ظاہر ہے کہ وہ جب وطن کے جذبے سے سرشار تھے۔ وہ محض ہندوستان کی ترقی اور سربلندی کے خواہاں تھے خواہ یہ ترقی ہندوؤں کے ذریعہ حاصل ہو یا مسلمانوں کے ذریعہ انھیں مذہب و مسلک سے کوئی غرض نہ تھی اور ظاہر سی بات ہے کہ جب ملک کی ترقی مطمع نظر ہوگی تو باہمی رواداری کے ساتھ یہ خیال بھی رہے گا کہ یہ ملک سبھی کا ہے اور سبھی نے مل جل کر ملک کی تعمیر و ترقی اور تہذیبی نشوونما میں حصہ لیا ہے اور یہ احساس جس قدر زیادہ ہوگا قومی یک جہتی کی بنیادیں اسی قدر مستحکم ہوں گی لیکن اگر جنس اور نوع کے چکر میں پڑے تو وہیں اختلافات پیدا ہونا شروع ہو جائیں گے۔

ہم نہ کہتے تھے کہیں زلف کہیں رخ نہ دکھا
اختلاف آیا نہ ہندو و مسلمان کے بیچ

یعنی اگر محبوب کو بحیثیت محبوب دیکھا جاتا تو اس کے چاہنے والوں میں اختلاف پیدا نہیں ہو سکتا لیکن جب اس کے جسم کے مختلف حصوں کا ذکر کر دیا گیا تو اختلافات پیدا ہونا شروع ہو گئے لہٰذا اس اختلاف کو دور کرنے کے لئے محبوب کے رخ اور زلف کے ذکر کے بجائے خود اس سے محبت کا اظہار کیا جائے۔ اس طرح میر نے یہ پیغام دیا ہے کہ وطن کی محبت کے سلسلہ میں چھوٹے موٹے اختلافات کو راہ نہ دی جائے بلکہ اتحاد و اتفاق سے رہا جائے کیوں کہ امن و آشتی اور اتحاد و یگانگت ہی حق کا راستہ ہے اور اسی راستے پر چل کر ایک حقیقت شناس کو جلوۂ حق نظر آتا ہے۔

گو کہ بت خانے جا رہا ہوں میں   بخدا با خدا رہا ہوں میں

اس طرح میر نے ہمیں یہ باور کرایا ہے کہ دیر و حرم میں کوئی فرق نہیں ہے کیونکہ کعبہ و دیر دونوں میں خدا ہی کا جلوہ نظر آتا ہے اس لئے کہ جو حقیقت شناس ہے وہ خدا کو ہر جگہ تلاش کر لیتا ہے میر کے اس شعر کے ذریعہ مذہبی یک جہتی اور انسان دوستی کی بہترین تلقین و تبلیغ کی گئی ہے۔ اس کی مثال ہمیں اس دور کے شعراء کے یہاں بہت کم نظر آتی ہے۔

یقیناً اردو کے شعری ادب میں دیگر مذاہب کے بزرگوں، تہواروں اور تقریبات کے متعلق جس قدر اشعار ملتے ہیں دیگر زبانوں میں نہیں ملتے۔ اگر غیر مسلم شعراء نے عید، شب برات اور محرم وغیرہ پر نظمیں کہی ہیں تو مسلم شعراء نے بھی کرشن، رام، نانک اور دیوالی و ہولی وغیرہ پر بے شمار نظمیں کہی ہیں چنانچہ میر کی مثنوی "در جشن ہولی و کتخدائی" کے عنوان سے ملتی ہے جس میں وہ کچھ اس انداز سے ہولی کا ذکر کرتے ہیں۔

قمقمے جو گلال کے مارے   مہوشاں لالہ رخ ہوئے سارے
خوان بھر بھر عبیر لاتے ہیں   گل کی پتی ملا اڑاتے ہیں
جشن نوروز ہند ہولی ہے   راگ رنگ اور بولی ٹھولی ہے

یہ سچ ہے کہ ہندوستان کے مقامی تہوار بھی سماجی میل جول اور باہمی رواداری کا بہترین ذریعہ ہیں کیونکہ اس سے قومی یک جہتی کے جذبہ کو فروغ ملتا ہے۔ سرزمین ہند کی تاریخ گواہ ہے کہ ہولی کی رنگینیاں صرف ہندوؤں تک محدود نہ تھیں بلکہ اس تقریب میں ہندو اور مسلمان دونوں ایسے شوق و ذوق سے شریک ہوتے تھے کہ ہندو اور مسلمان میں امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا تھا اور اس باہمی احترام کے جذبے کو بادشاہوں کی سرپرستی بھی حاصل تھی چنانچہ آصف الدولہ ہولی کے موقع پر اس والہانہ انداز سے شریک ہوتے تھے کہ میر نے بادشاہ کے اس خیر سگالی اور رواداری کے جذبے کو "ہولی" کی مثنوی میں یوں نظم کیا۔

ہولی کھیلا آصف الدولہ وزیر   رنگ صحبت سے عجب ہیں خورد و پیر
جشن نوروزی اہل ہند سب   ہے یہی تب ہو عشرت ہینگے اب

(بقیہ صفحہ ۱۲۶ پر)

ڈاکٹر محمد اطہر مسعود خاں
غوث منزل تالاب ملا ارم۔ رام پور ۲۴۴۹۰۱

اشاریہ میر تقی میر

راقم الحروف کو میر تقی میر پر متعلق قلم کاروں کے لکھے گئے مضامین کا اشاریہ ترتیب دیتے ہوئے ابھی دو چار روز ہی گذرے تھے کہ ایک بیرونی کرم فرما نے ٹیلی فون پر باتوں کے درمیان کہا کہ میر پر شمس الرحمٰن فاروقی نے جو کام کیا ہے اس کے بعد مزید تحقیق کی گنجائش نہیں رہتی لیکن میں نے ان کے خیال کی برجستہ تردید کی کہ تحقیق میں حرف آخر کوئی چیز نہیں ہوتی۔ فاروقی صاحب کی اہلیت اور قابلیت میں کسی کو کلام نہیں اور "شعر شور انگیز" کی اہمیت وافادیت سے بھی کسی کو انکار نہیں لیکن تحقیقی کاموں میں بے پناہ وسعت ہوتی ہے اس میں جتنا بھی کام کیا جائے وہ تھوڑا ہی محسوس ہوتا ہے اور اس میں ھَل مِن مَزِید کی ہمیشہ گنجائش رہتی ہے۔

کلام میر اور خود میر کے بارے میں بہت کچھ پڑھنے کے باوجود راقم الحروف کو میر پر کبھی کچھ لکھنے کا موقع نہ مل سکا تھا۔ اس لئے نیا دور کے میر نمبر کے لئے ایک مضمون لکھنے کا حکم ملا تو میں نے عام روش سے ہٹ کر ایک اہم اور منفرد کام کرنے کا فیصلہ کر لیا اور وہ یہ کہ رضا لائبریری میں رسائل کے جتنے بھی اشاریے موجود ہیں ان میں سے میر کے متعلق شائع ہوئے سبھی مضامین کا اشاریہ مرتب کر دوں۔ اشاریہ سازی کا کام عام طور پر بہت آسان لگتا ہے اور عام تعلیم یافتہ طبقہ کا بھی یہ خیال ہے کہ اشاریہ سازی نہایت سہل کام ہے لیکن اس خارزار میں کام کی دشواری، مواد کی فراہمی اور ترتیب کی پریشانی کو صرف محققین ہی آسانی سے سمجھ سکتے ہیں لیکن یہ بھی یقینی بات ہے کہ جو لوگ بحر تحقیق کے شناور ہوتے ہیں انھیں اس بحر ذخار اور دریائے ناپید کنار میں گہر ہائے آبدار ضرور ملتے ہیں جن کی تابانی اور روشنی سے بہت سے لوگ مستفید ہوتے ہیں کہ تحقیق کی اصل غرض وغایت بھی غالباً یہی ہوتی ہے۔

رام پور رضا لائبریری میں رسائل اور کتب کے اشاریوں کی تعداد ۹۸ ہے ابتدا میں راقم الحروف کا بھی خیال تھا کہ میر کے اشاریے کو رضا لائبریری کے اشاریے تک ہی محدود رکھنا کافی ہوگا لیکن جیسے جیسے کام آگے بڑھتا گیا اس بات کی ضرورت شدت سے محسوس ہوتی گئی کہ اس کام کو ادھورا چھوڑنا مناسب نہ ہوگا اس لئے میں نے ادھر ادھر سے مزید وہ اشاریے بھی حاصل کئے جو رضا لائبریری میں موجود نہیں تھے لیکن سبھی اشاریوں کا باریکی سے مطالعہ کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ رسائل کے ہر اشاریے میں میر سے متعلق مضامین موجود نہیں ہیں لہٰذا پیش نظر اشاریہ میں صرف ان اشاریوں کے نام اور حوالے دئے گئے ہیں جن میں میر سے متعلق کوئی ایک بھی مضمون موجود ہے۔ لہٰذا پیش نظر اشاریے میں صرف ان اشاریوں کے نام اور حوالے دئے گئے ہیں جن میں میر سے متعلق کوئی ایک بھی مضمون موجود ہے یا میر کی شاعری سے متعلق کسی ایک کتاب پر بھی تبصرہ شامل اشاریہ ہے میر کا اشاریہ ترتیب دینے کے لئے میں نے سبھی اشاریوں میں شائع ہوئے ایک لاکھ سے زیادہ مضامین کے عنوانات کا مطالعہ کیا۔ ہو سکتا ہے کسی کو ایک لاکھ مضامین کے تعلق سے کہی گئی بات میں کچھ مبالغہ آمیزی محسوس ہوتی ہو لیکن راقم کو ایک لاکھ مضامین کی تعداد اس لئے زیادہ نہیں لگی کہ صرف نیا دور میں ہی مضامین کی تعداد چار ہزار، آجکل میں پانچ ہزار، معارف میں دس ہزار اشاریہ تنقید میں ساڑھے پانچ ہزار ہے اور دوسرے رسائل کے اشاریوں میں بھی کم و بیش اتنی ہی تعداد موجود ہے اور چونکہ مضامین کے علاوہ تبصرۂ کتب کو بھی کھنگالا گیا ہے اس لئے ان سے یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ معارف میں ساڑھے پانچ ہزار نیا دور میں دو ہزار اور آجکل میں ڈھائی ہزار کتابوں پر تبصرے شائع ہوئے ہیں۔

رام پور رضا لائبریری۔ ساری دنیا میں ایک عظیم الشان تحقیقی ادارہ

کی حیثیت سے اپنی منفرد شان اور پہچان رکھتی ہے۔ ہندی اردو، فارسی اور عربی زبانوں اور مشرقی علوم کا کوئی فن اور موضوع ایسا نہیں ہے جس کی کتابیں یہاں موجود نہ ہوں غالب اقبال میر انیس اور کئی دیگر شعرا و مصنفین کے اشاریے بھی یہاں موجود اور محفوظ ہیں لیکن یہ امر باعث حیرت ہے کہ میر سے متعلق یہاں ایسا کوئی مکمل اشاریہ دستیاب نہیں جس سے میر کے بارے میں لکھے گئے مضامین اور میر کی شخصیت و شاعری پر تحریر کردہ کتابوں کا مکمل علم ہو سکے۔ اس لحاظ سے میر تقی میر پر ترتیب دیا گیا پیش نظر اشاریہ انفرادی حیثیت کا حامل ہے اور شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ میر پر تیار کیا گیا یہ ابتک کا غالباً پہلا اشاریہ ہے جسے تیار کرنے میں کئی ماہ کی محنت شاقہ سے گزرنا پڑا۔

لیکن یہاں اس امر کی وضاحت بھی ضروری ہو کہ میر پر اشاریہ سازی کا یہ کام ابھی نامکمل ہے کیونکہ راقم کی خواہش تھی کہ میر کے بھی دواوین اور ان کی تحریر کردہ دوسری کتابوں نیز دوسرے مصنفین کی میر پر لکھی گئی کتابوں کا بھی مکمل اشاریہ پیش نظر اشاریہ میں شامل کر لیا جائے اور اگرچہ اس سلسلہ میں بھی میں نے بہت سا کام کر لیا ہے لیکن چونکہ نیا دور کے صفحات اس طوالت کے متحمل نہیں ہو سکتے اس لئے ان کتابوں کا اشاریہ الگ سے پیش کیا جائے گا۔ رضا لائبریری میں میر سے متعلق کتابیں کثیر تعداد میں ہیں یہ کتابیں مختلف شعبوں اور فنون سے تعلق رکھتی ہیں کچھ کتابیں مخطوطات کی شکل میں ہیں اور دیگر کتابیں تذکرۂ شعرا و ادبا، تذکرۂ عام، تنقید تحقیق، سوانح، غزل، قصیدہ، مثنوی، شاعری، ہجو، نظم، دواوین، لوباد و گلشن وغیرہ میں موجود ہیں۔ کچھ کتابیں فارسی میں بھی دستیاب ہیں۔

پیش نظر اشاریہ میں میر سے متعلق جن کتابوں کے تبصروں کا اشاریہ پیش کیا گیا ہے ان میں تبصرہ نگار کے نام کو اشاریہ کے اصول و ضوابط کے لحاظ سے اور لائبریری سائنس کے مطابق رکھا گیا ہے جبکہ مصنف، مرتب، یا مترجم کے نام کی ترتیب میں کوئی ترمیم نہیں کی گئی ہے۔

رسائل کے اشارے الگ الگ انداز سے مختلف قلم کاروں اور اشاریہ سازوں نے ترتیب دئے ہیں۔ یہ اشارے موضوعاتی بھی ہیں۔ اصناف وار بھی اور مصنف وار بھی لیکن راقم نے میر پر لکھے گئے سبھی مضامین کے کارڈ بنا کر ان سب کو ایک ہی طرز یا پیٹرن پر مرتب کر دیا ہے تاکہ محققین اور نوخیز اسکالرز اس سے بہتر طور پر اور آسانی سے مستفید ہو سکیں۔ اشاریہ سازی چونکہ تحقیق کے ساتھ ایک تکنیکی کام بھی ہے اس میں خاص طور سے صفحات نمبر کا حوالہ دیتے ہوئے ایک ڈیش اور کا Coma غلط اندراج بھی مفہوم کو کہیں سے کہیں پہونچا دیتا ہے اس لئے اس میں ہر پہلو پر دھیان رکھنا ضروری ہوتا ہے بصورت دیگر اشاریہ کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔

میرا جی چاہتا تھا کہ میر کا اشاریہ تیار کرنے میں میں نے جن اشاریوں کو کھنگالا ہے ان سب اشاریوں کا تعارف بھی پیش کر دوں لیکن چونکہ بیشتر اشاریے ایک سے بڑھ کر ایک ہیں اور اپنے محققین کی محنت لگن شوق جستجو اور اردو سے محبت کی جیتی جاگتی تصویر پیش کرتے ہیں اس لئے ایسے اچھے اشاریوں کا دو دو چار چار جملوں میں تعارف پیش کرنے سے ان کا حق ادا نہیں ہوتا لہٰذا سردست ان اشاریوں کا تعارف نہ دینا ہی بہتر معلوم ہوا تاہم ایک مہمان اشاریہ کے بارے میں چند جملے ضرور لکھنا چاہتا ہوں کیونکہ یہ اشاریہ سب سے مختلف ہے اور اس کا نام ہے ''جامعات میں اردو تحقیق''۔ اس سے دو باتیں بخوبی عیاں ہوتی ہیں ایک تو یہ کہ اردو زبان دنیا میں ہر جگہ بولی اور پڑھی اور لکھی جاتی ہے۔ دوسرے اس میں مستقل طریقے سے تحقیقی کام کیا جا رہا ہے۔ جامعات کے اسی مذکورہ اشاریہ میں ڈی فل ایم فل پی ایچ ڈی، ڈی لٹ وغیرہ کے لئے دنیا کی ۸۱ یونیورسٹیوں میں ۲۰۰۸ تک جو تحقیقی مقالے لکھے گئے ہیں ان کا مکمل اشاریہ پیش کیا گیا ہو اور ان تحقیقی مقالوں کی تعداد پانچ ہزار ہے اس سے یہ بھی بخوبی اندازہ ہوتا ہو کہ کس یونیورسٹی میں کس نوعیت کا تحقیقی کام ہوا ہے۔ ہندستان اور پاکستان کے علاوہ جن ملکوں میں یہ تحقیقی کام ہوا ہے ان کے نام درج ذیل ہیں۔ جامعہ ازہر مصر یونیورسٹی آف البرٹا کینیڈا، القاہرہ یونیورسٹی قاہرہ مصر، فری یونیورسٹی آف برسلز بلجیم، ڈرہم یونیورسٹی برطانیہ، ڈھاکہ یونیورسٹی بنگلادیش، سوربون یونیورسٹی پیرس، شکاگو یونیورسٹی شکاگو، جامعہ عین شمس قاہرہ، جامعہ قاہرہ مصر، لندن یونیورسٹی، ماسکو یونیورسٹی نیو یارک یونیورسٹی امریکہ۔

خوشی کی بات ہے کہ اشاریہ 'جامعات میں اردو تحقیق' میں اشاریہ نیا دور کا تذکرہ بھی موجود ہے۔ ذیل میں مختلف اشاریوں سے تیار کیا گیا میر کا اشاریہ ملاحظہ فرمائیں۔

(۱)

اشاریہ ماہنامہ نیا دور، لکھنؤ ۱۹۵۵ـ۲۰۱۰

مرتب: ڈاکٹر محمد اطہر مسعود خاں

عنوان	قلم کار کا نام	ماہ و سال	صفحہ نمبر
اثر لکھنوی کی شاعری پر میر کے اثرات	رام آسرا چھتی	دسمبر ۱۹۶۷	۲۰_۲۴
چند نوادر (خالق باری، کلیات میر، مثنوی مولانا روم، دیوان صانع، ہدایت الرمی، میر مونس کا ایک مرثیہ، دیوان رجب، گلزار فراست، مہابھارت)	نیر بہوروی	اگست ۱۹۶۶	۵_۱۴
دیوان میر کا قدیم ترین اور مستند مخطوطہ: نسخہ محمود آباد (۱)	اکبر حیدری کاشمیری، ڈاکٹر	۲۶ جنوری ۱۹۷۴	۳۳_۴۳
دیوان میر کا قدیم ترین اور مستند مخطوطہ: نسخہ محمود آباد (۲)	اکبر حیدری کاشمیری، ڈاکٹر	مارچ ۱۹۷۴	۳۴_۴۸
دیوان میر کا قدیم ترین اور مستند مخطوطہ: نسخہ محمود آباد (۳)	اکبر حیدری کاشمیری، ڈاکٹر	اپریل ۱۹۷۴	۳۴_۴۶
رباعیات میر	زرینہ ثانی	نومبر ۱۹۷۱	۲۰_۲۲
کلیات میر (مطبوعہ اور مخطوطہ میر کے بارہ مختلف کلیات کا تذکرہ)	اکبر حیدری کاشمیری، ڈاکٹر	جولائی ۱۹۹۵	۴_۱۹
میر تقی میر	مہر، سیدہ بیگم	جون ۱۹۶۶	۱۸_۲۰
میر تقی میر اور ان کی ہم عصر ہندی شاعری	انیس انصاری	فروری ۱۹۹۵	۲۱_۲۵
میر کا تصوف	شلیب رضوی سیتاپوری	اپریل ۱۹۵۹	۳۵_۴۰
میر کا شیوۂ گفتار	سعیدہ وارثی	جولائی ۱۹۶۰	۲۷_۲۹
میر کی اصلاحیں	محمد نعیم	جون ۱۹۵۶	۲۵_۳۰
میر کی ایک غزل؟ (آ کے سجادہ نشیں قیس ہوا میرے بعد)	ابو محمد شبلی	ستمبر ۲۰۰۰	۱۶_۱۹
میر کی دلی	شامہ قدوائی	جون ۱۹۷۶	۲۳_۲۵
میر کی رومانی تخیل	شہید صفی پوری	ستمبر ۱۹۶۶	۴_۱۰
میر کی شاعری میں بے خوابی	سلام سندیلوی، ڈاکٹر	مارچ ۱۹۸۰	۹_۱۲
میر کی شاعری میں دنیا سے کنارہ کشی کا رجحان	سلام سندیلوی، ڈاکٹر	اپریل ۱۹۷۵	۱۲_۱۸
میر کی شاعری میں فارسی و ریختہ کی مماثلت	علیم اللہ حالی، ڈاکٹر	جون ۱۹۸۵	۴۷_۵۱
میر کی شاعری میں مزاح و ظرافت	عبدالرشید	جون ۱۹۸۰	۱۱_۱۵
میر کی شخصیت اور شاعری	مسیح الرماب	اکتوبر ۱۹۵۷	۲۸_۳۶
میر کی عظمت	مالک رام	۲۶ جنوری ۱۹۶۷	۱۹_۲۱
میر کے اشعار دل اور دلی کے مرثیے ہیں	آصف زمانی، ڈاکٹر	جون ۱۹۷۵	۳۶_۴۰

میر کے دیوان سوم کا ایک نادر قلمی نسخہ (یہ نسخہ بنارس ہندو یونیورسٹی کی لائبریری میں محفوظ ہے)	حنیف نقوی، ڈاکٹر	فروری ۱۹۷۸	۱۷_۴
میر کے نثری کارنامے	ممتاز ٹونکی	مارچ ۱۹۶۴	۴۶_۴۴
نکات الشعراء: ایک جائزہ (مؤلف: میر تقی میر)	نیاز سلطان پوری	فروری ۱۹۹۰	۳۱_۲۸
میر کا فلسفۂ انسانیت (ہندی مضمون کا ترجمہ)	نیل کانت (مصنف) اسرار سید (مترجم)	دسمبر ۱۹۹۵	۲۵_۲۲

(۲) اشاریہ ماہنامہ مخزن، لاہور ۱۹۰۱_1951

مرتب: ڈاکٹر امتیاز ندیم

تذکرہ میر تقی میر	حسرت، مولوی حبیب الرحمان خاں	مئی ۱۹۱۱	۱

(۳) توضیحی اشاریہ غالب نامہ ابتداء سے ۱۹۹۳ تک

مرتب: ڈاکٹر فاروق انصاری

خدائے سخن: میر کہ غالب؟	شمس الرحمٰن فاروقی	جولائی ۱۹۸۳	۳۳

(۴) اشاریہ ماہنامہ ایوان اردو، دہلی ۱۹۸۷_۱۹۹۲

مرتب: ڈاکٹر فاروق انصاری

آدھا شاعر پورا آدمی (میر نے خواجہ میر درد کو آدھا شاعر تسلیم کیا تھا، اس قول کے تناظر میں میر درد کی شاعری کا تجزیہ)	عبدالغنی	اپریل ۱۹۸۹	۶

(۵) اشاریہ ماہنامہ آجکل، دہلی ۱۹۴۲_۲۰۰۰

مرتب: ڈاکٹر جمیل اختر

اردو شاعری پر میر کا اثر	شیام جی سریواستو	یکم اکتوبر ۱۹۴۳	۳۷_۳۶
اسلوبیات میر کے چند مباحث	گوپی چند نارنگ	مارچ ۱۹۸۴	۳۸_۳۰
تذکرہ نکات الشعراء	حنیف نقوی	جولائی ۱۹۶۲	۱۷_۹
ذکر میر: خودنوشت کی حیثیت سے	خواجہ احمد فاروقی	اگست ۱۹۵۰	۳۲_۲۸
شہر لکھنؤ میں میر تقی میر کی پہلی شام	علی عباس حسینی	دسمبر ۱۹۶۵	۱۷_۸
شہر میر	خواجہ احمد فاروقی	مارچ ۱۹۸۴	۲۹_۲۶
غالب اور میر: مطالعے کے چند پہلو	شمس الرحمٰن فاروقی	مارچ ۱۹۸۴	۴۹_۳۹
کلیات میر کا ایک نادر الوجود مخطوطہ	اکبر حیدری کاشمیری	جون ۱۹۹۴	۱۵_۸
میر اور بندش الفاظ	حنیف کیفی	مارچ ۱۹۸۴	۹۶_۹۱
میر اور جدید ذہن	وارث علوی	مارچ ۱۹۸۴	۵۳_۵۰
میر اور غالب	مالک رام	مارچ ۱۹۸۴	۱۱_۹
میر اور فانی کے غم کا موازنہ	رضی بن ظہیر، سید	جون ۱۹۵۲	۲۸_۲۴

میر اور لکھنؤ	کاظم علی خاں	مارچ ۱۹۸۴	۸۵_۹۰
میر اور یقین	نثار احمد فاروقی	مارچ ۱۹۷۱	۱۲_۱۷
میر: ایک لحۂ فکریہ	مرتضیٰ حسین بلگرامی	اکتوبر ۱۹۶۲	۱۲_۱۴
میر تقی میر	محمد ہدایت اللہ	مارچ ۱۹۸۴	۵_۸
میر تقی میر اور بچوں کی شاعری	اظہر علی فاروقی	اپریل ۱۹۷۶	۱۹_۲۲
میر تقی میر: جدید ہندوستانی کا قومی شاعر	جمیل جالبی	مارچ ۱۹۸۴	۱۷_۲۲
میر تقی میر کی سیرت کے خط وخال: تذکرہ نکات الشعراء کے آئینے میں	خواجہ احمد فاروقی	اکتوبر ۱۹۵۱	۳۹_۴۴
میر تقی میر کی سیکولر مزاجی	آفتاب اختر	نومبر ۱۹۶۷	۱۴_۱۸
میر صاحب ہاسٹل میں	قاصد، سید اکبر علی	۱۵ فروری ۱۹۴۵	۳۶_۳۷
میر: غالب کے حریف	مرتضیٰ حسین بلگرامی	اکتوبر ۱۹۵۸	۴۸_۵۰
میر کا تصور انسان	عبدالمغنی	مارچ ۱۹۸۴	۶۵_۷۰
میر کا کلچر	ظ۔ انصاری	مارچ ۱۹۸۴	۵۴_۶۴
میر کی چج نتز	انتظار حسین	مارچ ۱۹۸۴	۲۳_۲۵
میر کی زندگی کے چند نئے پہلو	خواجہ احمد فاروقی	۱۵ جنوری ۱۹۴۶	۱۲_۱۶
میر کی شاعری کا اسم اعظم	محمود ہاشمی	مارچ ۱۹۸۴	۷۱_۷۳
میر کی شاعری کا جمالیاتی پہلو	عبادت بریلوی	اکتوبر ۱۹۵۸	۱۵_۱۹
میر کی شاعری کا سرریلسٹک (Realistic) پہلو	حامدی کاشمیری	مارچ ۱۹۸۴	۸۰_۸۲
میر کی شخصیت کا نثری اظہار	نیر مسعود	مارچ ۱۹۸۴	۷۴_۷۹
میر کی ظرافت	افسر، حامد اللہ	جولائی ۱۹۵۳	۱۴_۱۷
میر کی عالم گیر مقبولیت	فراق گورکھپوری	مارچ ۱۹۶۶	۱۴_۲۰
میر کی عروض شناسی	فلک، جے رام داس	جون ۱۹۸۵	۱۴_۲۰
میر کی فارسی غزل	اختر علی تلہری	جولائی ۱۹۶۷	۲۳_۳۲
میر کی مثنوی گنجینۂ راز کا مصنف کون ہے؟	محمد نعیم، چودھری	جولائی ۱۹۸۵	۱۶_۲۳
میر کے تعلقات ہندوؤں کے ساتھ	خواجہ احمد فاروقی	یکم ستمبر ۱۹۴۵	۱۵_۱۷
میر کے لطیفے	مسعود حسن رضوی	یکم جون ۱۹۴۷	۱۱۳_۱۱۵
میر کے لہجے کے صوتی میلانات	مغنی تبسم	مارچ ۱۹۸۴	۸۳_۸۴
میر و غالب	شوکت سبزواری	۱۵ مئی ۱۹۴۹	۳_۱۴
میر: میری نظر میں	سرور، آل احمد	مارچ ۱۹۸۴	۱۲_۱۶

(۶) اشاریہ تنقید (۷۵ کتابوں میں شائع ہوئے مضامین کا ارشاریہ)

مرتب: پروفیسر عتیق احمد صدیقی

مضمون کا عنوان	کتاب کا نام	مصنف کا نام
ادبیات اردو اور میر کی مثنویاں	تین شاعر	زور، محی الدین قادری
اردو غزل: قلی قطب شاہ سے میر تک	زاویے	اقبال بلگرامی
اردو غزل: میر سے اقبال تک	ادب اور نظریہ	سرور، آل احمد

خدائے سخن: میر تقی میر	ادبی نقوش	زرینہ عقیل احمد
دیوان میر	تاثرات	عبدالرزاق قریشی
ذکر میر	مباحث و مسائل	ضیاء احمد بدایونی
ذکر میر: خودنوشت کی حیثیت سے	کلاسیکی ادب	خواجہ احمد فاروقی
زبان میر	حرف ادب	شجاعت علی سندیلوی
عاشقوں کی ذہنی کیفیتوں اور قلبی وارداتوں کے مرقعے	تین شاعر	زور، محی الدین قادری
عہد حاضر میں میر کی افادیت	نئی اردو شاعری	زینت اللہ جاوید
قنوطیت پسندی اور میر	ادراک معنی	طیب انصاری
کلام میر میں فکر و نظر کا عنصر	ولی سے اقبال تک	سید عبداللہ
کیا میر قنوطی تھے؟	مجاز کا المیہ اور دوسرے مضامین	سلامت اللہ خاں
مثنوی دریائے عشق: مرتبہ کارمائل اسمتھ	تحقیقی مطالعے حصہ اول	عطا کاکوی، عطاء الرحمن
میر اور ان کی شاعری	تنقیدی حاشیے	مجنوں گورکھ پوری
میر اور ن کی شاعری	غزل سرا	مجنوں گورکھ پوری
میر اور ان کے غم	فکر گستاخ	زوار حسین نقوی، سید
میر اور راسخ	تقابلی مطالعے	عطا کاکوی، عطاء الرحمن
میر اور نظیر کے ہم مضمون قطعے (تقابلی مطالعہ)	آئینہ سخن فہمی	مسعود حسن رضوی ادیب
میر اور نئی غزل	انسان اور آدمی	محمد حسن عسکری
میر اور ہم	ادب اور زندگی	مجنوں گورکھ پوری
میر اور ہم	غزل سرا	مجنوں گورکھ پوری
میر اور ہم	نقوش و افکار	مجنوں گورکھ پوری
میر: ایک عظیم ہندوستانی شاعر	تلاش و تعبیر	منظر اعظمی
میر تقی میر	افکار و نظریات	فضل امام
میر تقی میر	عطر آگہی	شجاعت علی سندیلوی
میر تقی میر کا رنگ طبیعت	بحث و نظر	سید عبداللہ
میر تقی میر کی سیرت: نکات الشعراء کی روشنی میں	کلاسیکی ادب	خواجہ احمد فاروقی
میر صاحب کا ایک خاص رنگ	تحقیقات	عندلیب شادانی
میر: صبا در بدر	پیغمبران سخن	سردار جعفری
میر کا انداز	بحث و نظر	سید عبداللہ
میر کا ایک شعر اور خشویات	آئینہ سخن فہمی	مسعود حسن رضوی ادیب
میر کا لہجہ	آواز اور آدمی	مغنی تبسم
میر: کلاسیکی شاعر	افکار ادب	صفیہ پروین
میر کی امیجری	نثر، نظم اور شعر	منظر عباس نقوی
میر کی شاعری	افادات سلیم	وحید الدین سلیم
میر کی شاعری: دل اور دلی کی مرثیہ خوانی	ارمغان ادب	اخلاق حسین عارف
میر کی شخصیت اور شاعری	عرفان نظر	یوسف سرمست
میر کی عشقیہ مثنویاں	تحریریں	گیان چند جین

میر کی عشقیہ مثنویوں کے فسانے اور ان کی نوعیت	تین شاعر	زور، محی الدین قادری
میر کی غمگینی کا نفسیاتی پس منظر	سخنوران غزل	معین الدین حسن کاکوروی
میر کی قصیدہ نگاری	تنقید و تجزیہ	ابومحمد سحر
میر کی مثنویاں اور فطرت کی ترجمانی	تین شاعر	زور، محی الدین قادری
میر کی مثنویاں اور نواب اودھ	تین شاعر	زور، محی الدین قادری
میر کی مثنوی دریائے عشق کا ایک ماخذ	علمی نقوش	غلام مصطفیٰ خاں
میر کی مثنویوں کے مقام تحریر	تین شاعر	زور، محی الدین قادری
میر کی مثنویوں میں ان کے ماحول کے متعلق معلومات	تین شاعر	زور، محی الدین قادری
میر کی مرثیہ نگاری	اردو شاعری کی ہندوستانی روح	زرینہ ثانی
میر کی مفروضہ غزل پر ایک نظر	تحقیقی مطالعے حصہ اول	عطا کاکوی، عطاء الرحمٰن
میر کے کلام میں تاریخی حالات کا شعور	کلاسیکی ادب	خواجہ احمد فاروقی
میر کے لطیفے	نگارشات ادیب	مسعود حسن رضوی ادیب
میر کے مطالعے کی اہمیت	مسرت سے بصیرت تک	سرور، آل احمد
میر کے مفروضہ اشعار	تحقیقی مطالعے حصہ اول	عطا کاکوی، عطاء الرحمٰن
میر کے نہاں خانے	تنقید و تحلیل	شبیہ الحسن نونہروی
میر ماضی سے مستقبل تک	میرے خیال میں	نظیر صدیقی

(۷) اشاریہ رام پور رضا لائبریری جرنل، شمارہ نمبر ۱۔۱۹ (غیر مطبوعہ)

مرتب: ڈاکٹر محمد اطہر مسعود خاں

مضمون کا نام	مضمون نگار	شمارہ نمبر	صفحہ نمبر
رام پور رضا لائبریری میں رسائل کے خاص نمبر (میر تقی میر نمبر ۔ ماہنامہ آج کل، دہلی، مطبوعہ ۱۹۸۳ء، رضا لائبریری میں اس خاص نمبر کا کال نمبر رسائل ۲۰۵)	ڈاکٹر ابوسعد اصلاحی (مرتب)	۶_۷، ۲۰۰۲ء	۲۸۲ ۲۹۳
میر سے منسوب کلام کی حقیقت	شئیب، شبیر علی خاں	۱۲_۱۳، (۲۰۰۴ء)	۱۰۳_۱۱۰
میر کی زبان	نثار احمد فاروقی	۸_۹ (۲۰۰۲ء)	۳۱_۴۰

(۸) اشاریہ ماہنامہ صحیفہ، لاہور جون ۱۹۵۷ـ اپریل ۱۹۷۸

مرتب: محمد عبداللہ

افکار میر ۔ ایم ۔ حبیب خاں	وارث سرہندی	جنوری ۱۹۷۰	۱۱۴_۱۱۵
شیخ محمد جان شاد لکھنوی پیرو میر کے نایاب دواوین	سخاوت مرزا	اکتوبر ۱۹۷۰	۳۸_۴۵
کلیات میر (دیوان اول) (مرتب: کلب علی خاں فائق)	سراج منیر	مئی جون ۱۹۷۷	۸۸_۹۵
کلیات میر پر ایک نظر (مرتب: ڈاکٹر عبادت بریلوی)	کلب علی خاں فائق	جولائی ۱۹۶۲	۶۹_۸۷
میر ادبی معرکہ میں	کلب علی خاں فائق	ستمبر ۱۹۵۷	۶۴_۸۱
میر اور ذہن جدید	سید عبداللہ، ڈاکٹر	شمارہ نمبر ۱۳، ۱۹۶۰ء	۱۴_۲۱
میر ایک نقاد	کلب علی خاں فائق	دسمبر ۱۹۵۸	۷۸_۱۰۳

(۹) اشاریہ ماہنامہ برہان، دہلی ۱۹۳۸ء۔۱۹۶۵ء

مرتبہ: ڈاکٹر شائستہ خان

میر کی اخلاقی قدریں	تابش، لچھمی نرائن وشیشٹ	جلد نمبر ۴۰، شمارہ نمبر ۲

(۱۰) ادب کی رفتار ۱۹۵۹

(مختلف رسائل میں ۱۹۵۹ میں شائع ہوئے مضامین کا موضوعاتی اشاریہ)

مرتب: ڈاکٹر عابد رضا بیدار

میر نمبر	انتخاب: عسکری	رسالہ ساقی، کراچی،	مطبوعہ ۱۹۵۹

(۱۱) ادب کی رفتار ۱۹۶۰

(مختلف رسائل میں ۱۹۶۰ میں شائع ہوئے مضامین کا مصنف وار اشاریہ)

مرتب: ڈاکٹر عابد رضا بیدار

تاریخ: معتقد میر	ابو محمد سحر،	ماہنامہ نگار،	مطبوعہ مئی ۱۹۶۰

(۱۲) انیس نما

(ہندوستان کے اردو رسائل میں میر انیس سے متعلق شائع ہوئے مضامین اور کتابوں کا اشاریہ)

مرتب: پروفیسر عبدالقوی دسنوی

کتاب کا نام	مصنف	سن اشاعت
تین شاعر (میر تقی میر، میر انیس، ورڈس ورتھ)	محی الدین قادری زور	۱۹۳۶

(۱۳) ڈاکٹر جمیل جالبی (سوانحی کتابیات)

(ڈاکٹر جمیل جالبی کی ساری کتابوں اور تخلیقات کا وضاحتی اشاریہ)

مرتبہ: نسیم فاطمہ

مضمون کا عنوان	کتاب کا نام	صفحہ نمبر
بنام محمد تقی میر	ادب، کلچر اور مسائل	۱۵۰
محمد تقی میر	نئی تنقید	۱۹۶
....	محمد تقی میر (حیات، سیرت، تصانیف اور مطالعہ شاعری)	مطبوعہ: انجمن ترقی اردو کراچی ۱۹۸۱

(۱۴) فہرست مشتملات خدا بخش لائبریری جرنل شمارہ نمبر ۱۔۵۲

مرتب: خدا بخش لائبریری

میر کی غیر مطبوعہ مثنویات	ریاض الرحمٰن قدوائی	شمارہ نمبر ۴۹

(۱۵) غالب نما

(۱۹۴۷ سے ۱۹۶۸ تک کی پاکستانی مطبوعات کا اشاریہ)

مرتب: ابن حسن قیصر

مضمون کا عنوان	مضمون نگار	رسالہ کا نام	ماہ و سال
پھر وہی میر و غالب کا قضیہ	اثر لکھنوی	ادب لطیف،	ستمبر اکتوبر ۱۹۵۲
غالب پر میر کا اثر	شاد، نریش کمار	ماہنامہ افکار	فروری، مارچ ۱۹۶۶
غالب کے متعلق میر کی رائے	(قلم کار کا نام نہیں ہے)	ماہنامہ قومی زبان، کراچی	مئی ۱۹۶۵
مرزا غالب اور میر تقی میر	مہر، غلام رسول	ماہنامہ ماہ نو، کراچی	فروری ۱۹۴۹
میر و غالب کی ہم طرح غزلیں	سید عبداللہ، ڈاکٹر	ادب لطیف، لاہور	مارچ ۱۹۵۲

(۱۶) پٹنہ یونیورسٹی کے اردو تھیسس کا جائزہ (مطبوعہ ۱۹۹۵)

مرتب: احمد یوسف

تھیسس کا موضوع	
اردو غزل میں فکری عناصر (میر سے داغ تک)	اس تحقیقی مقالہ پر یوسف خورشیدی کو پٹنہ یونیورسٹی نے ۱۹۷۷ میں پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کی ڈگری تفویض کی۔

(۱۷) اشاریہ روح ادب، کولکاتا، مطبوعہ ۲۰۰۴

مرتبہ: بلقیس بیگم

مضمون کا عنوان	مضمون نگار	ماہ و سال
میر کا دیوان فارسی (غیر مطبوعہ) ایک تعارف	اکبر حیدری کاشمیری، ڈاکٹر	جولائی۔ ستمبر ۱۹۸۴
میر کا ہجو۔ ''گھر کا حال''	حسین احمد زاہدی	جنوری۔ جون ۲۰۰۱

(۱۸) اشاریہ اردو نامہ (ترقی اردو بورڈ پاکستان کا مجلہ) ۱۹۹۷ء

مرتب: مصباح العثمان

برٹش میوزیم میں کلام میر کے نسخے (۱) دیوان اول	عبادت بریلوی، ڈاکٹر	شمارہ نمبر ۱۳، ص: ۸۵/۲۹ اشاریہ کا ص نمبر ۴۷
مراسلات (علمی بحث کے لیے)	احسان دانش	شمارہ نمبر ۳۳۔۳۴، ص: ۱۹۹
مراسلات (علمی بحث کے لیے)	نثار احمد فاروقی	شمارہ نمبر ۱۷، ص: ۸۹ اشاریہ کا ص نمبر ۱۱۶

(۱۹) کتابیات پاکستانی ادب ۱۹۹۲ء مطبوعہ ۱۹۹۳ء

تدوین: سعیدہ درانی

کتاب کا نام	مصنف/مرتب	صفحہ نمبر
کلیات میر (جلد سوم، دوسرا ایڈیشن)	کلب علی خاں فائق	۵۴
محمد تقی میر (دوسرا ایڈیشن)	ڈاکٹر جمیل جالبی	۸۷

(۲۰) کتابیات پاکستانی ادب ۱۹۹۴ مطبوعہ ۱۹۹۵
تدوین: سعیدہ درّانی

انتخاب کلام میر — مولوی عبدالحق — ۲۷

(۲۱) خدا بخش لائبریری میں محفوظ اردو نشریات آل انڈیا ریڈیو، پٹنہ کی فہرست مطبوعہ ۱۹۹۵

میر: بحیثیت ایک صوفی شاعر — کاظم ہاشمی — ۲۶

(۲۲) اشاریہ ماہنامہ ضیاء وجیہ، رام پور ۱۹۹۰۔۲۰۰۰
مرتب: ڈاکٹر شعائر اللہ خاں

تلاش میر (مولفہ: نثار احمد فاروقی) میری نظر میں — شفا، حکیم محمد حسین خاں — مارچ ۱۹۹۵ — ۴۱

(۲۳) مختار نامہ
(پروفیسر مختار الدین احمد کے مقالات وتصانیف کا موضوعاتی اور وضاحتی اشاریہ)
مرتبین: ڈاکٹر عطا خورشید، مہر الٰہی ندیم (علیگ)

''اشعار میر'' پر ایک نظر — مختار الدین احمد — مطبوعہ: علی گڑھ میگزین ۱۹۴۷۔۴۸
(یہ تحریر پروفیسر عبدالسنان بیدل ۱۹۰۷۔۱۹۸۲ کی کتاب ''اشعار میر'' پر تبصرہ ہے۔)

(۲۴) غالبیات (رسالہ نقوش میں ذخیرہ)
مرتبہ: نائلہ انجم

جدھر دیکھو اک باغ۔ تذکرہ میر وغالب — تحسین فراقی، ڈاکٹر — شمارہ نمبر ۱۳۵، ص ۵۱۴۔۵۲۷ اشاریہ کا ص: ۱۵۴

خط بنام احراز نقوی۔ میر اور غالب — اثر لکھنوی — شمارہ نمبر ۱۰۹، جلد ۲، ص ۵۰۳ اشاریہ کا ص: ۱۵۳

میر، غالب، اقبال — حامد حسن قادری — شمارہ نمبر ۱۲۲/۱۹، ص ۲۴۸ اشاریہ کا ص: ۸۵

(۲۵) اشاریہ ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ (جولائی ۱۹۱۶۔جون ۲۰۰۵)
مرتب: محمد سہیل شفیق

میر کا فارسی کلام — محمد ابواللیث صدیقی — جلد وشمارہ نمبر ۶/۵۱ اشاریہ کا ص: ۲۳۴،۸۰

(۲۶) ماہنامہ معارف میں کتابوں پر تبصرے

کتاب کا نام	تبصرہ نگار	جلد وشمارہ نمبر	اشاریہ کا ص نمبر
اشعار میر	ادارہ	۶/۴۶	۵۴۳
انتخاب کلام میر	ادارہ	۳/۳، ۴/۱۹	۵۴۹
انتخاب مثنویات میر	ادارہ	۶/۲۷	۵۴۹
انتخاب میر	ادارہ	۲/۱۰۸	۵۴۹

تذکرہ نکات الشعراء	ادارہ	۲/۱۱۰	۵۶۰
تلاش میر	ادارہ	۵/۱۵۵	۵۶۲
فیض میر	ادارہ	۲/۲۹	۵۹۵
کلیات میر	ادارہ	۵/۴۸	۵۹۹
مثنویات میر	ادارہ	۶/۳۲	۶۰۳
مراثی میر	ادارہ	۴/۷۰	۶۰۵
میر تقی میر	ادارہ	۱/۹۴،۳/۷۵	۶۱۳
میر کی آپ بیتی	ادارہ	۳/۸۱	۶۱۳
میر و سودا کا دور	ادارہ	۶/۹۷	۶۱۳
میر و مصحفی	ادارہ	۱/۱۷۴	۶۱۳

(۲۷) ماہنامہ آجکل، دہلی میں کتابوں پر تبصرے (۱۹۴۲-۱۹۸۶)

کتاب کا نام	مصنف/مرتب	تبصرہ نگار	ماہ و سال	صفحہ نمبر
اٹھارویں صدی میں ہندوستانی معاشرت (میر کا عہد)	ڈاکٹر محمد عمر	شارب ردولوی	اگست ۱۹۷۴	۴۴-۴۶
افکار میر	ایم. حبیب خاں	محمد عمر	اکتوبر ۱۹۶۹	۵۵
تذکرۂ میر	ایم۔ کے۔ فاطمی	عرش ملسیانی	فروری ۱۹۶۴	۴۵
دیوان میر	سردار جعفری	عرش ملسیانی	مئی ۱۹۶۲	۴۳
ساقی (میر نمبر)	محمد حسن عسکری (انتخاب)	عرش ملسیانی	جنوری ۱۹۶۱	۸۱
مثنویات میر بہ خط میر	رام بابو سکسینہ	عرش ملسیانی	دسمبر ۱۹۵۶	۵۶
مطالعۂ میر	ڈاکٹر ابو محمد سحر	عرش ملسیانی	اکتوبر ۱۹۶۵	۴۶-۴۷
میر تقی: حیات اور شاعری	خواجہ احمد فاروقی	عرش ملسیانی	دسمبر ۱۹۵۴	۴۷
میر کی آپ بیتی	نثار احمد فاروقی	عرش ملسیانی	اکتوبر ۱۹۵۸	۵۷
نکات الشعراء کی اہمیت	ایم۔ کے۔ فاطمی	عرش ملسیانی	فروری ۱۹۶۴	۴۵

(۲۸) ماہنامہ نیا دور، لکھنؤ میں کتابوں پر تبصرے (۱۹۵۵-۲۰۱۰)

انتخاب میر	ڈاکٹر محمد حسن	احمر لاری، ڈاکٹر	اکتوبر ۱۹۷۱	۴۸
دیوان میر (مع فرہنگ)	علی سردار جعفری (مرتب)	صباح الدین عمر	مئی ۱۹۶۲	۵۵
فرہنگ کلام میر۔ دیوان اول، مع تنقیدی مقدمہ	شاہینہ تبسم	شرمین	دسمبر ۱۹۹۳	۴۶-۴۷
میر تقی میر (حیات وفن)	محمد حسنین حسان	کاظم علی خاں	مئی ۱۹۶۹	۴۸
میر کی آپ بیتی (ذکر میر کا اردو ترجمہ)	نثار احمد فاروقی	ادارہ	جنوری ۱۹۶۰	۶۴
میر و مصحفی	پروفیسر حنیف نقوی	شارب ردولوی، پروفیسر	اگست ۲۰۰۴	۲۹-۳۰
میر تنقید: تذکروں سے عصر حاضر تک	ڈاکٹر ریشما پروین	مرزا شفیق حسین شفق	جنوری ۲۰۱۰	۴۲

(۲۹) ماہنامہ ایوان اردو میں کتاب پر تبصرہ (۱۹۸۷ـ۱۹۹۲)

فرہنگ کلیات میر	ڈاکٹر فرید احمد برکاتی	محمود سعیدی	نومبر ۱۹۹۱ ۴۵

(۳۰) اشاریہ۔ رسالہ زمانہ کی ادبی خدمات (۱۹۰۳ـ۱۹۴۹)

مرتب: ڈاکٹر شفیع احمد عثمانی

مضمون کا عنوان	مضمون نگار	ماہ و سال	جلد، شمارہ، ص	اشاریہ کا سیریل نمبر
خدائے سخن حضرت میر	ادیب، مسعود حسن رضوی	دسمبر ۱۹۳۲	۳۰۵ـ۶ـ۵۶	۲۸۱۵
فلسفہ عبرت اور میر (میر کے کلام میں عبرت کی مثالیں)	مقبول حسین احمد پوری	مئی ۱۹۳۴	۲۶۱ـ۵ـ۵۸	۲۸۲۰
کلام میر	جگر بریلوی، شیام موہن لال	جون ۱۹۲۹	۳۱۳ـ۶ـ۵۲	۲۸۱۷
کلام میر (کلام میر میں کتابت کی غلطیاں اور ان کی تصحیح)	یگانہ چنگیزی لکھنوی	جولائی ۱۹۴۰	۳۱ـ۱ـ۷۵	۲۸۲۲
کلام میر (مطبوعہ کلیات میر میں کتابت کی غلطیوں کی اصلاح)	یگانہ چنگیزی لکھنوی	جون ۱۹۴۱	۲۹۹ـ۶ـ۷۶	۲۸۲۵
میر تقی میر (شاعری)	اثر لکھنوی، جعفر علی خاں	جولائی ۱۹۱۶	۱۳ـ۱۶۰ـ۲۷	۲۸۱۴
میر تقی میر کا کلام	برہم	جولائی ۱۹۰۸	۲۵ـ۱ـ۱۱	۲۸۱۶
میر دہلوی (شاعری)	عشرت لکھنوی، محمد عبدالرؤف	جولائی ۱۹۱۹	۲۶ـ۱۹۶ـ۳۳	۲۸۱۹
میر کا بہترین رنگ تغزل اور مضر فم	دیبی پرشاد شریواستو	اکتوبر ۱۹۴۲	۱۶۵ـ۴ـ۷۹	۲۸۱۸
میر کا کلام (میر تقی میر کے کلیات کی اغلاط پر ایک نظر)	یگانہ چنگیزی لکھنوی	جون ۱۹۴۰	۳۱۷ـ۶ـ۷۴	۲۸۲۱
میر کا کلام (مطبوعہ کلیات میر میں کتابت کی غلطیوں کی اصلاح)	یگانہ چنگیزی لکھنوی	دسمبر ۱۹۴۰	۳۲۹ـ۶ـ۷۵	۲۸۲۳
میر کا کلام (مطبوعہ کلیات میر میں کتابت کی غلطیوں کی اصلاح)	یگانہ چنگیزی لکھنوی	اپریل ۱۹۴۱	۱۸۳ـ۴ـ۷۶	۲۸۲۴
میر و غالب (میر و غالب کی شاعری کا موازنہ)	اثر لکھنوی، جعفر علی خاں	جون ۱۹۲۴	۳۳۶ـ۶ـ۴۲	۲۸۱۳
میر و غالب کی شاعری کی ہم طرح غزلیں	اثر لکھنوی، جعفر علی خاں	دسمبر ۱۹۲۴	۲۸۵ـ۶ـ۴۳	۲۸۱۴

(۳۱) جامعات میں اردو تحقیق

(اردو زبان و ادب سے متعلق دنیا کی ۸۱ جامعات کے سندی تحقیقی مقالات کی فہرست)

مرتب: رفیع الدین ہاشمی

ناشر: ہائر ایجوکیشن کمیشن، اسلام آباد

تحقیقی مقالہ کا عنوان	محقق کا نام	یونیورسٹی کا نام	سال	اشاریہ کا سیریل نمبر
اردو تنقید میں میر شناسی (پی ایچ ڈی)	عارفہ بشریٰ	کشمیر یونیورسٹی	۱۹۷۷	۲۵۴۰

اردو شاعری میں مذہبی اقدار: میر تقی میر سے اقبال تک (پی ایچ۔ڈی)	رضا حیدر	دہلی یونیورسٹی	۲۰۰۶	۱۵۸۵
اردو غزل میں فکری عناصر میر سے داغ تک) (ڈی۔فل)	یوسف خورشیدی	پٹنہ یونیورسٹی	۱۹۷۷	۱۸۳۵
اردو کے منتخب شعراء کے ہاں تصوف کی روایت (میر، درد، غالب، اقبال اور اصغر گونڈوی کے حوالے سے (پی ایچ۔ڈی)	شبانہ کوثر	پشاور یونیورسٹی	۲۰۰۵	۱۲۰۷
اردو میں انتقادِ میر کی روایت کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ (پی ایچ۔ڈی۔)	سعد مسعود غنی	ملتان یونیورسٹی	.....	۲۵۲۹
اودھ میں اردو مرثیے کا ارتقا اور اس میں میر ضمیر، دبیر، خلیق کا نمایاں حصہ (ڈی۔فل)	اکبر حیدری کاشمیری	لکھنؤ یونیورسٹی	۱۹۷۳	۱۸۷۳
پاکستان میں میر شناسی کی روایت (ایم۔فل)	نذر عباس گوندل	علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی۔اسلام آباد	.....	۳۱۳۷
تلمیحات میر کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ (ایم۔فل)	محمد اسحاق	علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی۔اسلام آباد	.....	۳۱۳۵
جدید اردو غزل میں میر کی روایت (پی ایچ۔ڈی)	شفیقہ پروین	کشمیر یونیورسٹی	۱۹۸۱	۳۱۳۱
دیوان میر اول: ترتیب، تدوین، حواشی ومقدمہ (پی ایچ۔ڈی)	ضیاء فاطمہ ظفر	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی	۱۹۷۷	۵۳۵
دیوان میر دوم اور سوم (پی ایچ۔ڈی)	کامنی بیگم	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی	۱۹۷۷	۵۷۹
شعرائے اردو کے تذکرے: تنقیدی، تحقیقی مطالعہ، میر سے شیفتہ تک (پی ایچ۔ڈی)	حسن احمد نقوی، سید	وکرم یونیورسٹی، اجین	.....	۱۳۳۱
کلاسیکی اردو شاعری میں منظر نگاری (میر تا غالب) (پی ایچ۔ڈی)	راحت زہرا	لاہور یونیورسٹی	.....	۱۵۷۹
کلام میر کے صوفیانہ وفکری ابعاد (پی ایچ۔ڈی)	صادق حسین گوہر	علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد	.....	۳۱۳۲
کلام میر میں صنائع لفظی ومعنوی (ایم۔فل)	شفیق الرحمان	ملتان یونیورسٹی	.....	۳۱۳۰
میر: ایک مطالعہ (ڈی۔فل)	نواب حسین، سید	الہ آباد یونیورسٹی	۱۹۵۰	۳۱۳۸

میر تقی میر: حیات و شاعری از خواجہ احمد فاروقی (ترتیب و تدوین نو، مع حواشی) (ایم۔ فل)	عاصمہ منصور	ملتان یونیورسٹی	۲۰۰۶	۵۵۲
میر تقی میر کا غم (پی ایچ۔ ڈی)	صفیہ حیات	میسور یونیورسٹی	۱۹۷۵	۴۱۳۳
میر تقی میر کی شخصیت اور شاعری کا نفسیاتی مطالعہ (پی ایچ۔ ڈی)	شاہین نقوی	کراچی یونیورسٹی	۲۰۰۴	۴۱۲۹
میر تقی میر کی مثنویات کا اسلوبی مطالعہ (ایم۔ فل)	شاہد پرویز	جواہر لال نہرو یونیورسٹی، دہلی	۱۹۷۹	۴۱۲۸
میر، فانی اور ناصر کی حزنیہ شاعری کا تقابلی مطالعہ (ایم۔ فل)	تیمور حسن	علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی۔ اسلام آباد	.....	۴۱۲۵
میر کا عروضی مطالعہ (پی ایچ۔ ڈی)	سعید اللہ خاں	میرٹھ یونیورسٹی	۱۹۹۰	۴۱۲۷
میر کی شاعری کا استعاراتی نظام (پی ایچ۔ ڈی)	میمونہ بیگم	گلبرگہ یونیورسٹی	۲۰۰۵	۴۱۳۶
میر کی شاعری کا فنی مطالعہ (پی ایچ۔ ڈی)	عارف حسن خاں	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی	.....	۴۱۳۴
میر کی شعری لسانیات (غزلوں کی روشنی میں (پی ایچ۔ ڈی)	افضال حسین قاضی	گورکھپور یونیورسٹی	۱۹۸۱	۴۱۲۴
میر کی مثنوی خواب و خیال کا سماجیاتی مطالعہ (ایم۔ فل)	طارق اقبال	جواہر لال نہرو یونیورسٹی، دہلی	۱۹۹۲	۱۳۳۱
میر کے اردو اور فارسی کلام کا تقابلی مطالعہ (پی ایچ۔ ڈی)	حمیرا ارشاد	پنجاب یونیورسٹی	۲۰۰۶	۴۱۲۶
میر کے چوتھے، پانچویں اور چھٹے دیوان کی تدوین مع مقدمہ (پی ایچ۔ ڈی)	محمد امین، سید	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی	.....	۵۸۶
میر، سودا اور غالب کی غزلوں کے انگریزی تراجم (ایم۔ فل)	بشریٰ شریف	پنجاب یونیورسٹی	.....	۱۳۱۰
ناقدین میر تقی میر (پی ایچ۔ ڈی)	شوکت حیات	وکٹیشور یونیورسٹی، تروپتی	.....	۲۵۳۵
میر تنقید: تذکروں سے عصر حاضر تک (پی ایچ۔ ڈی)	ڈاکٹر ریشماں پروین	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی	۲۰۰۹	

(۳۲) آل انڈیا میرؔ اکاڈمی، لکھنؤ

کتاب کا نام	مرتب	سنہ اشاعت
حدیث میر	مقبول احمد لاری	۱۹۶۷ پہلا اڈیشن
		۱۹۸۶ دوسرا ایڈیشن

ڈاکٹر جمیل دوشی
۱۲۰/اے ۵۲۹ سنت کبیر لین، متین پورہ خرم نگر۔ لکھنؤ

میر کی عشقیہ مثنویاں

اکبر آباد یعنی آگرہ میں ایک درویش کے گھر جنم لینے والا ایک حساس اور جذباتی بچہ جو بچپن ہی میں سایۂ پدری سے محروم ہو گیا جسے اس کے اپنے بھائیوں اور رشتہ داروں نے ایسے اور اتنے دکھ دئے کہ یہ دکھ درد ہی اسکی قسمت بن گئے۔ معاشی پریشانیاں جسے ہمیشہ تنگ کرتی رہیں۔ ناکامیٔ عشق نے جسے غم و یاس کے اس گہرے سمندر میں ڈھکیل دیا کہ جب اس نے شعر کہنا شروع کیا تو یہ غم و یاس اس کی شاعری پر اس درجہ حاوی آئے کہ بعض ناقدوں نے اسے قنوطی قرار دیا۔ جو آگرہ سے دلی دلی سے آگرہ اور پھر آگرہ سے دلی اور لکھنؤ گویا شہر شہر بھٹکتا پھرا اور ایک دن اردو شاعری اور اردو غزل میں کبھی نہ مٹنے والے نقش چھوڑ کر لکھنؤ کے سٹی اسٹیشن کے پاس دو گز کی قبر میں ہمیشہ کے لئے ابدی نیند جا سویا۔ وہ حساس بچہ اردو شاعری کی دنیا میں میر تقی میر کے نام سے آج بھی زندہ ہے۔

اردو شاعری میں موٹے طور پر جس کی دو قسمیں مانی جاتی ہیں، ۱۔ داخلی یا غنائی اور خارجی یا بیانیہ۔ بیانیہ شاعری کا معراج صنف مثنوی کو تسلیم کیا جاتا ہے بقول حالیؔ "اردو شاعری کی تمام اصناف میں سب سے زیادہ کارآمد یہی صنف ہے۔۔۔ مثنوی میں ظاہری اور معنوی اعتبار سے بلند پایہ شاعری کے تمام لوازم موجود ہیں۔ دراصل مثنوی میں کسی بھی دوسری اصناف سخن کے مقابلے شاعر کو اپنے جذبات و خیالات اور زور بیان کے جوہر دکھانے کے سب سے زیادہ مواقع ملتے ہیں لہٰذا میر تقی میر جہاں غزل کی دنیا میں اپنے بعد آنے والی نسلوں کے لئے مشعل راہ ثابت ہوئے وہیں انھوں نے صنف مثنوی میں بھی اپنے فن کے جوہر دکھائے۔

میر تقی میر نے اپنی مثنویوں کا کوئی ایسا مجموعہ نہیں چھوڑا جس میں ایک ساتھ ان کی ساری مثنویاں شامل ہوں لہٰذا محققین کو ان کی تمام مثنویوں تک رسائی کے لئے نول کشور پریس، عبدالباری آسی اور ڈاکٹر عبادت بریلوی کی ترتیب شدہ "کلیات میر" شاہ سلیمان کی مرتبہ "مثنویات میر" حیدرآباد کے کتب خانہ ادبیات اردو، کتب خانہ آصفیہ و کتب خانہ سالار جنگ اور رام پور کی رضا لائبریری، محمود آباد میں دستیاب مختلف مخطوطوں، میر کے دیوان اور کلیات کو کھنگالنا پڑا جن کے مجموعی مطالعہ کے بعد محققین اب تک میر کی کل ۳۸ مثنویاں دریافت کر چکے ہیں جن میں ان چند مرثیوں کو شامل نہیں کیا گیا ہے جو مثنوی کی شکل میں لکھے گئے ہیں کیونکہ تحقیق کی دنیا میں کوئی لفظ "لفظ آخر" نہیں ہوتا اور میر کی مثنویاں اور ان کی تخلیقات گویا کتب خانوں اور ادب نواز حضرات کے یہاں کتابوں کے ذخیروں میں بکھری ہوئی ہیں۔ اس لئے اگر میر کی مثنویوں کی تعداد میں مستقبل میں اور اضافہ ہو جائے تو تعجب نہ ہوگا۔

میر کے یہاں مثنوی طفلی سے گذر کر بلوغ کی منزلوں میں داخل ہوتی ہے۔ ان کی مثنویاں اس لحاظ سے کافی اہم ہیں کہ ابتدائی مثنویوں کے مقابلے ان کی زبان و بیان اور لب و لہجہ میں برجستگی روانی اور پختگی پائی جاتی ہے۔ ان کی زبان ایک عاشق کی زبان ہے۔ ان کا لہجہ ایک نازک مزاج انسان کا لہجہ ہے۔ ان کا طرز بیان ایک سیدھے سچے درویشی طرز کا بیان ہے۔ ان کی زبان و بیان اور لب و لہجہ میں ابتدائی مثنویوں جیسی لڑکھڑاہٹ اور کھردراپن نہیں۔ اظہار بیان اور زبان کے لحاظ سے ان کی مثنویاں بعد میں لکھی جانے والی مثنوی نگاروں کے لئے مشعل راہ بنیں۔

میر نے مختلف موضوعات پر مثنویاں لکھیں، گھر کے حالات،

بے ثباتیٔ دنیا، جانوروں کے احوال، بیان مرغ بازاں، شکارنامے، بیان ہولی، مدح اور ہجو وغیرہ ان کی مثنوی کے موضوع بنے۔ انھوں نے شکارنامے کا استعمال واقعہ نگاری کے لئے کیا اور ہجو یہ مثنویوں کو صرف شخصی ہجو تک محدود نہ رکھا بلکہ مکان، برسات، جھوٹ اور دنیا کو موضوع ہجو بنایا۔ مذمت کذب میں سرکاری دفاتر کی بدنظمی اور رشوت خوری کی انھوں نے جم کر مذمت کی۔ اس کے علاوہ وہ اپنی غزلوں کی طرح اپنی مثنویوں کو بھی غم عشق واردات عشق اور غم ہجراں سے نہیں بچا سکے۔ ان کے لئے یہ ممکن نہ تھا۔ انھوں نے عمر بھر ناکامیٔ عشق اور غم ہجراں کی لذتوں کا مزہ چکھا۔ عالم عشق میں ان کے تجربات، احساسات وجذبات، مشاہدے ہی ان کی زندگی سرمایہ تھے لہٰذا اگر وہ مثنویاں لکھتے لیکن عشقیہ مثنویاں نہ لکھتے تو خود کے اور صنف مثنوی کے ساتھ ناانصافی کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی ۳۸ مثنویوں میں (۹) عشقیہ مثنویاں شامل ہیں۔

عشقیہ مثنویاں دو طرح کی ہوسکتی ہیں (۱) طویل مافوق الفطرت داستانیں مثلاً سحر البیان، گلزار نسیم، طلسم الفت، لذت عشق وغیرہ اور (۲) سانحات عشق، جس میں قصہ کا پہلو کمزور ہوتا ہے اور واردات قلبی کی کسک بیان کرنے پر زور دیا جاتا ہے۔ میر (اور مرزا شوق و داغ وغیرہ) کی مثنویاں اسی ضمن میں آتی ہیں۔ اگرچہ میر سے پہلے سراج اورنگ آبادی، میر جعفر وغیرہ خالص عشقیہ مثنویاں لکھ چکے تھے لیکن میر کی عشقیہ مثنویاں کئی حیثیت سے اہم ہیں ان کی عشقیہ مثنویاں اپنے درد و اثر اور سوز و گداز کی وجہ سے کافی متاثر کرتی ہیں۔ دراصل بنیادی طور پر میر ایک غزل گو شاعر ہیں۔ ایک ایسا شاعر جس کی غزلوں میں ناکامی، محرومی، غم و یاس کی تڑپ اس شدت سے موجود ہے جو کسی دوسرے کے کلام میں نہیں اس لئے جب یہ شاعر مثنوی لکھنے بیٹھا تو اس عشق کی داستان کو کیسے بھول پاتا جس نے تا عمر اسے خون کے آنسو رلائے اور اس کی پوری شاعری، پوری زندگی کو گویا لہولہان کرکے رکھ دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی مثنویوں میں غزل جیسی حسن و عشق کی معرکہ آرائیاں موجود ہیں۔ بقول گیان چند جین۔ میر کے یہاں عشقیہ مثنویاں غزل سے لڑنے لگتی ہیں۔ غزل کا عاشق میر کی مثنوی کا ہیرو بن جاتا ہے۔ اپنی مثنوی میں میر نے عشق میں افسانے کا عنصر داخل کرکے مثنوی کو سرگذشت کے بجائے غیر شخصی کر دیا ہے۔ میر کی مثنویوں کی منشا، عشق کی ہمہ گیری اور جہاں سوزی کا بیان کرنا ہے۔ ان کی یہ مثنویاں واقعہ نگاری، جذبات نگاری اور زبان و بیان کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ اپنے حقیقت پسندانہ بیان اور اپنے عہد کے سیاسی، سماجی اور معاشی احوال کی عکاسی ہونے کی وجہ سے اردو کی بہترین مثنویوں میں شمار ہوتی ہیں۔ اپنے دور کی مثنویوں کے برخلاف یہ عریانیت سے پاک وصاف ہیں اور اس قدر پراثر ہیں کہ حالی جیسا نقاد اور ادیب جو ہمیشہ عشقیہ غزلوں اور عشقیہ شاعری کے خلاف رہا میر کی عشقیہ مثنویوں کی تعریف کئے بغیر نہ رہ سکا۔ میر کی عشقیہ مثنویوں پر حالی کے تاثر کچھ اس طرح رہے ہیں:

"اگرچہ میر کی مثنویوں میں قصہ پن بہت کم پایا جاتا ہے انھوں نے چند صحیح یا صحیح نما واقعات بطور حکایت کے سیدھے سادے طور پر بیان کئے ہیں مگر جتنی میر کی مثنویاں ہم نے دیکھی ہیں وہ سب نتیجہ خیز اور عام مثنویوں کے برخلاف بے شرمی و بے حیائی کی باتوں سے پاک ہیں۔"

میر کی جو ۹ مثنویاں ہمارے سامنے ہیں ان کا مختصر تعارف مندرجہ ذیل سطور میں پیش ہے۔

(۱) جوش عشق
(۲) خواب وخیال
(۳) معاملات عشق
(۴) اعجاز عشق
(۵) جوان وعروس
(۶) مثنوی عشقیہ
(۷) دریائے عشق
(۸) شعلۂ عشق
(۹) مور نامہ

(۱) **جوش عشق**: اس مثنوی میں کوئی کہانی نہیں، کوئی

داستان نہیں اس میں صرف آگرہ چھوٹنے اور اس کے سبب سے آگرہ میں اپنے معشوق کے چھوٹ جانے کے درد کا احساس نظم کیا گیا ہے۔ جوش عشق کی محبوبہ بے وفائی نہیں کرتی اس لئے کہ وہ اپنے مزاج ہی سے باوفا ہے یا اس لئے کہ عشق کی اس منزل سے جہاں اکثر محبوبائیں بے وفائی کرتی ہیں پہلے ہی میر کو شہر بدر ہونا پڑا۔ اس کی تفصیل تو مثنوی میں نہیں لیکن مثنوی میں بے وفائی کی شکایت نہیں ہے۔ اس میں ہجر سے قبل کا احوال ہے۔ جوش عشق کی محبوبہ کا سراپا میر کے دل و دماغ پر آگرہ چھوٹنے کے بعد بھی چھایا رہا یہاں تک کہ اس مثنوی میں انھوں نے اپنی محبوبہ کا سراپا بھی بیان کیا مگر کس پردہ داری اور احتیاط کے ساتھ کہ یہ احساس نہیں ہوتا کہ سراپا بیان کیا جارہا ہے۔ اسی خوبی کو دیکھتے ہوئے حالی ان کی عشقیہ مثنوی کے مداح رہے ہیں۔

مثنوی میں زبان کی سادگی، شگفتگی اور پختگی پائی جاتی ہے مثلاً ترک وطن اور محبوب سے فراق کے احساس کو اس طرح پیش کیا گیا ہے۔

بارے سفر کا عامل ہو کر	حُبِّ وطن کو جی سے دھو کر
رخصت کو اس پاس بھی آیا	جلنے کے تئیں اور جلایا
وقتِ وداع قیامت گزرا	سر سے آب حسرت گزرا

(۲) خواب و خیال

میر کو آگرہ چھوٹنے کا رنج ہمیشہ ستاتا رہا۔ اگرچہ اس درد کو میر نے جوش عشق میں بیان کیا ہے لیکن خواب و خیال اسی سلسلہ کی دوسری کڑی ہے۔ جوش عشق میں جیسا کہ سطور بالا میں ذکر کیا گیا ہے، ہجر کے پہلے کے واقعات بیان کئے گئے ہیں جبکہ خواب و خیال میں دوران ہجر کے واقعات نظم کئے گئے ہیں اس میں درازئ ہجر کے بھیانک اور وحشت ناک اثرات کا نقشہ کھینچا گیا ہے خواب و خیال کی محبوبہ بھی وہی ہے جو جوش عشق کی۔ اس کی جدائی کا بیان اس مثنوی میں بھی ہے۔ محبوبہ سے جدائی کا سبب بھی وہی آگرہ سے ہجرت ہے لہٰذا اس ترک وطن کا اس مثنوی میں بھی ذکر کیا گیا ہے۔ سہ

چلا اکبرآباد سے جس گھڑی	در و بام پر چشم حسرت پڑی
کہ ترک وطن پہلے کیوں کر کروں	مگر ہر قدم دل کو پتھر کروں

ظاہر ہے کہ معاملات عشق کی محبوبہ اور عاشق دونوں پہلے سے شادی شدہ ہیں میر اس محبوبہ کے ساتھ خوب عیش کرتے ہیں اس کے ساتھ سفر کا بھی انھیں موقع ملتا ہے درمیان میں صرف ایک بار انھیں اس سے جدا ہونا پڑتا ہے لیکن تقدیر پھر وفا کرتی ہے اور دونوں پھر معاملات عشق میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ اس مثنوی میں میر نے سات معاملوں کو بیان کیا ہے۔ آخری معاملہ میں جی بھر کے عیش کرنے کے بعد پھر وہ اپنی محبوبہ سے جدا ہو جاتے ہیں اور اس طرح مثنوی اپنے اختتام کو پہونچتی ہے۔

(۳) معاملات عشق: میر کی یہ تنہا عشقیہ مثنوی ہے جس میں وصال کی خوشی ہے اور ہجر کا مختصراً ذکر بھر ہے۔ اس میں انھوں نے اپنی محبوبہ کا سراپا بھی بیان کیا ہے۔ مثنوی کی فضا خوشگوار ہے ان کی دوسری مثنویوں کی طرح اس میں افسردگی، اداسی اور گھٹن نہیں اس کا لب ولہجہ بھی دھیما ہے۔ زبان بھی بڑی شستہ ہے۔ یہ قصہ لنسنگ کیتھل ضلع کرنال سے متعلق ہے جس کا ذکر بھی مثنوی میں کیا گیا ہے۔

ہر چند کہ اس میں وصال کی خوشیاں ہیں مگر عشق کی حقیقت اور اہمیت کو میر خوب سمجھتے ہیں۔ جیسا کہ انھوں سنے اس مثنوی میں تحریر کیا ہے۔

کچھ حقیقت نہ پوچھو کیا ہے عشق	حق اگر سمجھو تو خدا ہے عشق
عشق عالی جناب رکھتا ہے	جبرئیل و کتاب رکھتا ہے
عشق نے چھاتیاں جلائی ہیں	آگیں کس کس جگہ لگائی ہیں
خستۂ عشق کچھ نہ میر ہوئے	بادشہ عشق میں فقیر ہوئے

(۴) اعجاز عشق

یہ مثنوی میر کی ابتدائی مثنویوں میں سے ایک مثنوی قیاس کی جاتی ہے کیونکہ میر کی اچھی مثنویوں کی طرح اس کا آغاز توصیف عشق سے نہیں ہوتا۔ یہ کسی راوی کے سنائے ہوئے قصہ پر مبنی ہے

اس قصہ کے بعد۔ میرؔ سیر کرتے ہوئے ایک شہر میں پہونچے تو وہاں ایک خوبصورت نوجوان محو فریاد تھا۔ پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ عشق کا ستایا ہوا ہے۔ اپنی محبوبہ تک اپنے حالِ زار کی خبر پہونچانے کا فریادی ہے۔ میرؔ نے اس کی مدد کا وعدہ کیا اور اسکی محبوبہ کی قیام گاہ پر خبر دینے کی غرض سے پہونچے خبر سن کر اس نے خفا ہوکر جواب دیا کہ جو عاشق سر راہ نالے کرتا پھرتا ہے اس کا مر جانا ہی بہتر ہے۔ واپس آکر نوجوان کو جب یہ جواب سنایا تو وہ سنتے ہی بے جان ہوکر زمین پر گر گیا۔ واپس محبوبہ کو جاکر یہ خبر سنائی اور اس کے بعد دس قدم بھی نہیں چلے تھے کہ گھر کے اندر سے ماتم کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ نوجوان کی خبر سن کر محبوبہ نے بھی دم توڑ دیا تھا۔

اگرچہ اس میں کوئی خاص کہانی نہیں اور محبوبہ کے سراپا پیش کرنے کی کوئی گنجائش نہ تھی لیکن میرؔ نے یہ موقع تلاش کرلیا جب میرؔ محبوبہ کے گھر نوجوان کے حالِ زار کی اطلاع دینے گئے تو دروازہ پر محبوبہ نکل آئی۔ اسی بہانے سے انھوں نے اس محبوبہ کا سراپا بیاں کردیا۔

قد و قامت اس کا کروں کیا بیاں — قیامت کا ٹکڑا ہوا تھا عیاں
اگر ابرو اسکی جھک جاتی تھی — مہ نو کی گردن ڈھلک جاتی تھی
اسی بت کا ہر اک تئیں ذکر ہے — خدا کو خدائی کی اب فکر ہے

(۵) جوان و عروس

انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ میں مثنویاتِ میرؔ کے نام سے ایک مجموعہ ہے جس میں ایک مثنوی کے اوپر ایک کونے میں "مثنوی تصنیف میرؔ صاحب" لکھا ہے اور اس کے آخر میں میرؔ کا تخلص بھی ہے۔ مثنوی کا کوئی عنوان نہیں لیکن موضوع کی رعایت سے اسے "جوان و عروس" کے نام سے جانا جاتا ہے۔

اس مثنوی میں ایک ایسے نوجوان کی کہانی ہے جو کسی شہر کی ایک سرائے میں قیام کے دوران بیمار پڑ گیا۔ دوا نے کوئی کام نہیں کیا۔ آخر کار دوا چھوڑ کر دیوانہ وار رہنے لگا۔ اتفاق سے اس سرائے میں ایک قافلہ قیام پذیر ہوا۔ جو ایک پری زادی کو شہر میں شادی کی غرض سے لے کر آئے تھے اس لڑکی کے والد کا انتقال ہو چکا تھا۔ شادی کی تیاری ہوئی۔ لڑکی نے مہندی لگائی اور اپنے کمرے کی دیوار پر اپنے مہندی لگے ہاتھوں کی چھاپ لگا دی نوجوان اس مہ وش پری پر دیکھتے ہی شیدا ہو چکا تھا لڑکی شادی کے لئے چلی گئی۔ اس کے خالی کمرہ میں اس نوجوان کو ایک دن مہترانی نے یہ کہہ کر بھیج دیا کہ میں تمہارا کمرہ صاف کر دوں بہت گندہ ہو گیا ہے۔ نوجوان اس حسینہ کے ہاتھوں کی چھاپ دیکھ کر بے قابو ہوگیا اور وحشت عشق نے ایسا زور مارا کہ نوجوان نے اپنی جان دے دی۔ ادھر شادی کے بعد واپسی میں اس مہ جبین گے اپنے شوہر سے ضد کی کہ وہ اس سرائے میں رک کر اپنے شہر جائیں گے۔ وہ سرائے میں ٹھہرے۔ لڑکی نے مہترانی سے نوجوان کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے اس کی موت کی خبر لے سنائی۔ اس نے مہترانی سے نوجوان کی قبر تک پہونچانے کی گذارش کی ضد کرنے پر اس نے قبر تک اسے پہونچایا مہترانی نے دیکھا کہ اس لڑکی کے قبر تک پہونچتے ہی قبر شق ہو گئی۔ وہ حسینہ بھی قبر میں سما گئی۔ قبر دوبارہ بند ہو گئی۔ مہترانی نے یہ واقعہ اس لڑکی کے شوہر کو سنایا تو اس نے قبر کھدوائی لاشیں نکلوائی گئیں مگر دونوں لاشیں اس قدر ایک دوسرے میں ضم ہو گئی تھیں کہ ایک دوسرے سے علاحدہ نہ کی جاسکیں اور مجبوراً انھیں دوبارہ اسی قبر میں اسی طرح دفنا دیا گیا۔ اس کے بعد اس دوشیزہ کا شوہر کہیں روپوش ہو گیا۔

اس مثنوی کی زبان میں روانی کی کمی اور مصرعوں کی ڈھیلی بندش سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ میرؔ کی ابتدائی مثنویوں میں سے ہے۔ میرؔ نے اپنی دوسری مثنویوں کی طرح اس میں بھی دوشیزہ کا سراپا بیان کیا ہے اور عشق کے اوصاف بھی بیان کئے ہیں نوجوان کے ہجر کا بیان بھی بہت فطری انداز میں کیا گیا ہے۔

مثنوی کے اختتام پر عشق کے بارے میں میرؔ کہتے ہیں کہ ؎

یہ ہے میرؔ وہ عشق خانہ خراب — کہ جی جسنے مارے ہیں یاں بے حساب
محابا کسو سے اسے کچھ نہیں — رہا ہے محابا سدا ہر کہیں

---

(۶) مثنوی عشقیہ

اس مثنوی میں گجرات کے ایک خوبرو متقی افغان پسر کی عشق کی کہانی نظم کی گئی جو بالکل بھی حسن پرست نہ تھا۔ ایک روز سرِ راہ ایک شادی شدہ ہندو عورت کو دیکھا تو اس کا شیدائی ہو گیا۔ عورت بھی اسے جی دے بیٹھی۔ وہ دونوں صرف ایک دوسرے کو دیکھتے۔ نگاہوں سے عشق کے پیغام آتے جاتے مگر آپس میں بات چیت نہ ہوتی۔ کچھ دن بعد اس نازنین کا شوہر بیمار پڑا اور اس کا انتقال ہو گیا جب وہ ستی ہونے چلی تو افغان پسر کو معلوم ہوا اور وہ اس نازنین کے ساتھ چتا کی آگ میں کود گیا۔ عورت تو جل کر راکھ ہو گئی مگر افغان پسر کو نیم سوختہ حالت میں بچا لیا گیا۔ لوگوں نے اس کے گھر تک اس کے چلنے کی سکت نہ پا کر اسے ایک پیڑ کے نیچے لٹا دیا جہاں وہ شام تک لیٹا رہا۔ شام کو دیکھا کہ نازنین اس کی طرف خراماں خراماں آ رہی ہے۔ وہ آئی اور اسے اس طرف لے گئی جہاں اسے جلایا گیا تھا۔ اس کے بعد دونوں کا کسی کو سراغ نہ ملا۔

اس مثنوی کی ابتدا میں عشق کے اوصاف میں پچاس اشعار ہیں۔ یہ اشعار عشق کی ہمہ گیری اور جہاں سوزی کا بے نظیر نمونہ ہیں:

بہت عشق میں لوگ روگی ہوئے　　　بہت خاک مل منہ پہ جوگی ہوئے
کیا عشق نے ترک صوم و صلوٰۃ　　　گئے اہلِ مسجد سوئے سومنات

کوئی ہوش میں اپنے رہتا نہیں
ہر اک چپ ہے کچھ کوئی کہتا نہیں

(۷) دریائے عشق

اس مثنوی میں بادشاہ اورنگ زیب کے ناظم بنگال شائستہ خاں کے ایک قاصد کی سرگذشت بیان کی گئی ہے جو مثنوی کی کہانی کے مطابق بنگال سے تحفے لے کر شاہی دربار کی جانب روانہ ہوا اور راہ میں ایک ہندو نازنین کو دیکھ کر اس پر ایسا فریفتہ ہوا کہ سب کچھ بھول کر اس کے در پر بغیر کچھ کھائے پیئے یوں ہی پڑا رہا۔ ہندؤں میں اسے بہت برا سمجھا جاتا تھا کہ کوئی ان کے در پر فاقے سے مر جائے لہٰذا اس قاصد سے فاقہ کشی کا سبب پوچھا گیا اس نے یہ شرط رکھی کہ جب وہ نازنین خود اپنے ہاتھوں سے اسے کھانا کھلائے گی تبھی وہ کھائے گا۔ پہلے تو اس لڑکی کے گھر والے۔ والدین اپنی ہی لڑکی پر خفا ہوئے لیکن جب اس نے اس نوجوان قاصد سے اپنی ناپسندگی جتائی تو والدین کا غصہ ٹھنڈا ہوا لیکن جب وہ فاقہ کش ان کے در سے نہ ہٹا تو والدین نے اپنی بیٹی کو مجبور کیا کہ وہ اسے اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلا دے تاکہ ان کے در پر ایک فاقہ کش کی موت سے ان کے ساتھ کوئی انہونی نہ ہو جائے۔ لڑکی نے کھانا کھلایا۔ لڑکی کے دل میں بھی اس کے لئے محبت پیدا ہوئی۔ کچھ دن بعد وہ لڑکی تیرتھ کے لئے ناؤ پر بیٹھ کر اپنی سہیلیوں کے ساتھ روانہ ہوئی۔ عاشق بھی ساتھ ہو لیا۔ اتفاق سے دریا میں لڑکی کا جوتا گر گیا۔ عاشق جوتا تلاش کرنے کے لئے دریا میں کود گیا اور وہیں غرقاب ہو گیا۔ لڑکی سوگواروں کے ساتھ تیرتھ تو چلی گئی مگر واپسی میں اسی مقام پر اس نے بھی اپنی جان دے دی۔ غوطہ خوروں نے جال ڈالا اور لاش تلاش کی تو دونوں لاشیں چپاں نکلیں۔ دونوں کو جدا کر کے پھونکنے کا ارادہ ہوا تو مسلمانوں نے اس کا علم ہونے پر آ کر مخالفت کی۔ حاکم تک بات پہونچنے پر دونوں کو ایک قبر میں دفن کر دیا گیا۔ رات کو لڑکی کے گھر والوں نے قبر کھود کر لڑکی کو الگ کرنا چاہا لیکن چہرے پر خون کا فوارہ پھوٹ پڑا مگر دونوں کو الگ نہ کیا جا سکا۔ گھبرا کر دونوں کو اس ایک قبر میں دوبارہ دفن کر دیا گیا۔

اسی قصہ پر اور دوسری مثنویاں بھی دیگر شعرا نے نظم کی ہیں لیکن میر کی مثنوی اپنی الگ اہمیت کی حامل ہے۔ اس مثنوی کی زبان طرزِ بیان، عشق کا مثالی تصور، عاشق کی فریاد میں درد گویا یہ میر کی شاہکار مثنوی تسلیم کی جاتی ہے اس کے کئی اشعار زباں زدِ عام ہو چکے ہیں۔ مثلاً ؎

عشق ہے تازہ کار تازہ خیال　　　ہر جگہ اس کی اک نئی ہے چال
دل میں جا کر کہیں تو درد ہوا　　　کہیں سینے میں آہ سرد ہوا
کہیں آنکھوں سے خون ہو کے بہا　　　کہیں سر میں جنون ہو کے رہا
کشش اس کی ہے ایک اعجوبہ　　　ڈوبا عاشق تو یار بھی ڈوبا

(۸) شعلۂ عشق

شعلۂ عشق میرؔ کی دوسری بہترین مثنوی ہے اس کا نام کہیں کہیں شعلۂ شوق بھی ہے میرؔ کے دیوان کے قدیم ترین نسخۂ حیدرآباد میں اس کا نام شعلۂ شوق ہے پھر بھی اس مثنوی میں مستعمل الفاظ کو دیکھتے ہوئے اسے شعلۂ عشق کے عنوان سے پہچانا جاتا ہے۔

اس مثنوی میں محمد شاہ کے عہد میں پٹنہ کے محلہ چھوٹی پٹن دیوی کے باشندہ محمد حسن کے عشق کی داستان بیان کی گئی ہے وہ نوجوان فارسی اور بھاشا کا ماہر تھا ایک صبح گنگا کے کنارے شام سندر نام کی ایک مہاجن کی لڑکی پر نوجوان کی نظر پڑی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو کیا دیکھا کہ دل دے بیٹھے۔ محمد حسن نے اپنا نام پرسرام رکھ لیا اور پنڈت کے لباس میں مہاجن کے گھر آنا جانا شروع کیا اسی اثنا میں کسی کے ساتھ شام سندر کی شادی طے ہوگئی۔ شادی کا پنڈت خود پرسرام تھا۔ شادی کے وقت شام سندر کے گھر میں آگ لگ گئی۔ پرسرام کھڑکی کے راستے شام سندر کو لے کر بھاگ نکلا۔ لوگ سمجھے شام سندر جل کر مر گئی ہے۔ پرسرام لے اپنے گھر لے گیا اور اس سے نکاح کر لیا۔ اس کے بعد شام سندر کو اس کے گھر واپس لانا چاہتا تھا مگر وہ تیار نہ ہوئی۔

ایک دن پرسرام یعنی محمد حسن ایک میلے سے واپس لوٹ رہا تھا کہ کشتی الٹ گئی یہ سن کر شام سندر نے جان دے دی مگر محمد حسن صحیح سلامت گھر واپس آ گیا۔ بیوی کی موت کی خبر سن کر وہ بدحواس رہنے لگا۔ دریا کے کنارے ایک رات ایک تیز و تند روشنی آسمان سے اترتی دکھائی دی جو "حسن حسن" پکار رہی تھی۔ محمد حسن نے جب سنا تو کاغذ پر اپنی سرگذشت لکھ کر اسے صدری کی جیب میں رکھ لیا اور دوستوں کے ساتھ کشتی سے دوسرے کنارے کی طرف چلا دوستوں نے دیکھا کہ وہ شعلہ آسمان سے اترا اور حسن حسن پکارنے لگا حسن تیزی سے شعلہ کی جانب لپکا اور اوجھل ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد سطحِ آب پر دو تیز روشنیاں "حسن شام سندر، حسن شام سندر" کہتی ہوئی ایک دوسرے کی طرف بڑھیں اور ایک دوسرے میں سما گئیں اس وقت سارا دریا منور ہو گیا جو آہستہ آہستہ پھر تاریک ہو گیا اور پھر نہ روشنی دیکھنے میں آئی نہ حسن کی لاش بعد میں صدری کی جیب سے وہ خط ملا کہتے ہیں یہ خط حقیقت میں صدری میں رکھا ہوا ملا تھا جس میں سارے واقعات رقم تھے۔ اس سے متعلق ایک چھوٹا سا محلہ چوک کے پاس باڑے کی گلی کے نزدیک سندر باڑہ کے نام سے موجود ہے جو اب تک مہاجنوں سے آباد ہے اس لئے بعض لوگ اسے ایک سچی کہانی مانتے ہیں یہ کہانی فارسی میں بھی شعلۂ عشق سے قبل نظم کی جا چکی ہے۔

اس مثنوی میں ابتدا میں میرؔ نے محبت کی اہمیت کو اس انداز میں بیان کیا ہے۔

محبت نے ظلمت سے کاڑھا ہے نور
نہ ہوتی محبت نہ ہوتا ظہور
محبت ہی اس کارخانے میں ہے
محبت سے سب کچھ زمانے میں ہے

مثنوی میں عشق کی تباہ کاری کا ذکر بھی ہے۔ حسن کی زندگی بھی عشق میں فنا ہو گئی۔ میرؔ کہتے ہیں۔

بہت جی جلائے ہیں اس عشق نے
بہت گھر لٹائے ہیں اس عشق نے

(۹) مور نامہ

اس مثنوی کا قصہ بھی عجیب و غریب ہے جس میں ایک مور ایک حسین رانی پر عاشق ہو جاتا ہے رانی بھی مور سے عشق کرنے لگتی ہے کہتے ہیں عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتا۔ رانی اور مور کے عشق کی بات راجہ تک پہونچ گئی۔ راجہ نے مور کو قتل کرنے کی سازش کی لیکن رانی کو علم ہو گیا اور اس کے اصرار پر مور اڑ کر جنگل میں چلا گیا۔ راجہ کو جاسوسوں نے خبر دی کہ مور فلاں جنگل میں ہے راجہ فوج لے کر مور کو مارنے کے لئے جنگل پہونچا مگر وہاں اس کے پہونچنے قبل ہی مور کے سوزِ عشق سے جنگل میں آگ لگ گئی اور مور بھی جل کر مر گیا۔ مور کی موت کی خبر سن کر رانی ستی ہو گئی۔

یہ ایک حیوان اور انسان کے عشق کی کہانی ہے میر نے ان دونوں کے عشق کو دو انسانوں کے درمیان معاشقہ کی شکل میں پیش کیا ہے۔ اس میں اوصاف عشق میں اہم اشعار شامل ہیں عشق کے بارے میں کچھ اس طرح اظہار کیا گیا ہے۔

نظم کل کا ڈول ڈالا عشق نے
انس سے انسان نکالا عشق نے
وہ حقیقت سب میں یاں ساری ہوئی
ہے گی ہر شے عشق کی ماری ہوئی
چار سو ہنگامہ آرا عشق ہے
عشق کیا کہئے کہ کیا کیا عشق ہے

مثنوی کے آخر میں عشق کی جہاں سوزی کا بیان اس طرح کیا گیا ہے۔

عشق سے کیا میر اتنی گفتگو
خاک اڑا دی عشق نے ہر چار سو
طائر و طاؤس و حیواں اڑ رہے
سب کھنچے کیا عشق کی کوئی کہے
یہ فسانہ رہ گیا عالم کے بیچ
باز ماندہ ان کے ہیں سب غم کے بیچ

مثنوی کی زبان صاف ہے۔ مور کو انسان پر عاشق کرا کے میر نے ایک جدت دکھائی ہے۔

میر کی عشقیہ مثنوی کے مطالعہ سے ان کی مثنویوں کی مندرجہ ذیل خصوصیات سامنے آتی ہیں۔

(۱) اپنی فطرت میں یہ مثنویاں ایک طویل قطعہ نما غزلیں ہیں ان کی مثنوی کا ہر شعر غزل کا مطلع معلوم ہوتا ہے۔

(۲) ان کا عشق اس ارض کا نہیں۔ ان میں عاشق یا معشوق کوئی بے وفائی نہیں کرتا اور دونوں ہی ایک دوسرے کو پانے کے لئے جان کی بازی لگا دیتے ہیں۔

(۳) ان کی مثنویوں کے قصے سادے ہیں۔ مافوق الفطری قصوں کو نظم کیا گیا ہے ان میں بیشتر ایسے قصے ہیں جو ان سے پہلے ہی نثر یا نظم کی شکل میں اردو یا فارسی میں لکھے جا چکے تھے گویا اس طرح کی داستانیں اس وقت عام تھیں اور عوام کی دلچسپی کا موضوع تھیں۔

(۴) میر نے عام طور پر سیدھے سادے پلاٹ ہی کا اپنی مثنویوں کے لئے انتخاب کیا ہے اور کچھ مثنویوں میں تو کوئی پلاٹ نہیں ہے۔ جوش عشق، خواب و خیال کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ میر کی مثنویوں میں پلاٹ کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔

(۵) عشق کا انجام ہمیشہ المیہ ہے یہاں تک کہ "خواب و خیال" میں بھی مثنوی کا اختتام جدائی پر ہوتا ہے ان کی ہر مثنوی دکھ سے شروع ہوتی ہے اور دکھ پر ہی ختم ہو جاتی ہے۔

(۶) ان کی مثنوی کی ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ اس میں عام طور پر عاشق پہلے مرتا ہے اور محبوبہ بعد میں مرتی ہے شعلۂ عشق کے علاوہ عاشق کی موت معشوقہ سے پہلے ہو جاتی ہے۔

(۷) ہر مثنوی میں موت کے بعد وصل ہوتا ہے عام طور پر مرنے کے بعد عاشق اور معشوقہ کے جسم ایک دوسرے میں ایسے ضم ہو جاتے ہیں کہ لاکھ کوششوں کے بعد ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتے یہ کمال عشق اور وصال کی معراج ہے۔

(۸) میر کی مثنویوں میں عریانیت نہیں ہے جس کی تعریف حالی جیسے نقاد نے بھی کی ہے۔ معاملات عشق میں ضرور کچھ عریانیت پائی جاتی ہے مگر وہ فطری ہے۔ وصال کے مضامین نظم کرنے میں اتنی چھوٹ تو میر کو ملنی ہی چاہئے۔

(۹) شادی شدہ عورتوں سے عشق کی داستانیں نظم کرنے میں میر نے پرہیز نہیں کیا اور وہ بھی کبھی کبھی ہندو عورتوں سے۔ اس پر ناقدوں نے انگشت نمائی بھی کی ہے لیکن شاعر صرف حال یا ماضی کو نہیں دیکھتا۔ اسکی نظر مستقبل پر بھی ہوتی ہے وہ ایسی پیشینگوئیاں کرتا ہے جس پر اس وقت کوئی یقین نہیں کرتا اور کبھی کبھی بعید القیاس کہہ کر خارج کر دیتا ہے لیکن مستقبل میں وہی سب باتیں سچ ہو جاتی ہیں۔ آج شادی شدہ عورتوں کے ساتھ شادی شدہ مردوں کے معاشقوں کے قصے ہندؤں

(بقیہ صہ ۱۲۸ پر)

شاہد کمال
۶۸۱/۲۵۰ نزد سینٹ جانس انٹر کالج مفتی گنج لکھنؤ

میر اور قصیدہ اپنے تاریخی تناظر میں

معاصر اردو ادب میں میر اور قصیدہ کے تعلق سے بہت کچھ لکھا جا چکا ہے یہ الگ بات ہے کہ آج ہم جو کچھ لکھ رہے ہیں اس میں ہمارے قلمی اجتہاد سے زیادہ تقلیدی عناصر کار فرما ہوتے ہیں شاید ابھی تک ہم اپنے آپ کو شخصی قدامت پرستی کے تسلط سے آزاد نہیں کرا پا رہے ہیں اس ادبی ہجا جرت کے دور میں ہم کب تک ذہنی جلاوطنی کی زندگی گزاریں گے یہ کچھ وثوق سے نہیں کہا جا سکتا۔ آج ہمارے سامنے جو سب سے بڑا مسئلہ ہے وہ یہ کہ کسی عظیم فنکار کی تخلیقات کی معنوی ابعاد و جہات اور اس کے رموز و اسرار کی صحیح تفہیم و ترسیل کیسے کی جائے جو ایک طالب علم کے ادبی اور اس کی ذہنی بصیرت کے لئے خط مستقیم کی حیثیت رکھتا ہو تاکہ آگے چل کر اس کا علمی یقین کسی ادبی سفاہت کا شکار نہ ہو سکے ضروری ہے کہ اس موضوع پر سنجیدگی سے غور کیا جائے تاکہ لاشعوری طور پر بھی ہم کسی ایسے عمل کے مرتکب نہ ہوں جس کا تاوان نو واردان ادب سے وصول کیا جائے جیسا کہ یہ بات ہم پر واشگاف ہو چکی ہے کہ ان حساس پہلوؤں سے بے نیازی اور بے اعتنائی کے سبب اس سے پہلے بھی بہت سے تخلیق کاروں کی تخلیقات کی تفہیم کے سلسلے میں ہم نے کہیں نہ کہیں علمی ارتدادیت کے ارتکاب میں بڑی فراخ دلی سے کام لیا ہے: اب چاہتے ہوئے بھی جس کا احتساب ممکن نہیں ہے میر جیسا عظیم شاعر بھی کہیں نہ کہیں ان ہی بے نیازیوں کا شکار رہا ہے ایسے ہی نہ جانے اور کتنے عظیم شعراء و فنکار ہیں لیکن آج ذرا سی ادبی و ذہنی بیداری کی وجہ سے میر شناسی کے بہت سے امکانات واضح اور روشن ہو چکے ہیں جس کے ذریعہ آنے والے کے لئے ایک امید خیز اور حوصلہ آمیز راستہ استوار ہوتا دکھائی دے رہا ہے۔

اردو زبان و ادب کا ایک مستقل ادبی وجود ہے جسے اب نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے یہ الگ بات ہے کہ اس زبان نے بہت ہی کم عرصہ میں وہ مسافت طے کی جس کی وجہ سے آج دنیا کی چند بڑی زبانوں کی صف میں اس کی موجودگی کا اندراج مستند ہو گیا ہے یہ ایک حیرت انگیز کارنامہ سے کم نہیں۔

اردو ادب کی لسانی جمہوریت اور اس کے مواصلاتی رسوخ کی اس سے بڑی مزاجی ہم آہنگی اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس کے دامن میں موجود کثیر سرمایہ اس کی اپنی ذاتی ملکیت نہ ہونے کے باوجود بھی اسے اس کے تصرف کا پورا پورا حق حاصل ہے۔

یہ ایک اعتراف شدہ حقیقت ہے کہ اردو ادب میں جتنی بھی اصناف سخن ہیں وہ کسی نہ کسی زبان سے مستعار ہیں اور آج کی دور آملات کا یہ سلسلہ باضابطہ جاری و ساری ہے۔ ہماری اس ادبی مملکت میں دیگر اصناف سخن کی طرح قصیدہ بھی ایک مہاجر صنف سخن کی حیثیت رکھتا ہے۔

قصیدہ صرف اپنے نسبی اعتبار ہی سے نہیں بلکہ اپنی مجموعی کیت اور عروضی ہیئت و مواد و مضامین کے حساب سے بھی عربی نژاد ہے اگر عربی گرامر کے مطابق قصیدہ کو لغوی اعتبار سے دیکھا جائے تو ذرا سے فرق کے ساتھ اس کے دو الگ الگ معنی مراد ہوتے ہیں۔

لیکن اصطلاحی طور پر قصیدہ اسے کہتے ہیں جس میں شاعر ارادتاً اپنی واردات قلبی کا اظہار براہ راست ایسے مضامین کے ساتھ کرے جس سے سننے اور پڑھنے والوں کو حظ محسوس ہو۔

قصیدہ عربی زبان میں ایک بنیادی صنف سخن کا درجہ رکھتا ہے اگر اسے عربی ادب کا سنگ میل کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ دور جاہلیت کے شعراء نے بھی حصول مراعات کے لئے امراء و سلاطین کی شان میں بڑے بڑے قصیدے کہے ہیں۔ عرب کے اکثر شعراء لوگوں کے درمیان اپنی

علمی وجاہت کے استناد میں قصیدہ ہی کو اپنا بہترین وسیلہ تصور کرتے تھے جس کی سب سے بڑی دلیل "سبعہ معلقات" ہیں۔

قصیدہ صرف اپنے خصوصی حلقۂ ذوق کے درمیان ہی دلچسپی کا سبب نہیں تھا بلکہ اگر عمومی سطح پر دیکھا جائے تو لوگوں کے درمیان اس کی شہرت اور مقبولیت کا خاصا رواج تھا اسے لوگ شرف عزت وافتخار گردانتے تھے اور اس میدان میں ہر کوئی کسی نہ کسی کو اپنا آئیڈیل مانتا تھا یہاں تک کہ اس عمل میں خواتین کی بھی حصہ داریاں مردوں کے شانہ بہ شانہ رہی ہیں۔ عرب کے جاہلیت کے دور میں بازار عکاظ میں باضابطہ مقاصدوں کا اہتمام ہوتا تھا۔

"کورٹ فرنیشلر آلمانی اپنی کتاب "عائشہ لعداز پیغمبر" میں اس بازار کے بارے میں لکھتا ہے "عرب میں ایک قومی میلہ لگتا تھا "عکاظ" عام طور پر اس کو بازار عکاظ کہا جاتا ہے"

بازار عکاظ اسوقت عرب کی عالمی تجارت کی سب سے بڑی منڈی تھی۔ ہر نقطۂ نظر اور ہر مکتبۂ فکر کے لوگوں کا مرکز اجتماع بھی تھا یہاں ہر طرح کے ذوق رکھنے والوں کے لئے عیش و تعیش کے تمام وسائل دستیاب ہوتے تھے عکاظ کے اس میلے میں اتنی سخاوت سے شراب نوشی ہوتی کہ سال بھر پورے عرب میں اتنی شراب نہیں پی جاتی۔ یہاں صرف مرد ہی نہیں عرب، شام، مصر، ماوراء النہر اور ایشیائے کوچک تک کی زیبا ترین عورتیں آتی تھیں۔ اتنی بڑی اجتماع گاہ میں محفل مقاصدہ کا بھی اہتمام ہوتا تھا۔ اور اس مشاعرہ میں شنفرا (عرب کا ایک ڈاکو شاعر) اور لبید جیسے نوجوان شاعر جوان دلوں کی دھڑکن اور لوگوں کے ہیرو ہوا کرتے تھے اور لوگ اپنے محبوب شاعر کے ایک ایک شعر پہ اپنا تن من دھن نچھاور کرنے کے لئے تیار رہتے تھے۔

قصیدہ نگاروں کے حوالے سے جب تاریخ عرب کا مطالعہ کیجئے تو کچھ اہم نام سامنے ابھر کر آتے ہیں۔ نابغہ، اعشیٰ امرالقیس، ابو نواس ابن الرومی، متنبیؔ، حماسہ، ابو تمام، حسان بن ثابت، ابو جندب، فرزدقؔ دعبل اسی طرح اور بہت سے شعراء ہیں جنھوں نے قصیدے کہے ہیں ان کے تذکرے کے بغیر عرب کی قصیدہ نگاری کی تاریخ ادھوری ہے یہی وہ شعراء ہیں جنھیں عربی قصیدہ کے بنیاد گزاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔

استعداد زمانہ وقت اور حالات کے انقلابات کے ساتھ ساتھ اس صنف میں نئے نئے تجربات بھی کئے جاتے رہے ہیں۔

عرب کے ریگستانوں میں جنم لینے والی، صحراؤں کی کھلی فضا میں پروان چڑھنے والی، پہاڑوں پر خیمے طناب کرنے والی، بدوؤں کی آغوش نطق کے گہوارے میں جھولنے والی، اوباش گاہوں میں اپنے ہم مشربوں سے لاف وگزاف کرنے والی، محفل رقص وسرود کی داعیہ اپنے نسلی وجاہت پر تفاخر کرنے والی، عرب کے قبائلی ونسبی شرافتوں کا جھوٹا دم بھرنے والی، میدان جنگ میں رجز خوانی کرنے والی، اس لڑاکو، جھگڑالو اور تملق مزاج صنف نے اپنی اداؤں اور زبان کا وہ جادو چلایا کہ امراء وسلاطین کے دلوں میں جا بیٹھی اور درباروں میں اپنی سحر بیانی کا جلوہ بکھیرنے والی اور اپنی طلیق البیانی کی اجرت میں حسب منشاء داد وتحسین کے ساتھ ساتھ زر وجواہرات بھی وصول کرتی رہی قصیدہ کی ہر دل عزیزی کی اس سے بڑی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔

لیکن جب عرب کی سرزمین پر اسلام کا سورج طلوع ہوا تو یہ اسلام کا کلمہ پڑھ کر مسلمانوں کی صفوں میں آ کھڑی ہوئی اور لوگوں کے دلوں میں حرارت ایمان کی روح پھونکنے کا عمل انجام دینے لگی اور اپنی گرم گفتاری کے ذریعہ مجاہدین اسلام کی رگوں میں لہو بن کر حرارت پیدا کرنے لگی۔ اور دوسری طرف خانقاہوں میں بیٹھ کر عالم انسانیت کو اخوت اور بھائی چارے کا درس دینے کا بیڑا بھی اپنے سر اٹھا لیا۔

جب قصیدہ نے پہلی ہجرت کی تو عرب کی سرحد سے نکل کر ایران کی سرسبز وادیوں میں اپنا پہلا قدم رکھا تو وہاں رودکی، سنائی، انوری، خاقانی، عرفی، فاریابی، قاآنی، نظیری جیسے بلند پایہ شعراء نے بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ بڑھ کر اسے اپنے گلے سے لگایا اور ایران کی آب وہوا نے اس کے مزاجی اشتعالیت کو کافی حد تک اعتدالی کیفیت سے ہمکنار کیا۔ اس کے اندر موجود تمام بدویانہ عادتیں دھیرے دھیرے کرکے ختم ہونے لگیں۔ عرب کے درباری تکلفات کا رنگ پھیکا پڑنے لگا۔ تصنع کے ساتھ ساتھ سنجیدگی وسادگی اور بیجا مبالغہ کے ساتھ سچائی اور حقیقت بیانی نے بھی اپنی جگہ بنائی خارجی مضامین کے ساتھ ساتھ داخلی مضامین نے قصیدہ میں اپنی

جگہ بنانا شروع کی یہ الگ بات ہے کہ قصیدہ میں دلی تاثرات کو بہت کم ثمر آور ہونے کا موقع ملا۔ اس کے برعکس خارجی مضامین کے اظہار کے لیے فارسی ادب میں پہلے ہی سے مثنوی جیسی صنف موجود تھی۔ لہٰذا قصیدے نے وقت اور حالات کے تحت اپنی مصالحت پسندی کا اظہار کرتے ہوئے مثنوی کے ہاتھوں پر بیعت کر لی اب قصیدہ محض دماغ اور علم و فن ہی کی شاعری نہیں رہا بلکہ اسے شوکتِ الفاظ تخیل کی بلند پروازی، صناعی اور شاعرانہ صلاحیتوں کے اظہار کا وسیلہ بھی سمجھا جانے لگا اور قصیدے میں نئے نئے مضامین نئی نئی تشبیہات اور استعارات وضع کئے جانے لگے۔ اچانک اس کے اندر ایک اور نیا انقلاب پیدا ہوا جب شیخ سعدی جیسے شعرا نے اس طرف توجہ فرمائی تو انھوں نے قصیدے کو اخلاقی موضوعات کے لئے منتخب کیا اور سعدی جیسے شعرا نے قصیدے کے حوالے سے اخلاقیات کے اچھوتے گوشے پیدا کئے۔

جب ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کا قیام عمل میں آیا تب تک قصیدے کے اندر بہت بدلاؤ آچکا تھا اب قصیدہ اپنی تیسری ہجرت کے لئے آمادہ تھا۔ وہ ایران کی لالہ زار وادیوں سے نکل کر ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کے دامن میں اپنا خیمہ نصب کرنے کی تیاری کرنے لگا۔ اس بات کا اعتراف کرنے میں ہمیں شرمندگی نہیں ہونی چاہئے کہ قصیدہ نگاری میں ہندوستانی شعرا نے فارسی شعرا کا کھلا ہوا تتبع اور تقلید کی ہے۔

جیسا کہ علی جواد زیدی نے "قصیدہ نگاران اتر پردیش" کے مقدمہ میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔

> "یہ اردو قصیدہ نگاروں کی بدنصیبی تھی کہ انھیں فارسی کے ہندوستانی قصیدہ نگاروں کے جلو میں چلنے کا تاریخی کام سونپا گیا۔ یہ فارسی قصیدہ نگار دورِ انحطاط کی پیداوار تھے ان کے اتباع میں اردو میں جو کچھ لکھا گیا وہ زبان کی ناپختگی اور معاشرتی زوال کی بدولت انحطاط در انحطاط کا نمونہ بن گیا"

اردو میں قصیدہ نگاری نے باضابطہ اپنے سفر کی شروعات دکن اور گجرات سے کی اس لئے کہ اس وقت دلی کو ادبی مرکزیت حاصل نہیں تھی اسکی ایک خاص وجہ یہ بھی تھی کہ دکنی سلطنتوں کی درباری زبان اردو تھی اور وہاں کے امرا و سلاطین بذات خود شاعر بھی تھے۔

قطب شاہی دور کے سلطان محمد قلی قطب شاہ، سلطان محمد قطب شاہ ظل اللہ اور سلطان عبداللہ قطب یہ تینوں سلاطین اپنے عہد کے بلند پایہ شعرا میں شمار ہوتے تھے۔ تاریخی دستاویز سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے باضابطہ قصیدے لکھے ہیں۔ اسی طرح عادل شاہی دور میں سلطان ابراہیم عادل شاہ عاشق اور ہاشمی وغیرہ نے بھی قصیدے لکھے ہیں۔ یہ بات بھی کافی دلچسپ ہے کہ قصیدہ اسلوبیات سطح پر اس کا صوتی آہنگ فارسی ہونے کے باوجود اس میں سنسکرت اور ہندی زبان کے لفظوں کے برجستہ استعمال اور ہندوستانی روایت کی سرایت نے اس کے اندر ایک نیا رنگ پیدا کر دیا۔

قصیدے نے جب سولہویں صدی عیسوی میں شمالی ہند کی طرف رخ کیا تو اس نے اپنا مسکن دلی کو قرار دیا اور وہاں شاکر ناجی، فائز دہلوی اشرف علی خاں فغاں، حاتم، انشاء اللہ خاں انشاء، سودا اور میر تقی میر جیسے عظیم شعرا نے اس صنف سخن میں اپنی زبان دانی کے جوہر دکھائے۔

قصیدے کی ترقی میں دو سب سے بڑی وجوہ یہ بھی رہی ہیں ایک تو درباری سرپرستی اور دوسرے اسلامی کفالت۔ اس لئے کہ کچھ شعرا نے شاہی تقربات اور حصول مراعات کے لئے مبالغہ آمیز اور تصنع آمیز موضوعات کے اظہار کے لئے قصیدہ کو اپنا مقصود نظر بنایا اور کچھ شعرا نے حصول ثواب کے لئے اسلام کی برگزیدہ اور مقدس ہستیوں کو اپنی مدح کا موضوع بنایا۔ اسلام کی روحانی اقدار، بلند اخلاق، تقویٰ و پرہیزگاری کی تعلیم کو اپنا فرض منصبی سمجھ کر قصیدوں کے ذریعہ ان مضامین کو عام کرنے کی بھرپور کوششیں بھی کیں۔

اس مقام پر میر تقی میر کے حالات زندگی کی تفصیلات سے قطع نظر کرتے ہوئے ہم ان کے ادبی اثاثہ کے تعلق سے جاننا چاہتے ہیں۔ ان کی ادبی مملکت کے کل سرمایہ کی تفصیل حکیم عبدالحئی صاحب "تذکرۂ گل رعنا" میں یوں تحریر فرماتے ہیں۔ اقتباس ملاحظہ کریں۔

> "میر صاحب کی تصنیفات کی تفصیل یہ ہے کہ چھ دیوان ریختہ

غزلوں کے ہیں چند صفحات ہیں جن میں فارسی کے علاوہ
اور متفرق اشعار پر اردو مصرع لگا کر مثلث اور مربع کیا ہے
رباعیاں مستزاد چند صفحات، پانچ قصیدے چند مخمس اور
ترجیع بند، شکایت زمانہ میں دو واسوخت، ایک ہفت
بند بہت سی مثنویاں اور ایک دیوان فارسی کا ہے
جس میں دو ہزار شعر ہیں۔ میر صاحب غزل کے بادشاہ
ہیں۔ قصیدے کے مرد میدان نہیں۔ آزاد نے ٹھیک لکھا
ہے کہ ان کے قصیدے کم ہیں اور اسی قدر درجہ میں
کم ہیں۔ واسوخت لاجواب ہیں۔ فارسی میں فغانی یا وحشی
اردو میں میر صاحب کو واسوخت کا موجد تسلیم کیا گیا ہے"

میر تو بنیادی طور سے غزل کے شاعر ہیں لیکن جب بھی قصیدہ نگاری کے حوالے سے گفتگو کی جائے گی تو میر کو قطعی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

اگر ہم اس مقام پر تھوڑی دیر کے لئے میر اور سودا کی قصیدہ نگاری کے تعلق سے اہل قلم کے اجتماعی نظریات کے تناظر میں بات کریں تو یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ویسے تو قصیدہ نگاری کے میدان میں بہت سے شعراء نے زور آزمائی کی لیکن اس کے باوصف قصیدہ نگاری کے اس معرکہ میں اس کی انفرادیت کا تاج سودا ہی کے سر رہا اور قصیدہ نگاری کے اس میدان میں میر کی یاسیت آمیز شگفتہ دلی پر سودا کی ترش مزاجی اور تلخ نوائی نے بازی مار لی ہے۔ اس حوالے سے شاہ میر ادب کے اقتباس ملاحظہ کریں۔ "میتھو ارنلڈ"

"شاعری تنقید حیات ہے۔ میر کی شاعری بدرجۂ اتم اسکی
مصداق ہے۔ ان کی شاعری تمام ظاہری معنوی خوبیوں سے
آراستہ ہے تخیل و محاکات کے بہترین نمونے اس کے
علاوہ دیگر محاسن مثلاً سلاست، صفائی بندش حسن،
لطف و تشبیہہ و استعارہ اور ہر ایک درجۂ کمال پر موجود
ہیں پھر لطف یہ ہیکہ باوجود اس ہمہ گیر تخیل اور قوت اختراع
کی آخری حدود پر پہونچنے کی میر نے حقیقت کو کبھی نظر انداز
نہیں کیا۔ ہر شعر کی تہہ میں ایک عظیم الشان راستی پنہاں ہے
ان کی شاعری کا یہی پہلو ہے جو ان کو دوسرے شاعروں
سے ممتاز کرتا ہے اور اسی کی وجہ سے وہ قصیدہ اچھا نہ
کہہ سکے۔ جس میں تصنع اور مبالغہ کو بہت کچھ دخل ہے
شاید ہی زندگی کا کوئی پہلو ہو جس کی مصوری میر نے
بہترین الفاظ اور موثر ترین پیرایہ میں نہ کی ہو۔ ان کے
اکثر اشعار سہل ممتنع ہیں اور صاف و سادہ الفاظ میں
معانی کا ایک دریا موجزن ہے"

میتھو ارنلڈ اس بات کا اعتراف تو کرتے ہیں کہ میر کی شاعری اپنے ظاہری و معنوی حسن سے آراستہ و پیراستہ نظر آتی ہے۔ ان کے کلام میں وہ تمام چیزیں بدرجۂ اتم موجود ہیں جو انھیں ایک عظیم شاعر کی صف میں لاکھڑا کرتی ہیں لیکن وہ میر کو ایک بڑا قصیدہ نگار تسلیم نہیں کرتے۔

میر کی قصیدہ نگاری کے تعلق سے مولانا عبدالسلام تحریر فرماتے ہیں۔

"اس زمانے میں جو چیز قصیدہ گوئی کا معیار خیال کی جاتی
تھیں ان سے ان کے قصائد خالی ہیں۔ انھوں نے مشکل
زمینوں میں کوئی قصیدہ نہیں کہا دھوم دھام کی تشبیہیں
نہیں لکھی ہیں۔ طولانی قصائد ان کے نہیں پائے جاتے
ان کے یہاں عموماً الفاظ کی شان و شوکت بھی موجود
نہیں قصائد میں ان کی بندشیں بھی چست نہیں ہوتیں"

ان اقتباسات کے ذیل میں اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ کہ بیشتر نقاد میر کی قصیدہ نگاری کے متعلق علمائے ادب کے اجتماعی نظریات اور ان کے معاصر قصیدہ نگار سودا کی بھاری بھرکم آواز سے مرعوب نظر آتے ہیں لیکن یہ بات تہذیب عقل کے منافی محسوس ہوتی ہے۔ حالانکہ میر اور سودا کے شعری التزامات دونوں کے مختلف الطبع ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔ گو یا وہ ایک جادہ کے مسافر ہونے کے باوجود دو الگ الگ منزلوں کے مسافر دکھائی دیتے ہیں۔ ان میں سے ایک کائنات غم ذات کا کوچہ گرد ہے تو دوسرا عشرت کدۂ حیات کا مغنی۔

میر غزل کی طرح سے قصیدہ نگاری میں بھی اپنے مجتہدانہ طرز فکر

بے شعوری طور پر ایک طرزِ جدید کی ایجاد کرنا چاہتے ہیں اور یہ باور کرانے کی کوشش بھی کرتے ہیں کہ دیکھو قصیدہ صرف خانقاہی اور درباری مجلسوں ہی کا نقیب نہیں ہے بلکہ وہ عام انسانی زندگی اور اس کے آداب و معاشرت کا بھی مبشر ہے۔

اپنی اس بات کی مزید توثیق کے لئے میر اور سودا کی قصیدہ نگاری کے تعلق سے اگر عشرت رحمانی کے اس اقتباس کا ذکر کردوں تو غیر مناسب نہ ہوگا۔

"ذوقِ سلیم ہی اس کا اندازہ کرسکتا ہے کہ میر کے لطف روئیدگی اور سودا کے جوش روئیدگی میں کیا فرق ہے سودا کے شعر میں وہی غیر فطری جوش ہے اور میر کے شعر میں فطری لطف۔"

اس سے آگے مزید تحریر فرماتے ہیں:

"میر کے ان اشعار کی پختگی اور روانی بلند سے بلند قصیدہ کی برابری کرسکتی ہے۔ ان کو دیکھتے ہوئے کون کہہ سکتا ہے کہ میر کے قصیدے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ افسوس کہ مطالعہ اور انتخاب کی زحمت ہی گوارا نہیں کی جاتی ورنہ تعداد میں کم سہی درجہ میں کم نہیں۔"

سودا اپنے قصیدوں میں درباری آداب اور شہنشاہی مجالس کے تہذیب کی نمائندگی کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ سودا کے اشعار کا صوتی آہنگ، لفظوں کی نشست و برخاست، اس کا زیروبم، لہجہ کی ظاہری رعونت اور شہنشاہی صاحبت کی جلالت سے سودا کی مزاجی تمکنت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ سودا اپنے لہجہ کے شور و ہنگامے سے لوگوں کو مرعوب کرنے جیسے ہنر سے اچھی طرح واقف ہیں۔

حالانکہ میر کا تعلق بھی درباروں سے رہا ہے اور انھوں نے بھی سودا کی طرح خوشنودی و تبرکات کے لئے نوابین و سلاطین کی مدح میں قصائد لکھے لیکن اس کے برخلاف میر اپنے قصائد میں اسلوبیاتی سطح پر لفظی ہنگامہ آرائی اور لہجوں کے زور و شور سے اجتناب کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ سیدھے سادے لفظوں میں بات کرنا زیادہ پسند کرتے ہیں اور میر کی یہی سادگی ان کے کلام میں تنوع پیدا کر دیتی ہے جو انھیں قصیدہ نگاری کے میدان میں دیگر ممتاز قصیدہ نگاروں سے منفرد رکھتی ہے۔ اس مقام پر ہم میر کے قصیدے کے چند اشعار نقل کرتے ہیں جو انھوں نے تاجدار اودھ آصف الدولہ کی ستائش میں لکھے ہیں۔

ہمارے یار سے صحبت ہو کس طرح در گیر
گرہ میں نالۂ آتش فشاں سو بے تاثیر

سمجھ کے زلف کے کوچس میں پاؤں رکھیو نسیم
کہ نکلے ہے یہیں سے راہ خانۂ زنجیر

جہاں میں اہلِ جہاں کو ہو کشمکش بن کیا
کہ ایک تنگ قفس اور جس میں اتنے اسیر

نہیں تو دیر محبت کی رسم سے آگاہ
کرے ہیں کعبے کے سکاں کی بھی یہاں تکفیر

تمام نالہ ہوں اس بن مگر کہ روزِ نخست
کیا تھا تن کا میرے سودۂ جگر سے خمیر

بسعیٔ باطلِ ناخن بعقدۂ دل کار
بسینہ کوبی زخم، جگر بہ ماتم میر

ایک دوسرے قصیدہ کے بھی چند اشعار ملاحظہ فرمائیں جو انھوں نے نواب آصف الدولہ بہادر کی شان میں کہا ہے۔

خلل پذیر ہوا ہے دماغ خامۂ میر
کہ تیری مدح میں کھولا زبان کو تعقیر

فلک شکوہ ستارہ حشم خدیو جہاں
ترے جلال کو کن لفظوں میں کروں تعبیر

رہے یہ حشمت و جاہ و جلال قدرت و زور
کہ تیرے حکم کے آگے ہے سہل امرِ خطیر

ترے محرر دفتر کا ہے سدا محتاج
جہاں میں شہرۂ عطارد جو ہے فلک کا دبیر

رہے علو مراتب کہ در پہ بار نہ پائے
ہزار بار اگر چرخ مارے چرخ اثیر

رواں ہو صبح کو گر مرکب ظفر پیکر
تو تا بہ شام کرے روم و شام تک تسخیر
کف سخا کہ ترے ریزش کرم کے حضور
گیا ہے قطرہ زناں شرم گیں ہو ابر مطیر

میر صاحب کے مذکورہ اشعار دیکھنے کے بعد یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ اگرچہ ان کا تعلق دربار سے ہے لیکن ان کی طبیعت پر درباری تکلفات و تصنعات کا رنگ بالکل نہیں پایا جاتا حالانکہ اگر لکھنؤ کے تمدن کو اس عہد کے تناظر میں دیکھا جائے تو یہ معلوم ہوگا کہ یہاں کی وضع و قطع، بود و باش آداب و اطوار اور طرز معاشرت کی رگ و پے میں تصنع و تکلف خون بن کر گردش کر رہا تھا۔ گویا ظاہر داری اور دکھاوا یہاں کی تہذیب کا ایک اٹوٹ حصہ بن چکے تھے جس نے تمام شعبۂ حیات کو اپنے زیر نگیں کر رکھا تھا لوگ اسی جدت پسندی اور ظاہری کر و فر پر اپنے آپ کو قربان کئے ہوئے تھے جس کا نمایاں اثر یہاں کے علم و ادب پر بھی نظر آتا ہے لہٰذا ایسے پر تصنع ماحول میں میلان طبع اپنے فطری جوہر سازی کے بجائے ذہنی صنعت کے مظاہرے ہی پر مرتکز ہو کر رہ گئی تھی لیکن اس کے باوجود میر نے تصنع پر سادگی صنعت پر فطرت تکلفات پر حقیقت ہی کو ترجیح دی اور اپنی طبعی خودداری کا ہاتھ اپنے دامن سے نہ جانے دیا۔ طلب و امید کے اس پر پیچ اور بے ہنگم راستے پر آہستہ روی سے چلنے ہی میں اپنی عافیت محسوس کی۔ لہٰذا انھوں نے اس بات کا اعتراف بھی کیا۔ شعر ملاحظہ فرمائیں۔

رہِ طلب میں گرے ہوتے سر کے بل ہم بھی
شکستہ پائی نے اپنی ہمیں سنبھال لیا

ایسا نہیں ہے کہ میر اپنی کسی عملی بے خبری کے نتیجہ میں ایسے اقدام کا ارتکاب کر رہے تھے بلکہ میر شعوری طور پر اپنے ہم عصر شعراء کی روش عامہ کے اتباع سے پرہیز کر رہے تھے کیونکہ وہ اس کے نتیجہ سے واقف تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ اس کا انجام کار کیا ہوگا لہٰذا میر نے وقتی رنگا رنگی اور شور و ہنگامے سے تہی طلبی میں عافیت محسوس کی اور عشق کے اس صراط مستقیم پہ عقل کی رہبری سے زیادہ دل کی قیادت ہی پر قناعت کرتے ہوئے اپنی خوش انجامی کا اعلان بھی کرتے رہے اس حوالے سے میر کا ایک شعر ملاحظہ فرمائیں۔

اگرچہ گوشہ گزیں ہوں میں شاعروں میں میر
یہ میرے شور نے روئے زمیں تمام لیا

وقت اور حالات کے بدلتے ہوئے مزاج اور اس سے ہم بیعت لوگوں کی تیز روی کو دیکھ کر میر صاحب کو جس بات کا اندیشہ تھا وہ سچ ثابت ہوئی جن لوگوں نے اس بات کی پروا نہیں کی وہ لوگ وقت کی تیز رفتاری کے ساتھ زیادہ دیر ہم قدم نہ رہ سکے اور آخر کار ٹھوکر کھا کر منہ کے بل گر پڑے جیسا کہ مولوی عبدالحق اپنے مقدمہ انتخاب کلام میر میں اس بات کا ذکر کرتے ہیں۔

"میر اور ان کے ہم عصروں کا اثر زائل ہو گیا اور ان کے بجائے دوسرے استاد پیدا ہوئے جو اس سوسائٹی کے سپوت اور اس تمدن کے پروردہ تھے۔ حضرت ناسخ اور ان کے بعد خواجہ وزیر، صبا، رشک، امانت وغیرہ کے کلام میں سوائے ضلع جگت، لفظی مناسبت اور تلازمہ اور دیگر تکلفات کے کچھ بھی نہیں۔"

میر نے اگرچہ قصائد اپنے خاص ممدوح کی تعریف و توصیف کی غرض سے لکھے ہیں لیکن ان کے قصیدے ممدوح کی مدح اور ستائش سے زیادہ اندرون ذات کا کرب اور ان کے حالات زندگی کا المیہ محسوس ہوتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ قصیدہ نہیں بلکہ ان کے دلی واردات اور درد و غم کا مرثیہ ہے۔ شاید یہی طرز گفتار میر کے خصوصی امتیاز کا سبب بھی ہو اگر ہم میر کے قصیدوں کے طرز اسلوب کی بات کریں تو وہ عام بول چال میں گفتگو کرنا زیادہ پسند کرتے ہیں انھوں نے فارسی الفاظ و تراکیب کا بھی استعمال کیا ہے لیکن اس کے استعمال کرنے میں بڑی فنی چابکدستی سے کام لیا ہے وہ ثقیل سے ثقیل الفاظ کا استعمال ایسی ترکیب سے کرتے ہیں وہ معیوب نہیں لگتے اور قاری اس لفظ کے معنی جانتے ہوئے بھی اس کے مقصود معنی کو آسانی سے درک کر لیتا ہے جیسا کہ میر صاحب فارسی الفاظ و تراکیب کے استعمال سے متعلق اپنی کتاب "نکات الشعراء" میں اس بات کا ذکر کرتے ہیں۔

"سیوم آں کہ حرف و فعل پارسی بکار برند و ایں قبیح است

چہارم آنکہ ترکیبات فارسی می آرند اکثر ترکیب کہ مناسب زبانِ ریختہ می افتد آں جائز است وایں را غیر شاعر نمی داند ترکیبے کہ نامانوس ریختہ می باشد آں معیوب است دانستن ایں نیز موقوف سلیقۂ شاعری است و مختار فقیر ہمیں است اگر ترکیب فارسی موافق گفتگوئے ریختہ بود مضائقہ ندارد۔"

میر کے قصائد میں وہ تمام تلازمات موجود ہیں جو کسی تخلیق کو ادبی سطح پر اپنا انفرادی معیار تعین کرنے کے لئے لازم ہوتے ہیں یہ الگ بات ہے کہ کشمکش زندگی اور حالات کی ستم ظریفی نے میر کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ بھی بادشاہوں کی مدح و ستائش کریں لیکن ان کا ضمیر انھیں اس بات کی قطعاً اجازت نہیں دے رہا تھا کہ وہ ایسا کریں جیسا کہ ان کی زندگی کے ایک واقعہ سے اس بات کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ اس حکایت کو علی جواد زیدی نے یکتا کے حوالے سے اپنی کتاب "تذکرہ شعراء اترپردیش" میں اس طرح نقل کیا ہے۔

"ایک دن میر تازہ قصیدہ کہہ کر آصف الدولہ کے دربار میں لائے نواب چاشت سے فراغت پاکر قصیدہ سننے لگے میر صاحب نے قصیدہ کو طول دیا۔ اتفاقاً اسی دن ایک ملا محمد نامی ایک مغل کو جو شاعر بھی تھا اور ولایت سے تازہ آیا ہوا تھا ملازمت کی غرض سے حضور میں لائے ہوئے تھے چاہتے تھے کہ اس سے بھی کچھ پڑھوائیں لیکن میر کے قصیدہ کے طول کے باعث وقت نہ بچا۔ ملا محمد نے تنگ آکے کہا میر صاحب قصیدہ خوب ہے لیکن طولانی۔ اگر نواب کا دماغ وفا نہ کرتا تو کون سنتا۔ یہ سنتے ہی میر نے بیاض زمین پر پھینک دی اور منغضب ہو کر کہا اگر نواب کا دماغ وفا نہ کرتا تو میرا دماغ کب وفا کرتا ہے۔ آداب دربار کا مطلق خیال نہ کیا۔ نواب تو خلق مجسم تھے ہی انھوں نے انتہائی مہربانی کا اظہار کیا اور ان کی طبیعت کی بے لطفی دور کی۔ پھر پورا قصیدہ سنا اور ملا کی مطلق پروا نہ کی اگرچہ نواب اور ملا میں صیغۂ اخوت تھا۔"

اس حکایت سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ میر کو یہ قطعاً نہیں پسند تھا کہ وہ کسی خاطی انسان کی محض اس لئے تعریف و توصیف کریں تاکہ ان کے مراتب و تفضل میں اضافہ کا سبب بنے وہ ایسا کرنے کو محض طمع دنیا اور حرص منصب پر محمول کرتے تھے اس لئے کہ خدا کے ہوتے ہوئے ایک انسان سے اپنی جھوٹی بندگی کا دعویٰ کرنا ان کے لئے ہتک حرمت کے مترادف تھا لیکن وقت کے جبر اور حالات کی چیرہ دستیوں نے انھیں وہ بھی کرنے پر مجبور کیا جو ان کی طبیعت کے لئے ناگوار تھا۔ اس لئے وہ یہ بات صاف طور سے کہتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

الٰہی کیسے ہوتے ہیں جنھیں ہے بندگی خواہش
ہمیں تو شرم دامن گیر ہوتی ہے خدا ہوتے

لیکن اس کے برخلاف وہ اسلام کی مقدس اور برگزیدہ شخصیتوں کی مدح و ثنا کرنا صرف اپنا فرض منصبی ہی تصور نہیں کرتے بلکہ اسے دنیا و آخرت میں باعثِ اجر عظیم گردانتے ہیں لہٰذا جب حضرت علیؑ اور حضرت حسینؑ کی بات آتی ہے تو ان کے انداز بیان میں ایک عجیب روحانی فضا استوار ہوتی ہوئی دکھائی دیتی ہے اور اپنے اس روحانی پیشوا و مقتدا کی اقتدا و مدحت سرائی کے لئے اپنی طبع و اولوالعزمی کو یہ کہہ کر مہمیز کرتے ہیں کہ تو اس شاہ کی مدح کو جس کی مدح سرائی کا صلہ عظیم نجات کی صورت میں ملنے والا ہے اور اس کے در کے گدا وہ صاحبان کمال و عرفان ہیں جو مسند خاک پر بیٹھ کر عرش نشینوں پر حکومت کرتے ہیں اور میرا یہ ممدوح علم کے شہر کا ایک ایسا دروازہ ہے جو تمام علوم کا خزینہ دار اور ہر خشک و تر کے اسرار کا رازدار ہے۔ مدحت سرائی کے اس میدان میں میر کی عقیدت عرفان کے اس صدرالمنتہیٰ تک پہونچ جاتی ہے کہ ان کی آنکھیں اس عالم چشم شہود سے مناظر غیب کا مطالعہ کرنے لگتی ہیں اور عالم بیخودی میں مسالک و مذاہب کی حدود و قیود سے محترز ہو جاتے ہیں اور ان کے عرفانی و روحانی عقائد کے الہامی آبشار کو تر و تسنیم و سلسبیل کے چشموں سے جا ملتے ہیں۔ ان کے اس روحانی کیف کو محسوس کرنے کے لئے حضرت علی کی مدح میں لکھے ہوئے قصیدے کے منتخب اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

کب تک صفت بتوں کی خدا سے تو خوف کر
اے طبع رہ نہ اتنی بھی پابند خط و خال
پڑھ منقبت بنہ شاہ کی جس سے نجات ہو
وہ شاہ جس کے ایک گدا کو ہے یہ کمال
تو وہ در مدینۂ علم و علیم ہے
جس شخص کو نہ آوے الف، ب، ت، دال ذال

حضرت علی مرتضیٰ کی شان میں لکھے گئے ایک قصیدے کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

جب سے خورشید ہوا ہے چمن افروز حمل
رنگ گل جھمکے ہے ہر پات ہرے کے ادجھل

مرحبا شاہی تری ملی علیٰ جاہ ترا
کہ ہوا تخت ترا دوش نبی مرسل
فرش ہو نا ترے زائر کا سعادت تھی وگلے
کیا کرے چادر مہتاب کہ تھی مستعمل

میان سے جب کہ گھسیٹی ادھر اُن نے تلوار
باعث تیرگی چشم تھی وہ برق اچپل
دہ ہی آ گئی یک بار صف اعدا میں
ایک دو ہاتھ کے چلنے میں پڑی یہ ہلچل
تیرگی بخش جہاں بس کہ ہوا سرمہ گرد
چشم خورشید فلک پر تھی شال مکحل

ایک دوسرے قصیدہ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں

اے طبع اتنی ہرزہ درائی جرس کی طرز
اس گفتگو کا فائدہ کچھ حاصل کلام
یعنی امیر شام نجف کی صفت پر آ
وہ شاہ جس پہ سارے کمالات ہیں تمام
وہ شاہ ہے کہ بعد نبیؐ کے وہی ہے پھر
وہ شاہ ہے کہ حق ہے وہی اولیں امام

حضرت امام حسینؓ کی مدح میں لکھے گئے ایک قصیدے کے چند اشعار پیش خدمت ہیں۔

یہ سینہ کوبی زخم جگر بہ ماتم میر
بہ جاں کنی گلو گیر و حسرت دیدار
قسم ہے تیرے تئیں ان تمام قسموں کی
کہ تجھ کو علم ہے ان سب کا کیا کروں میں شمار

جیسا کہ آپنے ملاحظہ کیا۔ اب اس مقام پر ان اشعار کے دیگر ظاہری اور معنوی جہات وابعاد سے پرہیز کرتے ہوئے اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ میرؔ کے تخلیقی سرمایہ میں گو کہ قصیدوں کی تعداد بہت کم ہے مگر یہ اردو ادب میں قصیدے کی تاریخ میں ایک اضافہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ میرؔ قصیدے میں ایک طرز جدید کے بانی ہیں۔ اردو ادب میں قصیدہ نگاری کی تاریخ میرؔ کے تذکرہ کے بغیر نامکمل سی دکھائی دیتی ہے۔ ◇◇

میر اور انسان دوستی..... (صفحہ ۹۷ کا بقیہ)

پھول گل آویں نظر دیکھو جدھر — لالہ و صد برگ سب باغ نظر
دستہ دستہ رنگ میں بھیگے جواں — جیسے گلدستے تھے جوروں پر رواں
زعفرانی رنگ سے رنگیں لباس — عطر مالی سے سبھوں میں گل کی باس
رنگ افشانی سے پڑتی ہے پھہار — رنگ باراں تھا مگر ابر بہار
مرغ گلشن گل رخاں کو جان پھول — بیٹھتے ہیں پاس آکر پھول پھول
قمقمے جو مارتے بھر کر گلال — جس کے لگتا آن کر پھر منہ ہے لال
برگ گل طوان اڑاتے تھے عبیر — تھی ہوا میں گرد تا چرخ اثیر

(ایضاً صفحہ ۷۸۹۔ مثنوی در بیان ہولی)

میر تقی میرؔ کے ان اشعار کے پس منظر میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ موجودہ عہد میں ان کے یہ اشعار ہمیں انسان دوستی، جذبۂ یگانگت صلح و آشتی رواداری اور قومی یک جہتی کی ضرورت کی طرف مائل کرتے ہیں اور اس طرح ان کے اشعار کی ہمہ گیر معنویت اب بھی برقرار ہے اور اس کا احساس خود میر کو بھی تھا۔ اسی لئے شاید انھوں نے کہا تھا۔

جانے کا نہیں شور سخن کا مرے ہرگز
تا حشر جہاں میں مرا دیوان رہے گا

یمینہ اختر
بمقابل بارہ دری حسین آباد، لکھنؤ۔۲۲۶۰۰۳

میر کی منقبتی شاعری

منقبت کے معنی توصیف، ثنا یا تعریف ہے مگر حقیقت میں منقبت اس کلام منظوم کو کہا جاتا ہے جو ائمہ اہلبیت کی تعریف سے نسبت رکھتا ہو۔ منقبت تقریباً ہر شعری ہیئت میں لکھی جاتی رہی ہے۔ غزلیات، مخمسات، مسدسات، قطعات، رباعیات ترکیب بند، ترجیع بند، قصائد، مثنویات وغیرہ تقریباً ہر صنف سخن میں منقبت کا گرانقدر سرمایہ اس بات کا شاہد ہے کہ منقبت ہر دور کے ان شعراء کا حاصل صد افتخار رہی ہے جو بندگان درین خاص کر ائمہ اہلبیت کے آستانے پر گلہائے عقیدت پیش کرنے کو سب سے بڑی فضیلت سمجھتے رہے ہیں۔ ان کی نظر میں یہ وسیلۂ نجات کے وہ عریضے ہیں جن کی قبولیت کا شرف انھیں اس بارگاہ تک پہونچا دے گا جس کی تمنا دنیا کے بڑے بڑے زاہدوں اور نیکوکاروں کو رہی ہے۔ دنیاوی بادشاہ اور بادشاہوں کی مدح کرنے والے شعراء کو اسی منزل پر آ کر سوچنا پڑتا ہے کہ ان کی تمام مدح سرائی کا صلہ تو ان تاجداروں کے پاس نہیں جن کی وہ مدح کرتے ہیں۔ وہ تاجدار وہ بادشاہ تو وہ ہیں جہاں آ کر ستارے جبیں سائی کرتے ہیں سلطنت صفویہ ایران کے مشہور بادشاہ عباس صفوی اور ان کی ملکہ نور کی مدح سرائی میں ملک الشعراء ملا کاشی نے جب قصیدہ لکھ کر روانہ کیا تو عباس صفوی نے دونوں قصیدوں کو یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ اس میں مبالغہ اور غلط بیانی سے کام لیا گیا ہے۔ ہم اس مقام کے حامل نہیں۔ بہتر ہے کہ محمدؐ و آل محمدؐ کی شان میں قصیدۂ منقبت کہا جائے کیونکہ جو کچھ بھی کہو گے وہ ان کے درجات و اعلیٰ مقامات سے نیچے ہی رہے گا اور اس میں ثواب بھی ملے گا۔ آخرت بھی اور دربار سے انعام بھی چنانچہ ملا کاشی نے ہفت بند کا قصیدہ حضرت علیؑ اور اولادِ علیؑ کی شان میں لکھا جو آج بھی فارسی ادب کا شاہکار سمجھا جاتا ہے۔

منقبتی شاعری کے حوالے سے یہ ایک واقعہ ہے ورنہ عرفی سے غالب تک نہ جانے کتنے واقعات ہیں جو آج بھی تاریخ میں محفوظ ہیں۔ میر کے کلیات میں منقبتی کلام زیادہ نہیں ہے پھر بھی جو کچھ ہے وہ ان کے عقائد اور مودت اہلبیت سے سرشار ہے ثواب دارین کی خاطر میر نے عشق محمدؐ و آل محمدؐ کی مدح سرائی میں جو اشعار کہے ہیں وہ عقیدت و وابستگی کی اس کیفیت سے مملو ہیں جو سمندر سے زیادہ گہری ہے۔ ہفت بند در مدح علی میں انھوں نے حضرت علیؑ کے ان فضائل کو عنوان بنایا ہے جو روایات و احادیث میں تواتر سے تحریر ہوئے ہیں۔

ذات تیری جوں خدا کی ذات ہے والاصفات
بے شریک و بے عدیل و بے نظیر و بے قریں
مظہر صدہا عجائب مصدر لطف و کرم
زیب منبر جانشین رحمۃ اللعالمیں
وارث دیں داور عادل شفیع روز حشر
حافظ عرش بریں و حامی شرع متیں
مالک ملک ولایت حاکم عالم پسند
بادشاہ صاحب استقلال امیر المومنیں

حضرت علیؑ کی شجاعت کے بارے میں روایت ہے کہ آپ نے بچپن میں کلہ اژدر کو چیر دیا تھا۔ جنگ خیبر کے فاتح بھی آپ ہیں۔ سورج پلٹے کا واقعہ بھی آپ سے منسوب ہے جیسا کہ لوگوں نے روایت کیا ہے کہ ایک موقع پر جناب رسالتمآب

حضرت علیؑ کے زانو پر سر رکھ کر استراحت فرما رہے تھے تا آنکہ سورج ڈوبنے لگا حضرت علیؑ نے نماز اشاروں میں ادا کی یہاں تک کہ نماز عصر کا وقت ڈھل گیا۔ جب حضورؐ بیدار ہوئے مغرب کا وقت ہونے کو تھا حضورؐ نے حضرت علیؑ سے کہا کہ سورج کو واپس پلٹنے کا اشارہ کرو سورج واپس پلٹ آیا اور حضرت علیؑ نے نماز عصر ادا کی۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ نے اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے۔

امام حق کسے باشد کہ از روئے منیر او
ز مغرب شمس برگردد کہ فرض او ادا باشد

یعنی برحق امام وہ ہوتا ہے جس کے اشارے سے سورج ڈوبنے کے بعد پلٹ آئے اور مغرب سے طلوع ہو میرؔ نے ایک شعر میں تینوں کمالات یعنی اژدر کی موت، جنگ خیبر اور سورج پلٹنے کو اس طرح نظم کیا ہے۔

قلعِ خیبر مرگ اژدر کھینچنا خورشید کا
ہیں نشانے زور کے تیرے جہاں میں یادگار

ترجیع بند در مدح علیؑ میں بھی یہی مضمون نظم کئے گئے ہیں مگر اس انداز سے۔

زور بازو سے اس کے کیا کہئے
ہے زباں زد نشانہ خیبر کا
کو گیا گم بڑوں بڑوں کے حواس
چیرنا کودکی میں اژدر کا

جذب خورشید کس طرح سے کیا
وقت کم تھا نماز دیگر کا

میرؔ کی منقبتی شاعری دراصل اسی احساس داورائی کا سرچشمہ ہے جس کے بارے میں حضرت شاہ شمس تبریزؒ نے فرمایا ہے۔

مست وائے حیدرم دم ہمہ دم علیؑ علیؑ
ہر دو جہاں ز دلبرم دم ہمہ دم علیؑ علیؑ

یعنی میں علیؑ کی محبت میں مست ہوں اور ہر سانس پر علیؑ علیؑ ہے مجھے دونوں جہاں میں اپنے محبوب کی شان نظر آتی ہے اس لئے میری سانسوں میں ہر دم علیؑ علیؑ نکلتا ہے۔

میرؔ کے لئے حضرت علی ہی سب کچھ ہیں۔

ہادی علیؑ رفیق علیؑ رہنما علیؑ
یاور علیؑ محمد علی، آشنا علیؑ
مرشد علیؑ، کفیل علیؑ، پیشوا علیؑ
مقصد علیؑ مراد علیؑ، مدعا علیؑ
جو کچھ کہو سوا پنے تو ہاں مرتضیٰ علیؑ
زور و ثبات و تاب و تواں مرتضیٰ علیؑ
امید گاہ خورد و کلاں مرتضیٰ علیؑ
مقصود خلق و خواہش جاں مرتضیٰ علیؑ
ذکر رواں و ورد زباں مرتضیٰ علیؑ
جو کچھ کہو سوا پنے ہیں ہاں مرتضیٰ علیؑ

میرؔ نے حضرت علی کی شان میں ایک منقبت ایسی بھی کہی ہے جس میں ان کے علاوہ آل مصطفیٰ کے دوسرے اماموں کا تذکرہ بھی ہے یہی وہ امام ہیں جن کے لئے حضرت امیر خسروؒ نے کہا تھا۔

چہ غم دارد روز حشر عصیاں خود خسروؔ
چو آل مصطفیٰ دارد شفاعت خواہ در محشر

یعنی خسروؔ کو قیامت کے دن گناہوں سے ڈر نہیں تھا کیونکہ روز محشر آل مصطفیٰ اس کی شفاعت کے لئے کافی ہیں۔

میرؔ نے مخمس کے پہلے بند میں رسول خدا، حضرت علیؑ جناب فاطمہؑ حضرت امام حسنؑ اور حضرت امام حسینؑ کو شفیع روز محشر قرار دے کر خود کو صبر کرنے کی تلقین کی ہے۔

ہراس روز محشر کیا محمد مصطفیٰ بس ہے
کرم خصلت وفا سیرت علی مرتضیٰ بس ہے
شفیع جرم سوز سینہ خیر النسا بس ہے
نہ ٹکڑے دل کے کر سوم امام مجتبیٰ بس ہے
ہوا مت رو شہید تشنہ کام کربلا بس ہے

اس ابتدائیہ بند کے بعد جو دوسرے بند ہیں ان میں امام حضرت زین العابدینؑ، امام حضرت محمد باقرؑ، امام حضرت جعفر صادقؑ، امام

حضرت موسیٰ کاظمؑ، امام حضرت علی رضاؑ، امام حضرت محمد تقیؑ، امام حضرت علی نقیؑ، امام حضرت عسکریؑ اور امام حضرت مہدی آخرالزماں کا بڑی والہانہ عقیدت سے ذکر کیا ہے۔ کبھی وہ حضرت امام زین العابدین سے ہر توقع رکھنے پر اصرار کرتے ہیں۔

رکھے کوئی توقع تو رکھے آل پیمبرؐ سے
طلب ہووے کسی کو کچھ تو ہو اولاد حیدر سے
امانت چاہنا پھر لطف ہے یاران دیگر سے
دل اپنا جمع کر دور تم کے شور اور شر سے
بہت ہے گرچہ ہنگامہ دلے زین العبا بس ہے

اور کبھی حضرت امام محمد باقرؑ اور امام حضرت جعفر صادقؑ کی محبت کو حیدر پرستی کا فرض عین بتاتے ہیں۔

دلا باقرؑ کی فرض عین ہے حیدر پرستی میں
جپا کر نام کو اس کے تو ہشیاری و مستی میں
غرض رہ محو اس کا دشت میں ہو تو کہ بستی میں
عجب ہے نونہال اک سایہ دار اس باغ ہستی میں
کرم اس کا ہے ہر شخص بے برگ و نوا بس ہے

محبت چاہئے صادق جناب پاک جعفرؑ میں
اسی کا شوق دل میں ہو اسی کا شور ہو سر میں
وہی یاں بھی نشاں ہے تھا جو کچھ ساقیٔ کوثر میں
عنایت کی اسی سے چشم رکھ آشوب محشر میں
بلا صد رنگ ہووے کیوں نہ ایک اس کی ولا بس ہے

امام موسیٰ کاظمؑ، امام علی رضاؑ اور امام نقیؑ کی منقبت کچھ اس انداز میں کرتے ہیں۔

دکھے کاظم کو جو سر پر غم و غصّہ سے کیا اس کو
نہ دیکھے یہ امام دیں بلا میں مبتلا اس کو
بیک چشمک زدن حاصل ہو ایسا رتبہ اس کو
کہ رکھے نعش جس کے سر پہ دیکھو بادشا اس کو
توجہ گر نہ اے مولا ہے ہر بد عا بس ہے

جسے لے مجلس آرایان دیں بہرہ ہے ایماں سے
اسے اک بندگی خاصی ہے شاہِ خراساں سے
گلہ کی چشم سے آتی ہے خلق ایران و توراں سے
گذر جاتے ہیں اس کے نام پر جنس خوش جاں سے
جو سودا اس سے بن جائے تو ہو راضی رضا بس ہے

جو وہ دن ہو کہ نکلے آفتاب اس روز پچھم سے
ہو کل درمیاں لادیں سخن جنت جہنم سے
کریں پرسش بد و نیک عمل کی خلق عالم سے
مخاطب ہم کسو سے ہوں نہ یار بے کوئی ہم سے
تقی و متقی ہم کو امام اتقیا بس ہے

نقیؑ پاک کا اگر علم جس وقت برپا ہو
الٰہی ہم سیہ کاروں کی اس کے سایے میں جا ہو
وہ حامی لطف سے ہو تو کچھ اپنا کام اچھا ہو
وگرنہ زشتیٔ اعمال سے کیا جانئے کیا ہو
دوں ہی ہووے تو بس کیا اور یوں ہووے تو کیا بس ہے

اس طرح امام حسن عسکریؑ اور امام مہدیؑ کی شان میں نذرانہ عقیدت پیش کرتے ہوئے

زنشگ کشی سے غم کی اے دل اس قدر درہم
کرے کا عسکریؑ انبوہ اس اندوہ کا برہم
عدو مجروح ہے اس کا اجار کا ہے وہ مرہم
رہیں گے نا امید رستگاری اس سے کیوں کر ہم
وسیلہ ہم گنہ گاروں کا وہ روز جزا بس ہے

اگرچہ اشک آنکھوں میں لبوں پر آہ رہتے ہیں
ولے مستغنیانہ ہر گہہ و بے گاہ رہتے ہیں
کبھو ہی شہر میں جا کر کبھو درگاہ رہتے ہیں
کرم پر مہدی ہادی کے ہم گم راہ رہتے ہیں
ہمیں اس وادی پر خوف میں وہ رہنما بس ہے

(بقیہ صفحہ ۱۴۸ پر)

مسرور جہاں
کراؤن گیٹ بمقابل بڑا چھتہ جگت نرائن روڈ لکھنؤ-۳

میرؔ کی مرثیہ گوئی

جب سے یہ دنیا وجود میں آئی اور انسانوں نے زبان کو ذریعۂ اظہار بنایا اسی وقت سے زندگی کے تجربے، غم اور خوشی کے مختلف پہلو شعر و ادب سے ہمکنار ہونا شروع ہوئے دنیا کی قدیم ترین زبانوں اور دیگر اقوام کے ادبی خزانوں میں ایسی منظوم کہانیاں موجود ہیں جن سے بخوبی پتہ چلتا ہے کہ شاعری کے دبستانوں میں انسانی جذبات اور احساسات کی ترجمانی نے کیا کیا موضوع اختیار کئے قصصی تعلیمی، تمثیلی اور غنائی شاعری کے اثرات نے جب عربی زبان کو اپنا وسیلہ بنایا تو مدح، ہجو، نسیب، مرثیہ، وصف اور تشبیہ کی رنگارنگی نے ایک ایسی دنیا آباد کرنا شروع کر دی جس میں زندگی کی ہر ہلچل سمٹ آئی۔ زندگی کے تمام حادثوں اور ان کی یاد کو ہمیشہ تازہ رکھنے کے لئے عرب روایات میں شاعری وہ اہم ذریعہ ہے جس کا ایک موضوع رثا ہے۔ عہد جاہلیت میں بھی عرب اپنے مقتولوں کا مرثیہ کہتے تھے لیکن ان کے یہ مرثیے کبھی ایسی آفاقیت نہ حاصل کر سکے جو تمام ذہن انسانی کو اس غم سے دوچار کر سکے جس غم کے تحت ان مرثیوں کو نظم کیا گیا تھا۔

دراصل مرثیے نے یہ معنویت اس وقت حاصل کی جب واقعہ کربلا ہوا۔ حضرت امام حسینؑ کی شہادت کوئی ایسا واقعہ نہ تھا جو ایک قبیلے کے سردار یا چند افراد کے قتل کا نوحہ ہو بلکہ یہ تو عالم اسلام کی اس نمائندہ شخصیت کا مرثیہ تھا جس کے لئے پوری کائنات نوحہ گر بن گئی۔ امام شافعی، دعبل، سلیمان بن قتہ وغیرہم کے مرثیے اس بات کے شاہد ہیں کہ امام حسین کی شہادت نے مرثیے کے موضوع کو وہ معنویت دے دی جس کے لئے مرثیہ صدیوں سے سرگرداں تھا۔ اردو شاعری میں تو یہ مرثیہ سانحۂ کربلا اور شہادت امام حسینؑ سے اس طرح لازم و ملزوم ہوا کہ مرثیہ کے معنی ہی امام حسینؑ کا مرثیہ بن گئے۔

عام تحقیق کے مطابق اردو شاعری میں مرثیہ کی ابتدا دکن سے ہوئی۔ اس کے بعد شمالی ہندوستان میں مرثیہ کا آغاز ہوا۔ اٹھارہویں صدی سے پہلے شمالی ہندوستان میں مرثیے کا پتہ نہیں چلتا۔ اٹھارہویں صدی کے نصف میں باقاعدہ مرثیے لکھنے والوں میں مسکین شاہ حاتم یکرنگ اور خلیفہ محمد علی سکندر کا نام لیا جاتا ہے۔ سکندر کا مشہور مرثیہ "روایت شتر اسوار کسی کا اقبال رسول" اتنا مقبول ہوا کہ آج تک پڑھا جاتا ہے۔ اٹھارہویں صدی کے دوسرے نصف میں سودا، قائم چاندپوری، میر حسن، مصحفی، جرأت، دلگیر، فصیح، خلیق کے علاوہ میر تقی میرؔ بھی ان شعراء میں ہیں جن کو مرثیہ گو شعراء میں شامل کیا جاتا ہے۔

میر تقی میرؔ (۱۷۲۲ - ۱۸۱۰ء) ان باکمال شاعروں میں ہیں جنھوں نے تقریباً ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے کلیات میں حمد، نعت، منقبت، قصیدہ، غزل، مثنوی، مرثیہ، سلام، رباعی قطعہ، ترکیب بند، تضمین وغیرہ سب کچھ موجود ہیں لیکن ان کی شہرت اور مقبولیت کی بنیاد صرف ان کی غزلوں پر قائم ہے حالانکہ دوسرے اصناف سخن جن میں ان کے سلام و مرثیے بھی شامل ہیں وہ بھی ایک ایسے مطالعہ کا حصہ ہیں جس کے بغیر میرؔ کی تفہیم مشکل ہے۔

سب سے پہلے ڈاکٹر مسیح الزماں نے ان کے سلام و مرثیے جمع کرکے "مراثی میرؔ" کے نام سے ۱۹۵۱ء میں شائع کئے۔ ان کی کل تعداد ان کے بقول اکتالیس ہے لیکن مراثی میرؔ میں ۴۴ مرثیے اور پانچ سلام ہی نظر آتے ہیں۔ کلیات میرؔ کے مرتب احمد محفوظ نے دو مزید

سلام اور ایک مرثیہ کو شامل کر کے اس تعداد کو پورا کیا کیونکہ مراثی میر میں ایک مرثیہ دو ٹکڑوں میں دو مرثیوں کی شکل میں چھاپا گیا تھا لہٰذا انھوں نے اسے ایک مرثیہ کی صورت میں رکھ کر ۳۴ مرثیے اور سات سلام پیش کئے۔ اس طرح سلام و مرثیے کی کل تعداد اکتالیس (۴۱) ہو گئی جیسا کہ ڈاکٹر مسیح الزماں نے "مراثی میر" میں مرثیہ کیا تھا۔

میر کے ہمعصر سودا (۱۷۰۶ء - ۱۸۰۷ء) نے مرثیہ نگاری میں چند تبدیلیاں کیں اور مرثیہ گوئی کے کچھ اصول مقرر کرنے کی کوشش کی اب تک مرثیہ صرف مجلسوں کی زینت تھا اور اس کا مقصد رونا رلانا تھا مگر اردو زبان جیسے جیسے ترقی کی راہ پر گامزن ہوئی اور شاعری کا رنگ بدلنا شروع ہوا تو مرثیے کی شاعری میں بھی تبدیلیاں آنا شروع ہوئیں۔ میر اور سودا کے عہد تک آتے آتے اردو مرثیہ کی تاریخ ڈھائی سو سال پرانی ہو چکی تھی لیکن ابھی چہرہ، منظر نگاری، رخصت، سراپا رجز، گھوڑے اور تلوار کی تعریف، جنگ، شہادت اور بین کے وہ اصول وضع نہیں ہوئے تھے جنھیں میر ضمیر نے مرثیے کے لئے ضروری قرار دیا تھا پھر بھی مرثیے میں ادبی عناصر کے طور نمایاں ہونا شروع ہو گئے تھے۔ سودا نے میر گھاسی کے مرثیے

دلوں پر محبّوں کے حالت عجب ہے
مصیبت ہے، ماتم ہے، غم ہے، تعب ہے
غرض کیا کہوں کس روش کا غضب ہے
حسین علیؑ کی شہادت کی شب ہے

میں اس کو جو اک دے کر ہے لکھا
غزل نہیں ہے، ہے مرثیہ نام اس کا
ذرا منصفوں سے ہے اب اس کا دعویٰ
بیان شہادت کا اک یہ ہی ڈھب ہے

پر جو اعتراض کے تھے۔ اس میں ادبی عناصر کی بے ربطی پر زور دیتے ہوئے اور ان کی اہمیت کا اشارا کرتے ہوئے لکھا تھا۔

نقیں خواہش الفاف کی میر جی سے ۔۔۔ سنا منصفوں نے تو یہ داد دی ہے
طلب یاں نہ منصف کو انصاف کی ہے ۔۔۔ پر اس کا ہر اک بند معنی طلب ہے

غرض مرثیہ یہ جو تم نے کہا ہے ۔۔۔ عجب بحر بے ربطی اس میں بہا ہے
بلاغت کا جی ناک میں آرہا ہے ۔۔۔ فصاحت کو دیکھو تو وہ جاں بلب ہے

اس سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ عہد میر میں مرثیہ وہ مرثیہ نہیں رہا جو گولکنڈہ، بیجاپور، اورنگ آباد، گجرات اور برہانپور سے منزل بہ منزل سفر کرتا ہوا دلی آپہونچا تھا بلکہ اس میں وہ ادبی عناصر بھی داخل ہونا شروع ہو گئے تھے جو لکھنؤ میں اپنے کمال تک پہونچے۔ اس وقت جو مرثیے کا ڈھنگ تھا۔ میر کے مرثیوں میں بھی کم و بیش وہی اوصاف نمایاں تھے مگر ان میں رنگ میر کی آمیزش کچھ ایسی تھی جو انھیں دوسرے مرثیوں سے الگ پہچان دیتی تھی۔

الف داغ کھنچے کہیں جائیں گے ۔۔۔ کہیں نعل سینوں پہ جڑوائیں گے
بہت لوہو روتے ہوئے آئیں گے ۔۔۔ بہت سینہ کوبی سے ہوں گے نڈھال

تری پاسبانی تھی فخر ملک ۔۔۔ تو خورشید تھا تیری جا تھی فلک
تو پہونچا ہے کیوں خاک تیرہ تلک ۔۔۔ ترے سر پہ آیا ہے کیوں یہ زوال

گھر سیاہ اپنے کریں گے اس عزا میں سب امیر
اس کے ماتم میں بہت سے لوگ ہوویں گے فقیر
سینہ کوبی کرتے کوچوں میں پھریں گے خورد و پیر
عورتیں بے تاب نکلیں گی گھروں سے مو فشاں

گریاں در و دیوار تھے ہنگام سفر کے
ہم چشم تھے پاؤں کے اثر دیدۂ تر کے
دامن میں ترے دست زناں لوگ تھے گھر کے
کچھ خوب نہ تھے پہلے ہی آثار حسیناں

مرثیوں میں بین اور حزن و ملال کے اظہار کو ہی اصل مرثیہ مانا گیا ہے۔ میر کے مرثیوں میں ابتداء سے اختتام تک اس کی فضا کاری کچھ اس طرح ہوئی ہے کہ ان کا ہر مرثیہ سوگ میں ڈوبا نظر آتا ہے۔

محرم کا نکلا ہے پھر کر ہلال ۔۔۔ قیامت رہیں گے دلوں پر ملال
کیا تھا جو ماتم بہت پر کے سال ۔۔۔ سو آئے نہیں اب تلک جی بحال

فلک قتل سبط پیمبر ہے کل   یہ ہنگامہ ہونا مقرر ہے کل
سحر شام تیرہ سے بدتر ہے کل   بلا کل مکل ہے کہ محشر ہے کل

خاک تیرے فرق پر اے بے مروت آسماں
ایک قطرۂ آب کو ابن علی دیتا ہے جاں
بھائی بیٹے اس کے مارے جاتے ہیں کیا کیا جواں
کھول چشم مہر و مہ پھر وقت ملتا ہے کہاں

چاروں طرف ہے شور فغاں وامصیبتا
ماتم کدہ ہوا ہے جہاں وامصیبتا
مردوں کی جنس سینہ زناں وامصیبتا
نسواں تمام مویہ کناں وامصیبتا

تاریخ و روایات کے وہ سارے حوالے جو مدینے سے کربلا اور کربلا سے شام تک پھیلے ہوئے ہیں میرؔ کے مرثیوں میں پر اثر انداز میں موجود ہیں. ان میں کہیں کہیں لفظ و معنی کے وہ چراغ بھی روشن ہیں جن کا سلسلہ میرؔ کی غزل سے جا ملتا ہے.

تھے لوگ سب حرم کے جوں بید سر برہنہ
ان میں سکینہ جیسے خورشید سر برہنہ
تھی شہر بانو یکسر نومید سر برہنہ
نوحے سے جس کے جنگل تھا زلزلے میں سارا

صرف خزاں ہے باغ امامت
ابھی نہیں ہے کچھ یاں کی علامت
ہر گل کے سر پر ہے اک قیامت
پیراہن اپنا تو بھی قبا کر
خطاب اس کا تھا ہر دم آسماں کو
کہ ہم بے طالعوں غم دیدگاں کو
دکھایا تو نے تیرہ کر جہاں کو
اگر رکھتے نہ تھے ہم سب ستارہ

کہنے کو لوگ کہہ سکتے ہیں کہ غزلوں یا مثنویوں کی طرح میرؔ ان مرثیوں میں اپنے سخن کا وہ کمال نہیں پیش کر سکے جن کی بنا پر انھیں تمام شعراء پر فوقیت حاصل ہے مگر یہ دلیل اس لئے کمزور ہے کہ میرؔ کا زمانہ وہ نہیں تھا جہاں مرثیہ اپنے عروج پر پہونچا. اس کے علاوہ کون سا ایسا دور ہے جہاں تمام اصناف سخن درجۂ کمالات تک پہنچے کبھی قصیدے کو عروج حاصل ہوا. کبھی مثنوی کو اور کبھی غزل کو لہٰذا میرؔ کے مراثی کو اس نظر سے دیکھنا چاہئے جو اس دور سے مخصوص سے رہے شعری محاسن تو میرؔ کے مرثیوں میں وہ تمام شعری محاسن موجود ہیں جن کی بنا پر میرؔ کو میرؔ کہا جاتا ہے. ان کے لفظیات، ان کے ظاہری و باطنی رشتے اور وہ تہہ داری جو ان کے کلام کا خاصا ہے اس کی بیشتر مثالیں ان مرثیوں میں موجود ہیں. اپنے منفرد ہونے کا احساس انھیں ہمیشہ رہا. ایک مرثیہ کے مقطع میں انھوں نے مرثیہ کہنے کا جو عذر پیش کیا ہے وہ چاہے جتنا صحیح ہو مگر اس کے در پردہ انھوں نے اپنی عظمت کا احساس بھی ظاہر کیا ہے.

ہر چند شاعری میں نہیں ہے تری نظیر
اس فن کے پہلوانوں نے مانا تجھی کو میرؔ
پر ان دنوں ہوا ہے بہت تو ضعیف و پیر
کہنے لگا جو مرثیہ اکثر بجا ہوا

ان کی عظمت کا یہی احساس تھا جس نے ایک دنیا کو یہ کہنے پر مجبور کر دیا، "نہ ہوا پر نہ ہوا میرؔ کا انداز نصیب" اور اس عظمت کو برقرار رکھنے میں ان کے مرثیے بھی ان اصناف سخن میں شامل ہیں جن کا تذکرہ میرؔ کے بغیر ممکن نہیں.



گذارش

اہل قلم حضرات سے گذارش ہے کہ اپنی تخلیق روانہ کرتے وقت پتہ کے ساتھ اپنا موبائل نمبر ضرور تحریر کریں.

شعیب علی
کاشانۂ اکرام، احاطہ مرزا علی خاں لکھنؤ۳

رباعیاتِ میر

رباعی ایک ایسی صنف سخن ہے جو عربی شاعری میں مفقود تھی اس کی ابتدا فارسی زبان و ادب میں ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ خاندان صفاریہ کے بانی یعقوب بن لیث صفار (متوفی ۲۹۰ھ) کا ایک کمسن بچہ دوسرے بچوں کے ساتھ کھیل رہا تھا شرط یہ تھی کہ ایک گڑھے میں اخروٹ تاک تاک کر ڈالے جائیں اس بچے نے جو اخروٹ پھینکا تو گڑھے میں نہ گیا اس وجہ سے وہ اداس ہو گیا۔ اتفاقاً وہ اخروٹ لڑھکتا ہوا الٹا پلٹ آیا اور گڑھے میں جا گرا۔ بچہ فرط جوش اور خوشی کے مارے بے ساختہ کہہ اٹھا "غلطاں غلطاں ہمی رود تالب گو"۔ باپ کو یہ موزوں کلام پسند آیا۔ شعراء سے کہا اس کی تقطیع کرو۔ اس وقت تک اس بحر میں شعر نہیں کہے گئے تھے تقطیع میں دشواری ہوئی۔ بعد جدو جہد بحر ہزج میں تقطیع ہو گئی پھر تین مصرعے لگا کر رنگ زمانہ کے موافق دوبیتی بنائی۔ مدتوں یہ صنف دوبیتی کہلائی پھر رباعی نام ہو گیا اس صنف سخن میں یوں تو بہت شعرائے فارسی نے طبع آزمائی کی مگر عمر خیام اور سحابی نے رباعی میں وہ کمال پیدا کیا کہ کوئی ان کا ہمسر نہ ہو سکا۔

اردو شاعری میں رباعی کا چلن ابتدا سے رہا ہے ہر دور میں شعرائے اردو اس صنف سخن میں طبع آزمائی کرتے رہے۔ میر انیس و مرزا دبیر نے رباعی کو جس انتہائے کمال تک پہونچایا اس کے لئے کسی تعارف کی ضرورت نہیں۔ بعد کے شعرا میں جگت موہن لال رواں، امجد حیدر آبادی، تلوک چند محروم، یاس یگانہ چنگیزی جوش اور فراق گورکھپوری رباعی گو شعرا میں خاصے مشہور ہوئے۔

میر تقی میر نے جہاں اور اصناف سخن میں طبع آزمائی کی وہیں رباعی کی صنف میں بھی ان کے تخلیقی جوہر نمایاں ہوئے۔ ہر چند کہ ان کے کلیات میں رباعیات کی تعداد زیادہ نہیں ہے۔ لے دے کے ایک سو چار رباعیاں اور ایک رباعی مستزاد ہی شامل ہے مگر ان میں میر کا شعری آہنگ اس درجہ نمایاں ہے کہ ان کا مطالعہ کئے بغیر ہم اس میر کو سمجھ نہیں سکتے جو غزلوں، قصیدوں، مثنویوں اور مرثیوں سے لے کر واسوخت تک زندگی کی مختلف تصویروں میں رنگ بھرتا رہا ہے۔

میر اور اس کے بعد کے زمانے تک رباعی کو اخلاقی مضامین کا اظہار ہی سمجھا گیا۔ واعظانہ موضوعات کے سانچے میں ڈھلی ڈھلائی رباعیاں زندگی کے دوسرے تجربوں سے دامن بچاتی رہیں اور اس راسخ عقیدے پر ہمیشہ قائم رہیں کہ ان میں جو کچھ ہے وہ فقط واعظ و محتسب کی کہانی، دنیا کی بے ثباتی اور موت و زندگی کے مضامین ہیں۔ لیکن میر کی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے رباعیوں میں وہ مضامین بھی باندھے جو آگے چل کر جنس و جمالیاتی تفسیر بنے۔ ان کے یہاں محض۔

زانو پہ قدخم شدہ سر کو لایا
جائے دنداں کو ہم نے خالی پایا
آنکھوں کی بصارت میں تفاوت آیا
پیری نے عجب سماں ہمیں دکھلایا

مسجد میں تو شیخ کو خروشاں دیکھا
میخانے میں جوشِ بادہ نوشاں دیکھا
اک گوشہ عافیت جہاں میں ہم نے
دیکھا تو محلۂ خموشاں دیکھا

اندیشۂ مرگ سے ہے سینۂ سب ریش
ٹکڑے ہے جگر جیسے لباس درویش
ہاتھوں سے جو آج ہو سکے کر لیجئے
پھر کل تو نہیں ہے اک قیامت درپیش

کیا تم سے کہوں میر کہاں تک روؤں
روؤں تو زمیں سے آسماں تک روؤں
جوں ابر جہاں جہاں بھرا ہوں غم سے
شائستہ ہوں رونے کا جہاں تک روؤں

جیسی رباعیاں ہی نہیں ہیں بلکہ ہجر و وصال اور عشق و عاشقی کے جذبات سے چھلکتی ہوئی یہ رباعیاں بھی ہیں۔

دل خوں ہے جگر داغ ہے رخسار ہے زرد
حسرت سے گلے لگنے کی چھاتی میں ہے درد
تنہائی و بے کسی و صحرا گردی
آنکھوں میں تمام آب منہ پر سب گرد

ہجراں میں کیا سب نے کنارہ آخر
اسباب گیا جینے کا سارا آخر
نے تاب رہی نہ صبر دیارا آخر
آخر کو ہوا کام ہمارا آخر

اندوہ کھپے عشق کے سارے دل میں
اب درد لگا رہنے ہمارے دل میں
کچھ حال نہیں رہا ہے دل میں اپنے
کیا جانئے وہ کیا ہے تمہارے دل میں

افسوس ہے عمر ہم نے یوں ہی کھوئی
دل جس کو دیا ان نے نہ کی دلجوئی
جھنجھلا کے گلا چھری سے کاٹا آخر
جہل عشق میں ایسی بھی کرے ہے کوئی

رقیب و رقابت کے مضمون سے عشق کی دنیا کبھی خالی نہ رہی میر نے ایک دو رباعیوں میں اسے بھی عنوان بنایا ہے مگر اسی تہہ داری کے ساتھ جو ان کی غزلوں میں پنہاں ہے۔

حیرت ہے کہ ہو رقیب محرم تیرا
ہمراز و انیس وقت و ہمدم تیرا
جوں عکس ترے سامنے افسردہ ہو
جوں آئینہ منہ تکا کریں ہم تیرا

ہیں گو کہ سبھی تمہاری پیاری باتیں
پر جی سے نہ جائیں گی تمہاری باتیں
آنکھیں ہیں ادھر روئے سخن اور طرف
یاروں کی نظر میں ہیں یہ ساری باتیں

رباعی جیسی مشکل صنف سخن میں ایک جہان معنی کو سمونا اور مخصوص بحروں کے حدود میں رہ کر شعری محاسن کو برقرار رکھنا آسان نہیں ہے مگر میر نے اپنی تخلیقی قوت اور فنی صلاحیت کے سہارے اس صنف میں بھی اپنا اعتبار قائم رکھا ہے میر شناسی میں یہ رباعیاں صرف اس لئے اہم نہیں ہیں کہ انھیں میر نے لکھا ہے بلکہ اس کی اہمیت اس لئے بھی ہے کہ میر نے ان میں وہ مضامین بھی باندھے ہیں جو اس دور کے رباعی گو شعراء کی نظر میں لائق التفات نہیں تھے۔ میر کے ذہنی سفر میں رباعیات اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ ہر وہ تجربہ جو شعر بن سکتا ہے وہ کسی صنف کا محتاج نہیں ہوتا۔ اس کا تعلق شاعری سے ہے میر جیسا شاعر اگر ہو تو رباعی میں یہ مضمون و معنی آفرینی بھی پیدا کر سکتا ہے۔

شب ابر کہ پیشرو ہو دریا جس کا
آیا دل داغ کر گیا جس قیس کا
اس سے ناگاہ ایک بجلی چمکی
کیا جانئے ان نے گھر جلایا کس کا

◇◇

مہتاب جہاں
دشرتھ کالج ۔ لکھنؤ

میر اور "ذکر میر"

اٹھارھویں صدی کا پر آشوب دور ہندوستان کی تاریخ میں اس لئے سب سے زیادہ اہم ہے کہ اسی دور میں حکومت اور اقتدار کی رسہ کشی نے مغلیہ سلطنت کو اس تیزی سے زوال کی طرف کھینچ لیا کہ اس کے بعد پھر اسے سنبھلنے کا موقع کبھی فراہم نہ ہوا۔ مرہٹہ، جاٹ اور سکھ افواج کے متواتر حملوں اور ابدالی کی لگاتار فوج کشی نے دہلی کے تخت و تاج کی شان و شوکت کو اس طرح پامال کیا کہ تجارت کے بہانے ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھنے والے انگریز سارے ملک پر قابض ہو گئے۔ ۲ مارچ ۱۷۰۷ء کو اورنگ زیب کا انتقال ہوتے ہی حکومت کا شیرازہ ہی نہیں بلکہ ہندوستانی تاریخ کے اوراق بھی کچھ اس طرح بکھرنا شروع ہوئے کہ دور دور تک ان کا نام و نشان بھی باقی نہ رہا۔

خاک بھی سر پر ڈالنے کو نہیں
کس خرابے میں ہم ہوئے آباد　　میرؔ

اس آباد خرابے کی ایک تاریخ تو وہ ہے جو مورخوں نے بیان کی ہے اور ایک وہ تاریخ ہے جسے صوفیہ کے ملفوظات اور شعراء کے تذکروں میں پائی جاتی ہے لیکن ان سب سے جدا اٹھارھویں صدی کی ایک اور حقیقت ہے جسے میر تقی میرؔ (۱۷۲۲ - ۱۸۱۰) نے "ذکر میر" کے عنوان سے اس پر آشوب دور کا ایک ایسا آئینہ بنا دیا ہے جس میں ہر صورت حیرت اور حسرت کی تصویر نظر آتی ہے۔ میرؔ کی یہ آپ بیتی کہنے کو میرؔ کی آپ بیتی ہے ورنہ حقیقت میں اس دلی کا مرثیہ ہے جس کے گلی کوچوں میں منزل ڈھونڈتے ڈھونڈتے خود میرؔ ایک ایسی رہ گذر پر جا نکلے کہ پھر کبھی واپس آنا نصیب نہ ہوا۔

یا قافلہ در قافلہ ان رستوں میں تھے لوگ
یا ایسے گئے یاں سے کہ پھر کھوج نہ پایا　　(میرؔ)

"ذکر میر" یوں تو میرؔ کے والد محمد علی عرف علی متقی کی درویشی ان کے انتقال (۱۷۳۳ء) بڑے بھائی حافظ محمد حسن کے ناروا سلوک معاشی پریشانی، آگرے سے دہلی کا سفر (۱۷۳۴ء) خان آرزو کی دل شکنی، شاعری، جنون (عشق) اور دہلی سے لکھنؤ ہجرت (۱۷۸۲ء) کے واقعات اور چند حالات پر مبنی ہے مگر یہ میرؔ کی آپ بیتی سے زیادہ اس دور انتشار کی سرگذشت ہے جس نے مغلیہ سلطنت کے جاہ و حشم کو نقش بہ دیوار بنا دیا تھا۔ میرؔ نے اپنی اس آپ بیتی میں اپنے متعلق ایسی کوئی تفصیل نہیں دی ہے جس سے یہ معلوم ہو کہ یہ ان کی آپ بیتی ہے۔ بس کہیں کہیں وہ خود کو ذرا دیر کے لئے نمایاں کرتے ہیں اور پھر اپنا قصہ چھوڑ کر ان واقعات کو بیان کرنے لگتے ہیں جو مغلیہ سلطنت کو درپیش تھے اس کے باوجود اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جہاں جہاں میرؔ نے اپنا تذکرہ کیا ہے وہاں وہاں ایک ایسی زخمی روح کی درد بھری آواز سنائی دیتی ہے جس کے زخم کبھی مندمل نہیں ہوتے۔

(والد کی موت کے بعد میں نے) فلک کی بے مروتی دیکھی، زمانے کے ستم جھیلے، نہیں نہیں فلک یا زمانے کا کیا قصور؟ میرا ہی ستارہ منحوس تھا کہ ایسے آفتاب کا سایا میرے سر سے اٹھ گیا جو کچھ کیا میری قسمت نے کیا۔ اپنے ہی ہاتھ کے سوا کسی اور کا ہاتھ اپنے سر پر نہ پایا..... میرے ہونٹ حرف طلب سے آشنا نہ ہوئے۔ میری آنکھ کسی کی طرف نہ اٹھی نہ میں نے کسی سے مدد چاہی نہ کسی نے میری دستگیری کی یعنی خدائے کریم نے مجھے کسی کا شرمندۂ احسان نہ کیا

اور مجھے (سوتیلے) بھائی کا جو مجھ سے کینہ رکھتے تھے دست نگر نہ بنایا چھوٹے بھائی کو اپنا قائم مقام بنا کر روزگار کی تلاش میں اطراف شہر میں گھومتا پھرا لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا یعنی وطن میں چارۂ کار نہ پایا تا چار غربت اختیار کی۔ شاہجہاں آباد دہلی میں پہونچا یہاں بھی بہت گھوما (مگر) کسی کو شفیق نہ پایا۔

(ذکر میر فارسی۔ مترجم نثار احمد فاروقی ص ۱۱۰)

نادر شاہ کے حملے (۱۷۳۹) کے بعد احمد شاہ ابدالی نے جو اس کے ہمراہ دہلی آچکا تھا ۱۷۴۷ء سے ۱۷۶۹ء تک نو مرتبہ ہندستان پر حملے کئے۔ ان حملوں نے مغلیہ سلطنت خاص کر دہلی میں تباہی و بربادی کا جو بازار گرم کیا اس نے چار سو کہرام مچا دیا۔

دلّی ہوئی ہے ویراں سونے کھنڈر پڑے ہیں
ویران ہیں محلے، سنسان گھر پڑے ہیں
دیکھا تو اس چمن میں باد خزاں کے ہاتھوں
اکھڑے ہوئے زمیں سے کیا کیا شجر پڑے ہیں
بلبل کا باغباں سے اب کیا نشان پوچھوں
بیرون در چمن کے، یک مشت پر پڑے ہیں

(مصحفی)

شہر داخل ہوا جب ابدالی — دیکھ درانیوں کے چہرہ رفت
ایک شش و پنج میں تھی خلق خدا — کہ کہیں ہو نہ ان دنوں سے ہشت ہفت
نہ فقیروں کی چھوڑتے تھے کلاہ — نہ امیروں کا جامۂ زربفت
شاہ از تخت گاہ دہلی رفت

(قائم چاندپوری)

ابدالیوں کے پانچویں حملے (۱۷۵۷ء) نے دہلی میں جو تباہی پھیلائی اس نے بادشاہ عالمگیر ثانی سے لے کر رعایا تک سب کو ہلاکت میں ڈال دیا۔ اس حملے میں میر کا مکان بھی منہدم ہوا تھا۔ میر نے اس حملے کا حال بیان کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"بندہ (میر) اپنی عزت تھامے شہر میں بیٹھا رہا۔ شام کے بعد منادی ہوئی کہ شاہ (ابدالی) نے امان دے دی ہے رعایا کو چاہئے کہ وہ پریشان نہ ہو مگر جب گھڑی بھر رات گزری تو غارت گردں نے مظالم شروع کئے۔ شہر کو آگ لگا دی۔ گھروں کو جلا دیا اور (سارا ساز و سامان) لے گئے۔ صبح کو جو (گویا) صبح قیامت تھی تمام شاہی (درانی) فوج اور روہیلے ٹوٹ پڑے اور قتل و غارت میں لگ گئے۔۔۔ نیا شہر ڈھے کر خاک سے برابر ہو گیا۔۔۔۔ (اب) وہ بے رحم لوگ پرانے شہر پر ٹوٹ پڑے۔۔۔۔ پرانے شہر کا علاقہ جسے (رونق و شادابی کے باعث) "جہان تازہ" کہتے تھے کسی گری ہوئی منقش دیوار کے مانند تھا یعنی جہاں تک نظر جاتی تھی مقتولوں کے سر ہاتھ، پاؤں اور سینے ہی نظر آتے تھے۔۔۔۔ میں کہ (پہلے ہی) فقیر تھا اب اور زیادہ مفلس ہو گیا۔ افلاس اور تہی دستی سے میرا حال بہت ابتر ہو گیا۔ سڑک کنارے جو میرا تکیہ (مکان) تھا وہ بھی ڈھے کر برابر ہو گیا غرض کہ وہ بے مروت سارے شہر کو لاد کر لے گئے اور شہر کے لوگ ذلت (و رسوائی) اٹھا کر جان سے گذر گئے"۔

(ذکر میر۔ مترجم نثار احمد فاروقی ص ۱۳۸ تا ۱۴۱)

پانی پت کی جنگ کے بعد دہلی کو ایک بار پھر قتل و غارت کا سامنا کرنا پڑا۔ میر نے بڑے دلدوز پیرائے میں لکھا ہے۔

"ایک دن میں ٹہلنے نکلا اور شہر کے تازہ ویرانوں سے گذرا نہ وہ بازار (رہے تھے) جن کا بیان کروں نہ بازار کے وہ حسین لڑکے۔۔ وہ حسن کہاں جس کی پرستش کیا کرتا تھا۔ وہ یاران عاشق مزاج کدھر گئے؟ جوانان رعنا گذر گئے۔۔۔۔ ناگاہ اس محلہ میں آنکلا جہاں میں رہتا تھا جلسے کرتا تھا۔ شعر پڑھتا تھا۔ عاشقانہ زندگی گزارتا تھا۔ راتوں کو روتا تھا۔ خوش قدوں سے عشق لڑاتا تھا۔۔۔۔ اب کوئی ایسا مانوس چہرہ نظر نہ آیا جس سے دو باتیں کر کے دل خوش کر لیتا کوئی معقول انسان نہ ملا جس کے پاس جا بیٹھتا پھر اس وحشت گاہ سے نکل کر ایک کنارے پر آکھڑا ہوا اور حیرت سے (تباہی کے چھوڑے ہوئے نشانات) دیکھتا رہا۔ بہت صدمہ اٹھایا اور عہد کیا کہ اب ادھر نہ آؤں گا اور جب تک یہاں رہوں گا شہر کا رخ نہ کروں گا"۔ (ذکر میر، مترجم نثار احمد فاروقی ص ۱۵۳ - ۱۵۴)

میر نے اپنی آپ بیتی میں نہ صرف دہلی کے بار بار اجڑنے کا ذکر کیا ہے بلکہ لاہور سے آگرہ، متھرا اور فرخ آباد تک کے ہنگاموں

اور رعایا کی بدحالی کا بھی مرثیہ لکھا ہے۔ نان شبینہ کو محتاج ایک لٹا ہوا قافلہ تھا جو بستیوں اور ویران محلوں میں فریادی تھا۔

والد کے انتقال کے بعد خود میرؔ اس غرض سے دہلی آئے تھے کہ روزگار کی صورت پیدا ہو سکے۔ یہاں بھی وہ پریشان ہی رہے ابتدا میں امیر الامرا صمصام الدولہ کی سرکار سے ایک روپیہ روزگار کا آسرا ہوا رعایت خاں کی ملازمت سے تھوڑا سہارا ملا مگر وہ بھی برقرار نہ رہا نواب بہادر جاوید خاں، اسد یار خاں، دیوان مہانرائن، راجا جگل کشور راجہ ناگرمل، بہادر سنگھ وغیرہ نے سب سے زیادہ میرؔ کی دست گیری، اور امداد کی مگر ابدالی اور مرہٹہ حملوں اور سورج مل جاٹ کی خوں ریزیوں نے جو قیامت ڈھائی اس کی وجہ سے میرؔ کو دہلی میں وہ فراغت نصیب نہ ہو سکی جس کی حسرت میں وہ دردر کی ٹھوکریں کھاتے رہے

"تین سال سے فقیر کا یہ حال ہے کہ کوئی قدرداں درمیان میں تو ہے نہیں اور زمانہ سخت تنگ ہو چکا ہے۔ خدائے کریم پر توکل کر کے جو رزق دینے والا اور قوت و اقتدار والا ہے گھر میں پڑا ہوں۔ ظاہری اسباب یہ ہیں کہ چند عزیزوں سے مثلاً ابوالقاسم خاں برادر خورد عبدالاحد خاں مجدالدولہ نیز وجیہہ الدین خاں برادر حسام الدین خاں اور بہرام خاں کلاں کے بیٹے بیرم خاں، جو آدمیت میں یکتائے روزگار ہیں اور قطب الدین خاں پسر سعد الدین خاں خانساماں اگرچہ عمر ان کی کم ہے مگر ذہین ہیں اور سعادت مندی سے خالی نہیں نیز قاضی لطف علی خاں جو بڑے سلیقے سے زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان سب سے کبھی کبھی ملتا رہتا ہوں خواہ ان سے کوئی فائدہ پہونچے یا نہ پہونچے بس توکل کا سرمایہ یہی لوگ ہیں کبھی ایسا بھی اتفاق ہو جاتا ہے کہ کوئی مجھے فقیر یا شاعر یا متوکل جان کر کچھ بطریق نظر بھیج دیتا ہے مقام شکر ہے اکثر قرضدار رہتا ہوں اور نہایت عسرت میں زندگی گذار رہا ہوں۔ القصہ دنیا عجب حادثہ گاہ ہے۔"

(ذکر میرؔ: مترجم نثار احمد فاروقی ص ۱۸۳)

"فقیر (میرؔ) ان دنوں خانہ نشین تھا۔ بادشاہ نے اکثر طلب کیا۔ نہیں گیا۔ عبدالاحد خاں مختار کا چچیرا بھائی ابوالبرکات خاں صوبہ دار کشمیر کا لڑکا ابوالقاسم خاں میرے ساتھ گونہ مراعات برتتا تھا۔ کبھی کبھی اس سے ملاقات ہو جاتی تھی کبھی (کسی تقریب سے) بادشاہ بھی کچھ بھجوا دیتے تھے۔

مصرعے گاہ گاہ می گویم کار دنیائے من ہمیں قدر است

(کبھی کبھی کوئی مصرعہ کہہ لیتا ہوں، بس اب میری دنیا یہی رہ گئی ہے)

(ذکر میرؔ: مترجم نثار احمد فاروقی ص ۱۹۱)

فارسی زبان میں لکھی ہوئی اپنی اس آپ بیتی "ذکر میرؔ" کا اختتام میرؔ نے ان ایام پر کیا ہے کہ جب آصف الدولہ کے بلانے پر وہ ۱۱۹۶ھ - ۱۷۸۲ء میں لکھنؤ پہونچے۔ نواب آصف الدولہ نے دو سو روپے وظیفہ مقرر کیا مگر زندگی کے وہ پچاس سال جو دہلی میں گذرے ان کی یاد انھیں ہمیشہ آتی رہی۔ ذکر میر میں میرؔ نے ان تمام یادوں کو سمیٹ کر جو آپ بیتی لکھی ہے وہ صرف ان کی آپ بیتی نہیں بلکہ وہ ان ہزاروں لاکھوں تباہ و برباد انسانوں کی آپ بیتی ہے جو اٹھارہویں صدی میں حیرت و حسرت کا تماشہ بن چکے تھے۔ ان معنوں میں میرؔ کی یہ آپ بیتی اس لئے بھی اہم ہے کہ اس میں وہ عہد سانس لے رہا ہے جو تاریخ بن چکا ہے۔ اس تاریخ میں بادشاہ سے فقیر تک ہر وہ کردار موجود ہے جسے وقت کی سفاکیوں نے کہاں سے کہاں پہونچا دیا تھا لیکن میرؔ نے اسے ایک قطرۂ خون میں سمیٹ کر ایک ایسی آپ بیتی بنا دیا ہے جس کا مرکزی کردار وہ خود ہیں۔

"اس تھوڑی سی مدت میں اس ایک قطرۂ خون نے جسے دل کہتے ہیں انواع ستم جھیلے ہیں اور تمام خون ہو گیا ہے۔ میرا مزاج (پہلے ہی) ناساز تھا۔ ہر شخص سے ملنا جلنا چھوڑ دیا تھا) اب کہ بڑھاپا آ گیا ہے یعنی عمر عزیز ساٹھ سال کی ہو چکی ہے اکثر اوقات بیمار رہتا ہوں۔ غرض کہ ضعف قویٰ، بے دماغی، ناتوانی، دل شکستگی اور آزردہ خاطری سے اندازہ ہوتا ہے کہ بہت دن نہ جیوں گا۔ زمانہ بھی رہنے کے لائق نہیں رہا ہے۔ اس لئے دامن جھٹک دینا ہی اچھا ہے اگر خاتمہ بخیر ہو جائے تو یہی آرزو ہے۔ ورنہ اسے اختیار ہے۔ (ذکر میر مترجم۔ نثار احمد فاروقی ص ۲۱۰-۲۱۱)

ذکر میرؔ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس سے ان بہت سی غلط فہمیوں کی تردید ہو جاتی ہے جو میرؔ کو سمجھنے میں دشواریاں

پیدا کرتی تھیں اگر یہ آپ بیتی نہ ہوتی تو کون کہہ سکتا تھا کہ میر نے دلی میں کیا کھویا اور کیا پایا۔ اور دل کے مرثیے کیوں کر مرتب کئے۔

ذکر میر کے فارسی متن کی اشاعت (عبدالحق) کے بعد نثار احمد فاروقی کو اس کے اردو ترجمے کا خیال آیا۔ انھوں نے اس کا ترجمہ اس خوبی سے کیا ہے کہ اردو ادب اسے مدتوں یاد رکھے گا۔

میر کا احساس برتری (صفحہ ۸۰ کا بقیہ)

ان کے شعروں میں دریا کی سی روانی، گہر کی سی چمک، قیامت کا سا ہنگامہ، خورشید کی سی گرمی اور پھولوں کی سی خوشبو موجود ہے۔ ان کی شاعری شاعری نہیں بلکہ ساحری ہے۔ ان کے اشعار میں جادو کی اثر ہے۔ ان کے ہر شعر میں رموز و اسرار پوشیدہ ہیں۔ وہ ہر شعر ایک مقام سے کہتے ہیں۔ اشعار ملاحظہ ہوں۔

جادو کی پڑی پرچۂ ابیات تھا اس کا
منہ تکیے غزل پڑھتے عجب سحر بیان تھا

نہ رکھو کان نظم شاعران حال پر اتنے
چلو ٹک میر کو سننے کہ موتی سا پروتا ہے

دریا میں قطرہ قطرہ ہے آب گہر کہیں
ہے میر موجزن ترے ہر اک سخن میں آب

شاعر نہیں جو دیکھا تو تو ہے کوئی ساحر
دو چار شعر پڑھ کر سب کو رجھا گیا ہے

سہل ہے میر کو سمجھنا کیا
ہر سخن اس کا اک مقام سے ہے

میر کے احساس برتری کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنے آپ کو نظیری جیسا بلکہ نظیری سے بھی افضل شاعر تصور کرتے تھے۔ دو شعر پیش خدمت ہیں۔

کیا قدر ہے ریختے کی گو میں　　　اس فن میں نظیری کا بدل تھا
نہ ہوتے ہم نظیری سے یوں تو　　　شعر کے فن میں بے نظیر ہوئے

بہر کیف میر غم و یاس اور دکھ درد کی تاریک رات میں بھی صبح امید کا جلوہ دیکھ لیتے تھے۔ انھوں نے ہمیں غموں سے ڈٹ کر مقابلہ کرنے کا مزاج دیا ہے۔ ان کے مطابق صبر و شکیبائی اور بلند حوصلگی کے ذریعہ ہی مصائب زندگی میں کامیابی حاصل کی جا سکتی ہے۔ ٥

میر کی منقبتی شاعری ... (صفحہ ۱۲۹ کا بقیہ)

میر کی منقبتی شاعری کا یہ ایک تھوڑا سا حصہ ہے اس مخمس اور دوسری منقبتوں سے ان کے عقائد بالکل واضح ہیں۔ وہ رسولؐ اور آل رسولؐ کو سب پر مقدم سمجھتے ہیں وہ عین الیقین کی اس منزل پر جہاں پوری کائنات محمدؐ اور آل محمدؐ کے صدقے میں خلق ہوئی وہی پوری کائنات کے مالک اور شفیع روز محشر ہیں۔ رہے ان کی منقبتوں کے شعری محاسن تو ان میں بھی میر پوری توانائی کے ساتھ ایک جہان معنی سمیٹے نظر آتے ہیں۔ میری نظر میں میر کی مکمل بازیافت جب ہی ممکن ہے کہ جب ان کی غزلوں کے ساتھ ساتھ وہ دیگر اصناف سخن بھی نظر میں ہوں۔ جنھیں میر نے برتا ہو ان میں یہ منقبتیں بھی ہیں جن کا تذکرہ وہ نقاد بھی نہیں کرتے جنھیں میر شناسی کا دعویٰ ہے۔ ٥٥

میر کی عشقیہ مثنویاں ... (صفحہ ۱۱۸ کا بقیہ)

اور مسلمانوں کے درمیان جنسی تعلقات اور معاشقے کسی سے چھپے نہیں ہیں۔ میر جب ایسی باتیں لکھ رہے تھے تو گویا وہ مستقبل کے لئے پیشینگوئی کر رہے تھے کہ کل ایسا بھی ہوگا جسے آج مافوق الفطری سمجھا جا رہا ہے۔

(۱۰) انسان اور حیوان کے عشق کی کہانی بھی وہ بخوبی نظم کرنا جانتے ہیں لیکن اگر مور کی جگہ میر کو اور اس رانی کی جگہ میر کی اس محبوبہ کو جو انھیں کبھی نہیں مل سکی اور دوسرے کے ساتھ رہنے پر مجبور ہوئی، تصور کیا جائے اگر وہ محبوبہ کبھی پھر کسی طرح میر کے نزدیک آ سکتی تو کیا کیفیت ہوتی اسے محسوس کر کے دیکھیں تو اندازہ ہوگا کہ "مورنامہ" میں میر نے کیا کیا لکھا ہو جب کوئی اپنی محبوبہ سے بچھڑ جاتا ہے تو کیا دل یہ نہیں چاہتا کہ کاش اس کے پر ہوں اور وہ اڑ کر اپنی محبوبہ تک پہونچ جائے۔ میر آج اس اور اس جیسی دوسری مثنویوں کی تشریح کرنے کے لئے موجود نہیں ہیں اس لئے وثوق کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن اس سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا ہے کہ شاید یہ مثنویاں ان کے اپنے تخیلات کا نتیجہ ہیں اور یقیناً یہ خود ان سے متعلق اور ان کی آپ بیتی ہیں۔

غزل

"نذرِ میر"

میر کے اشعار پڑھے، جی بہت گھبرائے ہے
ایک منظر جائے ہے تو ایک منظر آئے ہے

ہم بھی تو سوز و گداز دل کے مارے ہیں مگر
وہ بہتّر نشتروں والا قیامت ڈھائے ہے

میں فن بخیہ گری میں طاق ہوں وہ اس لئے
وحشتِ جاں عشق میں خود کو بہت دہرائے ہے

داخلیت، سادگی، برجستگی، عصری شعور
جس میں یہ اوصاف روشن ہوں غزل کہلائے ہے

خونِ دل چھلکا تو آنکھیں بھی گلابی ہو گئیں
کون یہ احساس میں رنگِ شفق برسائے ہے

بوئے پیراہن نے سرشاری بڑھا دی اور بھی
شام آتے آتے اسکی یاد کھلتی جائے ہے

آہٹیں کیسی ہیں آخر اب رگِ جاں کے قریب
کس لئے سلجھا ہوا مفہوم وہ الجھائے ہے

عشق کے پیچوں کو یہ ناداں سمجھتے ہی نہیں
گرنے والا کس لئے ٹھوکر پہ ٹھوکر کھائے ہے

انتظاروں کی بہاریں آپ نے دیکھی نہیں
ایک تتلی شاخِ گل پر کیوں تھرکتی جائے ہے

اب چراغوں کی لوؤں کا رنگ پھیکا ہو چلا
صبح آتی جائے ہے اور رات ڈھلتی جائے ہے

زخم بھی لگتے رہے، رقصِ ہنر ہوتا رہا
پہلا پہلا یہ بھی تیرا تجربا کہلائے ہے

پھر کوئی زخمی رتوں کی داستاں کہنے لگا
ایک بنتی بات اب پھر سے بگڑتی جائے ہے

جو دکھاتا ہے مجھے خوابوں کے عالم نو بہ نو
مسکرا کر پھر وہی تعبیر بھی سمجھائے ہے

ہم شکستہ دل لئے پلٹے ہیں بزمِ شوق سے
سرخ روئی ہے یہ ایسی کوئی کوئی پائے ہے

کشتِ گل میں اب کہاں یہ خوشبوئیں یہ رنگ روپ
فصل کٹتی جائے ہے اور شہر بڑھتا جائے ہے

ذوق و غالب، مومن و ناسخ ہیں قائل میر کے
میر کے بارے میں سب کی ایک جیسی رائے ہے

آگے آگے رہنا ہے کیفِ بے پایاں رباب
تازہ دم ہونے کو میری فکر پر پھیلائے ہے

رباب رشیدی
۱۲۶ تازی خانہ لکھنؤ ۱۸

نظم

میؔر کے دین و مذہب کو تم کیا پوچھے ہو اُن نے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

ہر ذرّے میں چھب خالق کی
ہر دھڑکن میں اس کا روپ
سانس اسی کی آون جاون
پھر کیسی تفریقِ رذیل
ہر جاں دار پہ اس کی رحمت
آدم زاد پہ اس کی الفت
پھر کاہے کو
اہلِ دول اشرافو گروہِ شعبدہ بازاں باہم مل کر
سادہ لوح غریبوں کے ہر استحصال پہ رہتے نازاں
قادر مطلق کے لفظوں کی حرمت سے ہر لمحہ نالاں
تینوں کے خود ساز عقیدوں سے کیوں قلب نہ ہوئے بریاں
مکر و ریا کے ایوانوں میں ان کے روز و شب ہیں خنداں
زنّار و تسبیح کی حاجت
روشن باطن کو ہوگی کیوں
وحدت کی گل بار تجلّی نے آخر یہ کام کیا
میؔر کے دین و مذہب کو تم کیا پوچھے ہو ان نے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

عنبرؔ بہرائچی
غزل آشرم ۵۹۰ نزد ایس جی پی جی آئی پوسٹ آفس ایس جی پی جی آئی
رائے بریلی روڈ لکھنؤ ۲۲۶۰۱۴

شاعرِ نازک طبع

رنگِ آہنگ میر صاحب کا   اب بھی ہے ان کی ذات سے منسوب
یعنی ہمسر نہ ہو سکا کوئی   کی تو فکرِ سخن کئی نے خوب

مصحفی ہوں کہ ناسخ و غالب   سب ہی اس فن میں بے نظیر ہوئے
پر خدائے سخن نہ کہلائے   اس کے حامل تو صرف میر ہوئے

ایسی باریک بیں نظر پائی   دیکھ لیتے تھے تہہ نشیں لہریں
میر کے تازگی لیے اشعار   جیسے آندھی میں جلتی ہوں شمعیں

نشتریت ہے ایسی شعروں میں   رگِ احساس پھڑپھڑاتی ہے
استعاروں میں جھانک کر دیکھو   سوچ کا ڈھنگ کا ئناتی ہے

گرمیِ علم تھی کہ رنگِ انا   کھردرا کھردرا رہا لہجہ
دورِ عشرت کہ عہدِ عسرت ہو   طبع نازک پہ بار ہی گزرا

اہلِ فکر و نظر پریشاں ہیں   کون سے غم ملے وراثت میں
ان کا ماضی بھی دور تک دیکھا   عکس ابھرے نہ چشمِ حیرت میں

سارے عالم پہ اب بھی چھائے ہیں   کس قدر معتبر ہے ذات ان کی
جلنے لگتے ہیں آگہی کے چراغ   کوئی کرتا ہے جب بھی بات ان کی

ساغر وارثی
ایمن زئی جلال نگر، شاہجہانپور

قطعات

اے شہنشاہِ غزل میر تقی میر تجھے
ہم قلمکارِ غمِ دل کا بصد شوق سلام
"آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں"
تیرے بارے میں ہے یہ غالبؔ ناسخ کا پیام

تیری غزلوں میں تڑپ اور کسک ہے لیکن
سن کے دل لفظ ترے وجد میں آجاتا ہے
تیرا لہجہ ترا انداز کسی شعر میں ہو
اپنی ندرت سے وہ پہچان لیا جاتا ہے

جو تغزل جو روانی ترے اشعار میں ہے
اپنے شعروں میں وہ اظہار کہاں سے لاؤں
میرے دل میں بھی کسک ہے دلِ حسرت کی طرح
"میر کا شیوہ گفتار کہاں سے لاؤں"

یاد آجاتے ہیں اکثر وہ کڑے دن تیرے
تیری مایوسی ترا کرب وہ تیری الجھن
غمِ روزی میں بھٹکتا رہا شہروں شہروں
پھر بھی چھوٹا نہ ترے ہاتھ سے دامانِ سخن

سرورِ ملکِ سخن اے شہِ اصنافِ سخن
یوں تو ہر صنفِ سخن میں ہے ترے دل کا لہو
ہم بھی ہیں ذوق کی مانند پرستار ترے
تیری غزلوں میں ہے تاثیر کا ایسا جادو

بشیر فاروقی

میر تھا میر رہا آج تلک میر ہے تو

اے شہنشاہِ غزل مالکِ اقلیم سخن
تیری خوشبو سے معطر ہے یہ لفظوں کا چمن

مرزا غالب نے تیرے نہج کو پہچانا ہے
اک غزل گو نے شہنشاہِ غزل مانا ہے

وہ جو سرگرداں سدا اپنے تعارف میں رہے
سرخرو لفظ ہیں جو تیرے تصرف میں رہے

رگِ افکار میں تیرا ہی لہو ملتا ہے
ہر نئی فکر کے آئینے میں تو ملتا ہے

باادب سامنے تیرے رہی لفظوں کی قطار
منتخب جس کو کئے تو نے برائے اشعار

ایک اک شعر ترا لگتا ہے الفت کی کتاب
تیری غزلوں میں جھلکتا ہے محبت کا شباب

ذہن اور دل میں اتر جاتا ہے یوں تیرا کلام
کہتا ہے سارا جہاں تجھ کو تغزل کا امام

اردو گر اب بھی ترے صنف غزل گھوتی ہے
منزلِ فتح و ظفر تیرے قدم چومتی ہے

آئینہ جس پہ کرے فخر وہ تصویر ہے تو
میر تھا میر رہا آج تلک میر ہے تو

○

خورشید ظفر

نذرِ میر

اپنی مثال آپ ہے دیکھو کلامِ میر
دو سو برس کے بعد بھی زندہ ہے نامِ میر

تعریف کی ہے ذوق نے اندازِ میر کی
ان کو بہت پسند رہا ہے کلامِ میر

ناسخ رہے ہیں میر کی عظمت کے معترف
غالب نے بھی کیا ہے بہت احترامِ میر

حسرت نے بھی اٹھایا بہت فیض میر سے
خود کو سدا سمجھتے رہے وہ غلامِ میر

شعر و سخن میں کس کو ملا ایسا مرتبہ
کیوں وجہ رشک ہو نہ بقائے دوامِ میر

قطعہ ہو، مثنوی ہو، غزل ہو، رباعی ہو
کس درجہ پُر وقار ہے شعری نظامِ میر

شعرا نے لاکھ پیرویٔ طرزِ میر کی
حاصل کسی کو ہو نہ سکا پر مقامِ میر

آگے کسی کے مت کرو دستِ طلب دراز
مانگو فقط خدا سے، یہی ہے پیامِ میر

اے خاکِ لکھنؤ تری آغوش میں کہیں
گم ہو گیا مزار، پہ باقی ہے نامِ میر

اس شاعرِ عظیم کو یوں یاد کیجئے
ہر صبح صبحِ میر ہو، ہر شام شامِ میر

مخمورؔ داد اس کو بہر حال دیجئے
شائع کیا ہے جس نے شمارہ بنامِ میر

○

ڈاکٹر مخمور کاکوروی
اقصیٰ پبلک لائبریری کاکوری لکھنؤ

نذرِ میر

شاعرِ بے بدل
آبروئے غزل
ناخدائے سخن
یا خدائے سخن
آپ کچھ بھی کہیں
حضرتِ میرؔ کو
اس کی عظمت کا گن گان کرتے ہیں سب
عشق اس کا تھا مذہب، وہی ذات تھی
ایک انسان تھا وہ عجب ڈھنگ کا
پیش کرتے ہیں اس کو ہم اپنا خراج
دیر و کعبہ کی تعظیم کرتا تھا وہ
اس کو ہندو کہو
اس کو مسلم کہو
اس کو کچھ بھی کہو
ایک ہندی تھا وہ
یہ بڑی بات ہے
جب تلک وہ جیا
وہ جیا شان سے
مر گیا تو نشاں اس کا باقی نہیں
لکھنؤ تیری عظمت کو کیا ہو گیا؟

رافعت عزمی
محلہ تھنیانہ، ردولی ضلع فیض آباد

ناخدائے سخن

فضائے لکھنؤ کہئے جسے فضائے سخن
ہوئے تھے میرؔ یہیں آ کے ناخدائے سخن

ہر اک پہ کرتا ہے واضح یہ ماورائے سخن
ہے سر پہ تاج مرے جسم پر قبائے سخن

نظامِ فکر درست اک خوراک میں ہو جائے
پلا دے پیارے استاد گر دوائے سخن

نظر میں رہتے ہیں ہر وقت حادثاتِ زیست
یہی بنائے تلفظ یہی بنائے سخن

کیا تھا لکھنؤ دلی کے بیچ عطف کا کام
میں ذاتِ میرؔ کو کہتا ہوں آبلائے سخن

جمیلؔ دوش پہ لہریں ہیں اور بھی کچھ بوجھ
نہ ڈالئے مرے کاندھوں پہ یہ ردائے سخن

جمیل احمد جمیل
۲۹۵/۱۳۹ دین دیال روڈ اشرف آباد
لکھنؤ ۔ ۲۲۶۰۰۳

علی احمد دانش
۲۲۷/۱۲۴ انیس ہاؤس چوک لکھنؤ

قبر میر پر پرنس ہادی حسین ہادی

۱۸۵۷ء کے اندوہناک ایام میں جو دلسوز واقعات پے در پے واقع ہوئے اس سے باشندگانِ اودھ کا سکون درہم برہم ہو گیا، خوشحالی پریشاں حالی سے بدل گئی لکھنؤ بیت السلطنت تھا اس لئے اس کا دیگر دیار و امصار کی بہ نسبت زیادہ متاثر ہونا فطری تھا۔

اقتدار شاہی کے ختم ہونے اور انگریزی حکومت کے جبری تسلط سے عوام برہم بھی تھے اور خوفزدہ بھی۔ لکھنؤ میں جگہ جگہ جنگ آزادی کے مجاہدوں کی تلاش میں چھاپے مارے جا رہے تھے پاداش عمل میں مکانات کھُد رہے تھے، محل ڈھائے جا رہے تھے، محلّے اجاڑے جا رہے تھے۔ مولانا عبدالحلیم شرر نے اپنی کتاب "گذشتہ لکھنؤ" میں اس زمانے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"اودھ جو سمرقند و بخارا جیسا تھا اس کے مرکزی علاقہ کو تاراج کر دیا گیا:

مرقع خسروی جس کا اصل قلمی نسخہ آج بھی لکھنؤ یونیورسٹی کی لائبریری میں محفوظ ہے اس کے فاضل مصنف عظمت علی کاکوروی نے لکھنؤ کے ماضی کا ذکر بڑی خوبی سے کیا ہے۔

"لکھنؤ جو باغوں کا شہر تھا... جب صبح کا سورج نمودار ہوتا تو یہاں کے مندروں، مسجدوں اور امام باڑوں کے گنبدوں کے کلسوں پر جب سورج کی شعاعیں پڑتیں تو ایک عجب سماں بندھ جاتا تھا۔ پپیہوں، طاؤسوں، قمریوں اور کوئلوں کی دلنشین آوازوں سے یہاں کے لوگوں کے دل باغ باغ ہو جاتے تھے۔"

لکھنؤ کے چمن کی ان بہاروں کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے اہل کاروں نے خزاں میں تبدیل کر دیا۔ وہ روشیں جن پر قدرت کی صناعیوں کے ساتھ ساتھ لکھنؤ کے خوش فکر اور با مذاق فنکاروں نے بیل بوٹے اور گلدستے سجائے تھے، ویران ہو گئیں یہ صحیح ہے کہ زمانہ تغیر پسند ہے کسی کو ایک حال میں رہنے نہیں دیتا۔ اس تبدیلی و انقلاب کے نتیجہ میں جو تباہیاں اور بربادیاں رونما ہوئیں اس کا مرثیہ پڑھنے والوں میں میر انیس بھی شامل تھے وہ فرماتے ہیں۔

کیونکر دل غمزدہ نہ فریاد کرے	جب ملک کو یوں غنیم برباد کرے
مانگو یہ دعا کہ پھر خداوند کریم	اجڑی ہوئی مملکت کو آباد کرے

انگریزوں کے اس دور حکومت میں لکھنؤ میں بڑی تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ لکھنؤ میں ریلوے کا نظام جاری کیا گیا۔ چار باغ اسٹیشن کی تعمیر میں نہ جانے کتنے محلات تہس نہس کر دئے گئے۔ چار باغ اور ڈالی گنج کے درمیان واقع سبھی محلے اور آبادیاں یہاں تک کہ قبرستان بھی مسمار کر کے ریل کے لئے پشتے اور پل تعمیر کر کے ان پر آہنی پٹریاں بچھا دی گئیں۔ ان قبرستانوں میں خلاق باغ بھی تھا جسکی قبروں کو برابر کر دیا گیا اور اس کے ایک حصے پر سٹی اسٹیشن کی عمارت تعمیر کر دی گئی جو زمین بچ رہی تھی اس پر کچھ لوگوں نے ناجائز قبضے کر لئے۔ بقول میر ہادی وحید مرحوم۔

مکیں رہ گئے نہ مکاں رہ گئے
لٹی بستیوں کے نشاں رہ گئے

میں نے والد مرحوم میر محمد ہادی لائق کے ہمراہ جا کر اس حصّے کا بچشم خود مشاہدہ کیا ہے۔ موجودہ ہاتھی پارک کے سامنے والے حصّہ میں میر خلیق کی قبر تھی اور خلاق باغ کی مسجد کے قریب میر تقی میر کی قبر تھی۔ میرے والد بزرگوں کے حوالے سے اس کی سمت نشاندہی کر دیا کرتے تھے جدھر ان کی قبریں واقع تھیں۔

لکھنؤ میں نامور شعرا کی قبروں کی تلاش اور فاتحہ خوانی کا شوق بعض بزرگوں میں موجود تھا جن کے بیانات کی روشنی میں ان شعرا کی قبروں کا پتہ نشان بھی محفوظ ہے۔

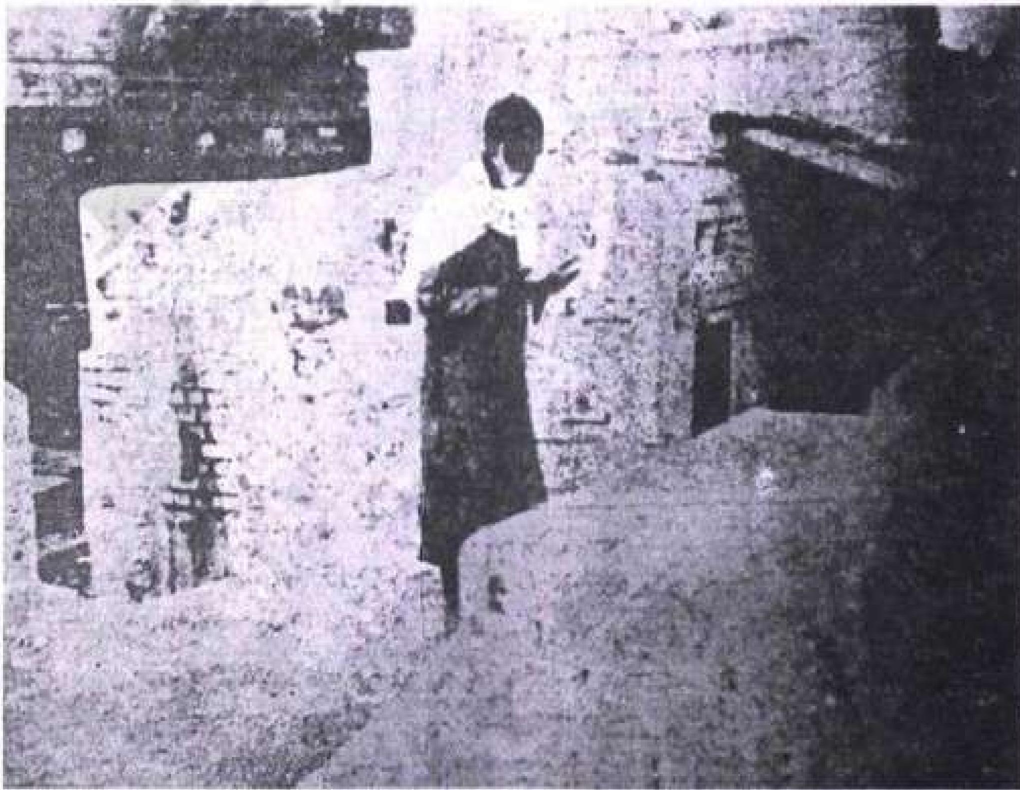
پرنس ہادی حسین ہادی اپنے خاندانی ذوق شعری اور علمی وجاہت کی بنا پر لکھنؤ کے ادبی حلقوں میں معروف و محبوب تھے اور ابھی ان کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے والے بزرگ زندہ ہیں۔ آپ امجد علی خاں کے بزرگوں میں تھے اور امجد علی خاں نواب محمد علی خاں (رسالدار جنگ اودھ) کے خاندان کے ایک فرد تھے۔

پرنس ہادی کے بارے میں صرف اتنا ہی تعارف اس امر کے لئے کافی ہے کہ ان کی معلومات کا ذریعہ ثقات لکھنؤ تھے۔ وہ جن مرحوم شعرا کی قبروں پر فاتحہ خوانی کے لئے جاتے تھے ان میں خدائے سخن میر تقی میر کی قبر بھی تھی۔ مضمون کے ہمراہ شامل مطبوعہ تصویر مجھے مرحوم امجد علی خاں کے ذریعہ دستیاب ہوئی تھی (اس تصویر میں پرنس ہادی میر تقی میر کی قبر پر فاتحہ خوانی کر رہے ہیں۔ یہ تصویر تقریباً ۴۰ سال قبل روزنامہ قومی آواز لکھنؤ میں شائع ہوئی تھی) جن سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ ریلوے اسٹیشن کے قیام کے کافی زمانے بعد تک میر تقی میر کی قبر موجود رہی اور بعد میں قبرستان کی زمین کو ہموار کر کے مکان تعمیر کرنے والوں نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ان کی قبر کو نگاہوں سے پوشیدہ کر دیا۔ میر نے جس سرزمین کے لئے کہا تھا۔ ؎

چپّہ چپّہ پہ ہیں یاں گوہر یکتا تہہ خاک
دفن ہوگا نہ کہیں اتنا خزانہ ہرگز

آج اردو ادب کے خزانے کے اس گوہر یکتا کے مدفن کا پتہ بتانے والا بھی کوئی نہیں ہے۔

OO



شاہی خاندان کے ایک بزرگ شاعر پرنس ہادی حسین ہادی مرحوم میر تقی میر کی قبر پر فاتحہ پڑھ رہے ہیں۔
یہ تصویر نصف صدی قبل کھینچی گئی تھی، اس وقت تک قبر کے آثار موجود تھے۔ افسوس صد افسوس کہ
اس شاعر اعظم کی قبر کا اب نشان بھی باقی نہ رہا ——— علی احمد دانش (آلِ انیس)

یاسر رئیس
تصنیانہ، ردولی، فیض آباد

متن کے حوالے سے
”میر کے کچھ شعر“

کسی بھی قلم کار کے مقصود قلم تک رسائی ”متن“ کی شفافیت کے بغیر تقریباً ناممکن ہے اور سچ تو یہ ہے کہ جب تک قلم کاریاں بن و عن قاری سے روشناس نہ ہوں کسی بھی مفہوم کی تعیین ہو ہی نہیں سکتی یہاں تک کہ ”املا“ بھی کسی تحریف کے ہاتھوں نفس مضمون تک رسائی میں دشواریاں پیدا کر دیتا ہے اور قاری ہی نہیں بلکہ آئندہ نسل کے لئے بھی تفہیم کی راہ کھوٹی ہو جاتی ہے۔

سب سے پہلا میر کا کلیات ۱۸۱۱ء میں کلکتہ فورٹ ولیم سے مرزا کاظم علی جوان، مرزا جان تپش اور مولوی محمد اسلم کی نگرانی میں ہندوستانی چھاپا خانہ سے طبع ہوا۔ ۱۸۶۷ء میں نول کشور پریس میں ایک ایڈیشن بغیر کسی حاشیہ کے چھپا ہے ۱۹۱۶ء میں مطبع نول کشور کا پورے پانچواں ایڈیشن اور ۱۹۴۰ء میں مطبع منشی نول کشور لکھنؤ سے مولانا عبدالباری آسی الدنی کے مقدمے کے ساتھ اور ۱۹۵۴ء میں بابائے اردو مولوی عبدالحق کا انتخاب کلام میر شائع ہوا۔

میر تقی میر کے کچھ شعر اپنے متن کے اختلاف میں اہلِ نظر کی توجہ کے حقدار ہیں۔ میر کی نہایت مشہور غزل ؎

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا

کا مقطع ؎

میر کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو ان نے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

اس مقطع کا متن مولانا عبدالباری آسی الدنی ڈاکٹر عبادت بریلوی اور ظل عباس عباسی کی مرتبہ کلیات میں ان کے مطابق مذکورہ بالا ہی شکل میں موجود ہے جبکہ کئی زبانوں پر مقطع کا پہلا مصرعہ حسب ذیل ہے۔

میر کے دین و مذہب کو تم پوچھتے کیا ہو ان نے تو

لیکن ”اب“ کی جگہ ”تم“ کسی کلیات میں نظر نہیں آیا پھر ”تم“ جگہ ”اب“ شعر کے وقار میں اضافہ کرتا ہے اور مصرعہ کا آخری حصہ ”کب کا ترک اسلام کیا“ ”اب“ کی بجائے ”تم“ کی وجہ سے بے نور ہو جاتا ہے۔

میر کا شعر ہے۔

شام سے کچھ بجھا بجھا سا رہتا ہوں
دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

اس شعر کے مصرع اول کے متن میں خاصا اختلاف پایا جاتا ہے۔ ؎

شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے
شام سے کچھ بجھا سا رہتا ہے
شام سے کچھ بجھا سا رہتا ہوں

لیکن مولانا آسی الدنی ظل عباس عباسی اور ڈاکٹر عبادت بریلوی کے کلیات میں۔

شام سے کچھ بجھا سا رہتا ہوں

ملتا ہے اور اسی متن کی روشنی میں مذکورہ شعر کا مفہوم اپنی معنویت کی تہہ داریوں کو حیات افروزیوں سے ہمکنار کرتا ہے۔

میر کا شعر ہے۔

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

مولانا آسی الدنی کے کلیات اور ظل عباس عباسی کے کلیات میں اس شعر کا متن اسی طرح موجود ہے لیکن کئی اہل قلم نے اس شعر کے مصرع اول کے متن کو یوں بھی نقل کیا ہے۔

کہا میں نے گل کا ہے کتنا ثبات

شعر شور انگیز میں شمس الرحمٰن فاروقی نے بھی

کہا میں نے گل کا ہے کتنا ثبات ... کو قبول نہیں کیا اور

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات

کو ترجیح دی ہے اور میں سمجھتا ہوں اسی متن میں زبان و بیان کا حسن ہے۔ میر کی ایک مشہور غزل کا مقطع ہے

اب تو جاتے ہیں بتکدے سے میر
پھر ملیں گے اگر خدا لایا

اس مقطع کے پہلے مصرعہ میں "بتکدے" کی جگہ قلم کاروں نے "میکدے" بھی نقل فرمایا ہے لیکن میر کے کسی بھی کلیات میں "میکدے" نہیں ہے۔ "پھر خدا لایا" کی رعایت "بتکدے" کے استعمال سے جاگ اٹھتی ہے اور یہ شعری معنویت کا بہت بڑا سرمایہ ہے جس کی حفاظت قلم کاروں کا بنیادی فریضہ ہے۔

میر کا ایک مقطع ہے۔

سرہانے میر کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

عبادت بریلوی نے اپنے مرتب کردہ کلیات میں

سرہانے میر کے کوئی نہ بولو

نقل کیا ہے جبکہ مولانا آسی الدنی نیز دوسرے کلیات میں "کوئی نہ بولو" ملتا ہے البتہ "آہستہ" سے مصرع کی معنویت اور تہہ داریاں بھی بڑھ جاتی ہیں۔

کلکتے والے نسخہ میں اور سنہ ۱۹۱۹ء نیز ۱۹۴۰ء والے نسخہ میں "کوئی نہ بولو" والا متن موجود ہے۔ بابائے اردو والے نسخے ۱۹۴۵ء کے مقدمہ میں اور انتخاب کلام میر میں "آہستہ بولو" کے متن کے ساتھ "سرہانے میر کے آہستہ بولو" ملتا ہے۔

میرے نزدیک "کوئی نہ بولو" پر "آہستہ بولو" کو ترجیح ہونی چاہئے کیونکہ "آہستہ بولو" کے متن کو وجدان بھی قبول کرتا ہے۔ مشورہ آواز کی مکمل نفی کا اور عمل کے اظہار آواز کے اثبات کا، جبکہ آہستہ بولو میں آواز پست رکھنے کی بات کس قدر برمحل ہے۔ شاید یہی سبب ہے کہ بابائے اردو نے "آہستہ بولو" کو اختیار کیا ہے، جس کی بنیاد بھی عین ممکن ہے۔

میر کی ایک غزل کا مشہور مطلع ہے

راہ دور عشق میں روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

اس مطلع کا پہلا مصرعہ

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا

بہت مشہور اور زبان زد ہے لیکن معتبر کلیات میں مذکورہ بالا ہی متن ملتا ہے۔ معروف اور مستند قلم کار شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنی مشہور تصنیف "شعر شور انگیز میں"

"راہ دور عشق میں روتا ہے کیا"

کو ہی ترجیح دی ہے۔

میر کا شعر ہے

دل ہی کے غم میں گذری اپنی تو عمر ساری
بیمار عاشقی یہ کس دن بھلا رہے گا

اس شعر کے پہلے مصرعہ کے متن کی ایک صورت اس طرح بھی ہے

عمر عزیز ساری دل ہی کے غم میں گذری

مولانا آسی الدنی نے اپنے کلیات میں

دل ہی کے غم میں گذری اپنی تو عمر ساری

کو ترجیح دی ہے جبکہ ظل عباس عباسی نے

"عمر عزیز ساری دل ہی کے غم میں گذری"

کو اپنایا ہے۔

میر کا یہ شعر بھی متن کے اختلاف کا شکار ہے

کہاں آتے میسر تجھ سے مجھ کو خود نما اتنے
ہوا یوں اتفاق آئینہ میرے روبرو ٹوٹا

اس شعر کا مصرع ثانی تذکرۂ میر میں اس طرح ہے

بحسن اتفاق آئینہ تیرے روبرو ٹوٹا

کلکتہ والے نسخہ میں بھی مصرع ثانی اسی طرح ہے لیکن نسخہ کشوری طبع اول میں بجائے "میرے"، "تیرے" مرقوم ہے۔



میر اور لکھنؤ

کاظم علی خاں کے مضمون میر اور لکھنؤ سے ماخوذ

- میر کے آخری مسکن و مدفن ہونے کا فخر دنیا میں جس شہر کو حاصل ہے وہ لکھنؤ ہے۔
- لکھنؤ میر کی اولادوں کے مسکن، وطن یا مدفن کی حیثیت سے بھی اہمیت رکھتا ہے لکھنؤ میر کی بیٹی، بیگم اور بیٹے فیض علی کا مسکن و مدفن نیز چھوٹے بیٹے میر کلو عرش کا وطن و مدفن ہونے کا شرف رکھتا ہے۔
- لکھنؤ نے میر کے سن ولادت، تاریخ وفات اور آخری بیماری کے متعلق اردو تحقیق کے لئے جو یادگار و مفید مواد فراہم کیا ہے وہ میریات کا ایک اہم باب ہے۔
- کتب خانہ ندوہ لکھنؤ میں کلیات میر کا وہ پہلا نادر اڈیشن موجود ہے جو ۱۸۱۱ء میں کلکتہ سے چھپا تھا اور جس سے دنیا کے بہت کتب خانے خالی ہیں۔
- نول کشور پریس لکھنؤ سے ۱۸۶۸ء میں کلیات میر کا دوسرا اڈیشن چھپا اور اسی پریس سے مولانا عبدالباری آسی نے ۱۹۴۱ء میں کلیات کا ایک بے حد اہم اڈیشن شائع کرایا۔ جو میر کے احوال و کلام کے سلسلہ میں یادگار رہتے ہے نول کشور پریس نے کلیات میر کے متعدد اڈیشن شائع کر کے میر کے کلام کو ادبی حلقوں تک پہنچانے میں قابل قدر خدمات سر انجام دی ہیں۔
- لکھنؤ کو کلام میر کے متعدد ایسے نادر قلمی نسخے رکھنے کا شرف حاصل ہے جن کی مدد سے میر کے سیکڑوں اشعار پہلی بار شائع ہوئے ہیں۔
- میر کا غیر مطبوعہ رسالہ فیض میر پہلی بار لکھنؤ کے پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب نے شائع کرایا تھا۔ مسعود صاحب نے نکات الشعراء پر بھی قابل قدر تحقیق کی ہے۔
- لکھنؤ کے ڈاکٹر نیر مسعود رضوی نے میر کا مکمل فارسی دیوان پہلی بار اشاعت کے لئے پیش کیا ہے جو نقوش لاہور میں شائع ہو رہا ہے۔
- کلیات میر کا جو اڈیشن ڈاکٹر عبادت بریلوی نے پاکستان سے شائع کرایا ہے وہ دراصل ڈاکٹر صاحب کی ڈی لٹ کی وہ تھیسس ہے جو موصوف نے تیار تو لکھنؤ یونیورسٹی کے لئے کی تھی مگر پیش نہ ہو سکی۔
- میریات کے سلسلہ میں اتر لکھنوی کی خدمات بھی قابل ذکر ہیں۔
- آل انڈیا میر اکادمی لکھنؤ میر کے لئے کام اور میر کے نام پر انعام دے رہی ہے (میر پر مقبول احمد لاری نے ایک ضخیم کتاب حدیث میر مرتب کی جو کافی مقبول ہوئی)
- پروفیسر مسیح الزماں کی کتاب "مراثی میر" لکھنؤ سے ہی شائع ہوئی۔
- خود میری بھی ایک کتاب "غزلیات میر کا تنقیدی جائزہ" ۱۹۷۲ء میں لکھنؤ سے چھپی۔

۵۵

پیش کش:۔ انجم اصغر

آبِ حیات سے

مولانا محمد حسین آزاد

میر کی وضع ان کی وضع قدیمانہ، کھڑکی دار پگڑی، پچاس گز کے گھیر کے جامہ، ایک پورا تھان پستولئے کا کمر سے بندھا، ایک رومال پٹری دار تہہ کیا ہوا اس میں آویزاں، مشروع کا پاجامہ جس کے عرض کے پائینچے، ناگ پھنی کی انی دار جوتی جس کی ڈیڑھ بالشت اونچی نوک، کمر میں ایک طرف سیف یعنی سیدھی تلوار دوسری طرف کٹار ہاتھ میں جریب۔

بہتر نشتر: اردو زبان کے جوہری قدیم سے کہتے آئے ہیں ستر اور دو بہتر نشتر ہیں باقی میر صاحب کا تبرک ہے لیکن یہ بہتر کی رقم فرضی ہے کیونکہ جب کوئی تڑپتا ہوا شعر پڑھا جاتا ہے تو ہر سخن شناس سے مبالغہ تعریف میں یہی سنا جاتا ہے کہ دیکھئے یہ انھیں بہتر نشتروں میں سے ہے۔

واسوخت: دو میں اور کچھ شک نہیں کہ لاجواب ہیں اہلِ تحقیق نے فغانی یا وحشی کو فارسی میں اور اردو میں انھیں واسوخت کا موجد تسلیم کیا ہے سیکڑوں شاعروں نے واسوخت کہے لیکن خاص خاص محاوروں سے قطع نظر کریں تو آج تک اس کوچے میں میر صاحب کے خیالات و انداز بیان کا جواب نہیں۔

موہنی: ایک مثنوی میں کہتے ہیں کہ میری ایک بلی تھی۔ بڑی وفادار تھی بڑی قانع تھی اس کے بچے نہ جیتے تھے۔ ایک دفعہ ۵ بچے ہوئے پانچوں میں سے ۳ بچے لوگ لے گئے دو رہے دونوں مادہ تھے۔ ایک کا نام موہنی رکھا۔ ایک کا نام مانی۔ موہنی میرے ایک دوست کو پسند آگئی دو دے گئے۔ مانی کے مزاج میں مسکینی اور غربت تھی اس لئے فقر کی رفاقت نہ چھوڑی۔

چھوٹی بحر کی غزلیں: ان کی غزلیں ہر بحر میں کہیں شربت اور کہیں شیر و شکر ہیں مگر چھوٹی چھوٹی بحروں میں فقط آبِ حیات بہاتے ہیں۔ جو لفظ منہ سے نکلا ہے تاثیر میں ڈوبا ہوا نکلا ہے مگر یہ بھی بزرگوں سے معلوم ہوا کہ مشاعرہ یا فرمائش کی غزلیں ایسی نہ ہوتی تھیں جیسی کہ اپنی طبع زاد طرح میں ہوتی تھیں۔

وضع سے قبل حلیہ: میر صاحب میانہ قد، لاغر اندام گندمی رنگ تھے ہر کام متانت اور آہستگی کے ساتھ، بات بہت ہی کم وہ بھی آہستہ، آواز میں نرمی و ملائمت، ضعیفی نے ان سب صفتوں کو اور بھی قوی کیا تھا۔ عادت و اطوار نہایت سنجیدہ اور متین اور صلاحیت اور پرہیز گاری نے اسے عظمت دی تھی۔ ساتھ اس کے قناعت اور غیرت حد سے بڑھی ہوئی تھی اسی کا نتیجہ ہے کہ اطاعت تو درکنار نوکری کے نام کی بھی برداشت نہ رکھتے تھے۔

مزاج: اپنی بے نیازی اور بے پروائی کے ساتھ دنیائے فانی کی مصیبتیں جھیلیں اور جو اپنی آن تان تھی اسے لئے دنیا سے چلے گئے اور جس گردن کو خدا نے بلند پیدا کیا تھا سیدھا خدا کے ہاں لے گئے۔ چند روزہ عیش کے لالچ سے یا مفلسی کے دکھ سے اسے دنیا کے نااہلوں کے سامنے ہرگز نہ جھکایا۔ ان کا کلام کہے دیتا ہے کہ دل کی کلی اور تیوری کی گرہ کبھی کھلی نہیں۔ باوجود اس کے اپنے ملکِ خیال کے ایک بلند نظر بادشاہ تھے۔

پونے تین شاعر: لکھنؤ میں کسی نے پوچھا کہ کیوں حضرت آج کل شاعر کون کون ہے؟ کہا ایک تو سودا، دوسرا یہ خاکسار اور کچھ تامل کر کے کہا آدھے خواجہ میر دردؔ۔ کوئی شخص بولا کہ حضرت اور میر سوز صاحب؟ چیں بجبیں ہو کر کہا کہ میر سوزؔ صاحب بھی شاعر ہیں؟ انھوں نے کہا آخر استاد نواب آصف الدولہ کے ہیں کہا خیر یہ ہے تو پونے تین سہی مگر شرفا میں ایسے تخلص ہم نے کہیں نہیں سنے۔

خود داری: سعادت علی خاں کا دور ہوا تو یہ دربار جاناں چھوڑ چکے تھے۔ وہاں کسی نے طلب نہ کیا۔ ایک دن نواب کی سواری جاتی تھی یہ تحسین کی مسجد پر سرِ راہ بیٹھے تھے۔ سواری سامنے آئی سب اٹھ کھڑے ہوئے میر صاحب اسی طرح بیٹھے رہے۔ سید انشا خواصی میں تھے۔ نواب نے پوچھا کہ انشا یہ کون شخص ہے؟ جس کی تمکنت نے اسے اٹھنے بھی

نہ دیا عرض کی جناب عالی یہ وہی گدائے متکبر جس کا ذکر حضور میں اکثر آیا ہے۔ گزارے کا وہ حال اور مزاج کا یہ عالم۔ آج بھی فاقہ ہی سے ہوگا۔ سعادت علی خاں نے آکر خلعت بحالی اور ایک ہزار روپیہ دعوت کا بھجوایا جب چوبدار لے کر گیا میر صاحب نے واپس کر دیا اور کہا کہ مسجد میں بھجوایئے۔ یہ گنہ گار اتنا محتاج نہیں۔ سعادت علی خاں جواب سن کر متعجب ہوئے۔ مصاحبوں نے پھر سمجھایا۔ غرض نواب کے حکم سے سید انشا خلعت لے کر گئے اور اپنی طرز پر سمجھایا کہ نہ اپنے حال پر! بلکہ عیال پر رحم کیجئے۔ اور بادشاہ وقت کا ہدیہ ہے اسے قبول فرمایئے میر صاحب نے کہا کہ صاحب! وہ اپنے ملک کے بادشاہ ہیں۔ میں اپنے ملک کا بادشاہ ہوں۔ کوئی ناواقف اس طرح پیش آتا تو مجھے شکایت نہ تھی۔ وہ مجھ سے واقف میرے حال سے واقف۔ اس پر اتنے دنوں کے بعد ایک دس روپے کے خدمت گار کے ہاتھ خلعت بھیجا مجھے اپنا فقر و فاقہ قبول ہے مگر یہ ذلت نہیں اٹھائی جاتی۔ سید انشا کی لسانی اور لفاظی کے سامنے کس کی بات پیش کی جاتی میر صاحب نے قبول فرمایا۔

قومی تفاخر و خود داری : گورنر جنرل اور اکثر صاحبان عالیشان جب لکھنؤ میں جاتے تو اپنی قدر دانی سے یا اس سبب سے کہ ان کے میر منشی اپنے علو حوصلہ سے ایک صاحب کمال کی تقریب واجب سمجھتے تھے میر صاحب کو ملاقات کے لئے بلاتے مگر یہ پہلو تہی کرتے اور کہتے کہ مجھ سے جو کوئی ملتا ہے تو یا مجھ فقیر کے خاندان کے خیال سے یا میرے کلام کے سبب سے ملتا ہے۔ صاحب کو خاندان سے غرض نہیں۔ میرا کلام سمجھتے نہیں۔ البتہ کچھ انعام دیں گے۔ ایسی ملاقات سے ذلت کے سوا کیا حاصل۔ ○○

پیش کش :-

شہلا حیدر

نیا دور کے خریدار بن کر اردو کی ترویج و اشاعت میں حصہ لیجئے ——— (ادارہ)

میر کے اسفار

ذکر میر سے میر کے متعدد اسفار کا حال معلوم ہوتا ہے جن میں سے چند یہ ہیں۔

۱. آگرے سے دہلی میں پہلی بار آمد : تقریباً ۱۱۴۷ھ/ ۱۷۳۴-۳۵ء
۲. آگرے سے دہلی میں دوسری بار آمد : حملہ نادری کے بعد تقریباً ۱۱۵۳ھ/ ۱۷۴۱ء
۳. دہلی سے سرہند کا سفر : ۱۱۶۱ھ/ ۱۷۴۸ء
۴. دہلی سے پشکر (راجستھان) کا سفر : ۱۱۶۲ھ/ ۱۷۴۹ء
۵. پشکر سے اجمیر کا سفر : ۱۱۶۲ھ/ ۱۷۴۹ء
۶. دہلی سے فرخ آباد کا سفر : ۱۱۶۳ھ/ ۱۷۵۰ء
۷. دہلی سے سکندر آباد (ضلع بلند شہر) : شعبان ۱۱۷۰ھ/ جون ۱۷۵۵ء
۸. دہلی سے برسانہ ۹. برسانہ سے کمیر (راجستھان)
۱۰. راجا ناگرمل کے ساتھ شجاع الدولہ کو سمجھانے کے لئے بھی ایک سفر کا ذکر ہے مگر اس کی منزل معلوم نہیں۔
۱۱. کمیر سے دہلی میں آمد
۱۲. دہلی سے آگرے کا سفر (۲۳ سال کے بعد) ۱۱۷۹ھ/ ۱۷۶۲ء
۱۳. دہلی سے آگرے کا دوسرا سفر : ۱۱۸۰ھ/ ۱۷۶۶-۶۷ء
۱۴. راجا ناگرمل کے ساتھ کاماں کا سفر : ۱۱۸۴ھ/ ۱۷۷۱ء
۱۵. کاماں سے فرخ آباد کا سفر : ۱۱۸۴ھ/ ۱۷۷۱ء
۱۶. فرخ آباد سے دہلی کا سفر : ۱۱۸۴ھ/ ۱۷۷۲ء
۱۷. دہلی سے سکرتال کا سفر : ۱۱۸۵ھ/ ۱۷۷۲ء
۱۸. واپسی میں نجیب آباد، نہٹور، شیرکوٹ، سیوہارہ سلیم پور، امروہہ، گڑھ مکتیشر، ہاپوڑ ہوتے ہوئے دہلی آگئے } ۱۱۸۶ھ/ ۱۷۷۲ء
۱۹. دہلی سے براہ فرخ آباد لکھنؤ کا سفر : ربیع الثانی ۱۱۹۶ھ/ ۱۷۸۲ء مارچ
۲۰. آصف الدولہ کے ساتھ بہرایچ کا سفر
۲۱. آصف الدولہ کے ساتھ پیلی بھیت اور دامن کوہ ہمالیہ کا سفر ○

(میر کی آپ بیتی :- نثار احمد فاروقی کی کتاب سے ماخوذ)

پیش کش ——— نسرین رضوی

میر تقی میرؔ ایک نظر میں

نام : محمد تقی

تخلص : میرؔ

والد : محمد علی (بقول میر، علی متقی کا خطاب ملا تھا)

پیدائش : ۱۷۲۳ء (آگرہ، جو اس سے قبل اکبر آباد کہلاتا تھا)

بھائی بہن : محمد رضی (حقیقی) حافظ محمد حسن (سوتیلے) ایک سوتیلی بہن تھی جن کی شادی محمد حسین کلیم سے ہوئی۔

اولادیں : ۲ بیٹے فیض علی، حسن عسکری میر کلو عرش، ایک بیٹی

تعلیم : میرؔ اپنے گھر کی جس فضا کا ذکر کرتے ہیں اس میں سوائے درویشی اور کشف روحانی کے اور کوئی دوسرا چرچا نہیں ہوتا روحانی تعلیم کے سلسلہ میں احسان اللہ درویش امان اللہ سے بڑی قربت رہی۔ میر جعفر سے تعلیم حاصل کی اور پھر امروہہ کے سید سعادت علی سے ریختہ موزوں کرنے لگے۔

قیام دہلی : ۱۷۳۵ تا ۱۷۸۲ء

سفر لکھنؤ : ۱۷۸۲ نصف اول کا واقعہ ہے۔

قیام لکھنؤ : ۱۷۸۲ تا ۱۸۱۰ء

ملازمت : دہلی میں نواب صمصام الدولہ کے یہاں ملازم ہوگئے۔ نواب صاحب نادر شاہ سے جنگ میں مارے گئے تو یہ واپس آگرہ آئے لیکن گذر اوقات کی صورت نہ دیکھ کر پھر دہلی پہونچے۔ پھر ایک رئیس رعایت علی خاں کی ملازمت کر لی۔ دہلی کی خانہ جنگیوں کے بعد اپنے اہل وعیال کو لے کر نکل پڑے۔ ریاست بھرت پور میں راجہ سورج مل جاٹ نے روزینہ مقرر کر دیا۔ بادشاہ عالمگیر ثانی نے کئی بار دربار میں بلایا مگر نہ گئے نواب آصف الدولہ نے لکھنؤ بلایا ۲۰۰ روپیہ ماہانہ وظیفہ مقرر کیا۔ بعد کے نواب سے نہ نبھ سکی لیکن وظیفہ آخر تک جاری رہا۔

تصانیف : تذکرہ نکات الشعراء (فارسی) ۱۷۵۲ء
ذکر میر (فارسی) فیض میرؔ (فارسی) دریائے عشق (فارسی) دیوان فارسی
چھ ضخیم دیوان (اردو) (غزلیات، مثنویات، مراثی، قصائد، رباعیات، منقبتیں، واسوخت، ترکیب بند، ترجیع بند وغیرہ شامل ہیں)

وفات : ۲۱ ستمبر ۱۸۱۰ء یوم جمعہ محلہ سٹہٹی لکھنؤ

مدفن : قبرستان بھیم کا اکھاڑا جو بھیم کا تکیہ بھی کہا جاتا تھا۔ موجودہ سٹی اسٹیشن سے شمال مشرقی ریلوے پل کے قریب جہاں اب ایک چھوٹی سی مسجد بن گئی ہے

۵۵

مہناز فاطمہ



میر کا عالم شباب (ماخوذ از ادبی جائزے، تذکرہ شعراء)
مرتبہ:۔ مولوی محمد ابراہیم ایم اے و مولوی فدا حسین خاں کامل الٰہ آباد



میر تقی میر





PDF By :

Ghulam Mustafa Daaim Awan